سخن دانِ فارس

محمد حسین آزاد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک -1، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066
به اشتراک
اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

Sukhandan-e-Faris

by

Mohammad Husain Azad

سنہ اشاعت

پہلا اتر پردیش اردو اکادمی ایڈیشن : 1986

پہلا قومی اردو کونسل ایڈیشن : 2005، تعداد 1100

قیمت : 134 روپے

شمار سلسلۂ مطبوعات : 1225

ISBN : 81-7587-096-6

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ویسٹ بلاک 1، آر۔ کے۔ پورم نئی دہلی-110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: فہمی کمپیوٹرس، جامع مسجد دہلی- 110006

پیش لفظ

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ایک قومی مقتدرہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے اس نے مختلف اقدام کیے ہیں جن میں کمپیوٹر ایپلیکیشن، ملٹی لنگول ڈی۔ٹی۔پی۔، کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن اور اردو رسم الخط میں سرٹیفکیٹ کورس شامل ہیں۔ ان اقدامات کے ذریعے اردو زبان کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرکے اردو تعلیم کے منظرنامے کو وسیع سے وسیع تر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کوشش کو بڑی حد تک کامیابی بھی ملی ہے۔

قومی اردو کونسل کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابوں کی طباعت اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اس لیے اردو زبان کا وہ کلاسیکی سرمایہ جو دھیرے دھیرے نایاب ہوتا جارہا ہے، قومی اردو کونسل نے اس کی مکرر اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔

اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کے کارہائے نمایاں میں سے ایک اہم کام ان اردو کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور ان کی اشاعت ہے جن کا شمار اردو کے کلاسیکی سرمائے میں ہوتا ہے۔ ان کتب کی اردو شائقین کے حلقوں میں جس قدر پذیرائی ہوئی ہے وہ محتاج بیاں نہیں۔ اس لیے اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ کی تمام مطبوعات کو ان کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر قومی اردو کونسل ایک مشترکہ معاہدے کے تحت ازسرنو شائع کرے گی۔ یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

حصۂ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید

سخن دانِ فارس مدّت سے پھٹے پُرانے کپڑوں میں پڑا سوتا تھا۔ کم فرصتی وقت کو ٹالتی تھی۔ یہاں تک کہ کل سے پرسوں اور مہینوں سے برسوں ہوگئے۔ جب بندۂ آزاد ایران سے آیا تو ہم زبانی کے جذبوں نے زور کیا۔ مصلحت نے کہا کہ اس وقت اُدھر کے خیالات تازے ہیں۔ سب سے پہلے اسے پورا کرنا چاہیے۔ ناچار نظر ثانی شروع کی، فرصت کم، کام بہت۔ کئی مہینے گزر گئے۔ پھر بھی جس طرح جی چاہتا ہے، سر انجام نہ کر سکا۔ جانتا ہوں کہ حالتِ موجودہ اس کی مشتہر کرنے کے قابل نہیں، مگر کیا کروں انتظارِ فرصت میں 15 برس گزر گئے۔ اب اہلِ طلب کے تقاضے غالب اور دل مغلوبِ مروّت ہے۔ خدا کے سپرد کر کے مطبع کے حوالے کرتا ہوں۔ الٰہی حُسنِ قبول روزی کر۔

دُعا کا محتاج

5 اگست 1887 — بندۂ آزاد محمد حسین عفی عنہ

سخن دانِ فارس

حصّۂ اوّل

یورپ میں علم زبان کے شوقینوں نے مُلک مُلک کی زبانیں سیکھ کر انواع و اقسام کے فائدے حاصل کیے۔ ایک اُن میں سے یہ ہے کہ مختلف زبانوں کے معائنہ اور مقابلہ سے ان کی قوموں، نسلوں اور ان کے باہمی رشتوں کے پتے نکال لیے۔ اس دریافت کا سلسلہ دیکھنے کے قابل ہے کہ کہاں سے سراغ نکلا اور کیونکر قدم بہ قدم آگے چلا۔ افسوس کہ عزیزانِ وطن کو ان باتوں کا شوق نہیں، نہ زمانہ فرصت دیتا ہے۔ جن لوگوں نے اس کام میں مہارت پیدا کی ہے، وہ لفظوں کو دیکھ کر صاف پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں زبان کا لفظ ہے۔ جس طرح کوئی سیاح مردم شناس ناواقف شخص کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ یہ فلاں ولایت کا آدمی ہے۔

خیالات کی ترقی نے قدم آگے بڑھایا تو نظر آیا کہ جن جن قوموں کے الفاظ ملتے جلتے ہیں۔ اگرچہ آج جُدا جُدا ہیں اور دور دراز ملکوں میں رہتی ہیں اور ان کی زبانیں بھی غیر زبان کہلاتی ہیں۔ مگر ایک زمانہ ضرور ہوگا کہ جس میں ان کی ایک زبان ہوگی۔ اسی کے الفاظ ایک گھرانے کے آدمی ایک گھر میں رہ سہہ کر بولتے ہوں گے اور ایک ہی الفاظ گھروں کے کاروبار میں کام دیتے ہوں گے۔ یا یہ دونوں زبانیں ایک زبان سے اس طرح نکلی ہوں گی جس طرح ایک ماں باپ کی دو بیٹیاں جدا ہو گئیں۔ قسمت کی گردش نے بھائی بندوں کو کہیں سے کہیں پھینک دیا۔ پھر جس طرح ملکوں کی آب و ہوا آدمیوں کے رنگ روپ، ڈیل ڈول، رسم و رواج بدل دیتی ہے، اسی طرح لہجوں، آوازوں اور تلفّظ کے فرق سے ان کے لفظوں کے ڈیل ڈول اور

عبارتوں کے جوڑ توڑ میں فرق آگیا۔ تم روز دیکھتے ہو کہ ایک دادا کی اولاد سے لڑکے بالے پھیل کر رنگ برنگ کے اشخاص ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سمجھ لو کہ ان کی زبان کی ایک اصل تھی جن سے لفظوں کی اولاد اور نسلیں پھیل کر نئی مخلوقات پیدا ہو گئی۔ جو ایک الگ زبان معلوم ہوتی ہے۔ (دیکھو ایرین قوم کا حال صفحہ 31 و 63 میں)۔

میری غرض یہاں اس مبارک نسل سے متعلق ہے کہ کسی زمانے میں ایک گھرانے کی ولادت، ایک گھر کے رہنے سہنے والے، ایک بولی کے بولنے والے، ایک مذہب کے ماننے والے، ایک ریت رسم کے برتنے والے، گروہ گروہ اور انبوہ انبوہ وطن چھوڑ کر روانہ ہوئے۔ ایک قطار نے ہند کا رخ کیا۔ ایک نے ایران کا۔ ان دونوں کی زبانیں گویا ایک ماں کی دو بیٹیاں۔ جو بہن ہند میں پلی ہندو ہو گئی۔ جس نے ایران میں پرورش پائی ایرانی کہلائی۔

باوجودیکہ ہزاروں برس کی جدائی اور سلطنتوں کے انقلاب نے رشتوں کو فرسودہ کر دیا۔ سب رنگ روپ خاک میں مل گئے اور فارسی قدیم کو فارسی حال سے مقابلہ کرو تو ایسی ہو گئی جیسے سنسکرت بھاشا اور اردو۔ اس پر بھی جب ژند پاژند۔ پہلوی۔ دری اور پھر سنسکرت میں آگاہی پیدا کرتے ہیں تو قیافہ شناسوں کو بہت سے لفظوں کے چہروں پر ایک نسل کے خط و خال جھلکتے معلوم ہوتے ہیں۔ اہلِ نظر جب ایک فارسی کتاب کے صفحہ پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ایک خاندان کے لوگ ہیں۔ ہاں قد و قامت اور رنگوں میں فرق آگیا ہے، اپنی اپنی وضع کے لباس پہنے سامنے پھرتے ہیں۔

ڈیڑھ سو برس ہوئے کہ ٹیک چند بہار اور خان آرزو دو فلسفی لغت فارسی کے دلّی میں پیدا ہوئے۔ یہ فارسی زبان کے ماہر تھے اور ہندی ان کے وطن کی زبان تھی۔ دونوں زبانوں کے مقابلہ کرنے کا آسان موقع تھا۔ اس لیے ہزاروں برس کا مٹا ہوا سراغ صاف نکل آیا۔

1783 میں سر ولیم جونس نے ہندوستان میں آکر سنسکرت او فارسی پڑھی۔ خدا جانے صاحب نے اپنی طبیعت کے لگاؤ سے یا ان دونوں کی تصنیفات سے یہ نکتہ پایا۔ غرض انھوں نے ولایت میں جا کر چرچا پھیلایا اور وہاں کے زباں دانوں سے نئی دریافت کا تمغہ حاصل کیا۔

مجھے اس تحقیقات کا شوق نہیں! جنون ہے۔ لڑکپن میں بھی لفظوں کے حروف کو ہیر پھیر، ادل بدل کر فارسی اور سنسکرت کے لفظوں کو ملایا کرتا تھا۔ اس زبان میں تھوڑی

تھوڑی معلومات بھی پیدا کی۔ بڑی کوشش سے ژند۔ پہلوی اور دری کی کتابیں جو مل سکیں بہم پہنچائیں۔ انہی کے لیے بمبئی گیا۔ پھر ایران تک سفر کیا۔ موبدوں اور دستوروں سے ملا۔ ایک برس وہاں رہا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ فائدہ بہت کم حاصل ہوا۔

اہلِ یورپ نے اس تحقیقات کو بہت پھیلایا ہے۔ شرم کی بات ہے کہ اتنی دور کے لوگ اتنی کوششیں کریں او ہم اپنے پیارے وطن اور عالی نژاد بزرگوں کی زبان سے ایسے بے غرض اور بے پروا رہیں۔ جو کچھ آزاد کی ناتمام تحقیق نے میدانِ تلاش میں دانہ دانہ چُن کر سرمایہ بنایا ہے قلم کی معرفت کاغذ کے حوالہ کرتا ہے۔ یہ سینہ صاف امانت دار ہے۔ دیانت سے اہلِ طلب تک پہنچادے گا اور چونکہ اس ضروری مطلب کی بنیاد فنِ فیلالوجیا (زبانوں کی فلسفی تحقیقات) پر ہے، جو ابھی اکثر عزیزانِ وطن تک نہیں پہنچا۔ اس لیے پہلے اس کے ضروری اصول لکھتا ہوں۔ اس طرح کہ بیان فضول اور خیالات کو طول نہ ہو لیکن مطلب کی بات رہ بھی نہ جائے۔

فیلالوجیا

لغات اور زبانوں کی فلسفی تحقیقات کے اصول

یہ ایک قدیمی فن فلاسفۂ یونان کا ہے۔ اُس سے مختلف زبانوں کی اصلیں اور ان کا تعلق ایک دوسرے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ عرب اور فارس جہاں سے پہلے ہمیں علوم کے ذخیرے ملے، ان میں اس کے اصول و فروع کا پھیلاؤ بہت نہیں ہوا اور جس قدر ہوا گُم ہو گیا۔ اب جو کچھ ہے انگریزی میں ہے۔ وہ اسے فیلالوجی کہتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی رسالہ اس کا ترجمہ ہو تو اُمّید نہیں کہ ہم وطن بھائیوں کا دل روشن کر سکے، کیونکہ انگریزی کے مصنف کئی کئی زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ ہر زبان کی طاقت اس میں خرچ کرتے ہیں اور انگریزی، یونانی، لاطینی، عبرانی وغیرہ پر بنیاد رکھتے ہیں۔ یہاں اُن طرفوں میں اندھیرا ہے، ہم لوگوں کو کچھ نظر نہیں آتا، اس لیے میں فارسی اور سنسکرت لفظوں کی چقماق سے آگ نکالوں گا۔ امید ہے کچھ نہ کچھ اُجالا ہو گا۔ ایشیائی زبانوں میں تحقیقات فیلالوجی کا ابھی تک رواج نہیں ہوا۔ اہلِ یورپ نے اسے یونان سے لیا تھا۔ اسی واسطے علم مذکور کا نام فیلالوجی چلا آتا ہے (فلسفۃ اللسان)۔ اب میرے دوست مجھے چند منٹ کے لیے اجازت دیں کہ اوّل چند مطالب بیان کروں جن سے معلوم ہو کہ زبان جس سے تقریر یا گویائی مراد ہے وہ کیا شے ہے؟

وہ اظہارِ خیال کا وسیلہ ہے کہ متواتر آوازوں کے سلسلہ میں ظاہر ہوتا ہے جنھیں تقریر یا سلسلۂ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں۔ اسی مضمون کو ایک شاعرانہ لطیفہ میں ادا کرتا ہوں کہ زبان (خواہ بیان) ہوائی سواریاں ہیں جن میں ہمارے خیالات سوار ہو کر دل سے نکلتے ہیں اور

کانوں کے رستے اَوروں کے دماغوں میں پہنچتے ہیں۔ اس سے رنگین تر مضمون یہ ہے کہ جس طرح تصویر اور تحریر قلم کی دستکاری ہے، جو آنکھوں سے نظر آتی۔ اسی طرح تقریر ہمارے خیالات کی زبانی تصویر ہے جو آواز کے قلم نے ہَوا پر کھینچی ہے۔ وہ صورت ماجرا، کام، مقام اور ساری حالت کانوں سے دکھاتی ہے۔

خیالات کا مرتبہ زبان سے اوّل ہے۔ لیکن جب تک وہ دل میں ہیں، ماں کے پیٹ میں ادھورے بچے ہیں، تقریر میں آکر پورے ہوتے ہیں اور تحریر کا لباس پہن کر بھرپور۔ لوگ جو خیالات سے مطلب نگاری اور نکتہ پردازی میں جان کھپاتے ہیں اس نکتہ کو انہی کا دل جانتا ہے۔

دنیا میں اظہار مراتب کی کارروائی تین طرح سے ہو سکتی ہے۔ اشارات، تقریر، تحریر۔ ان میں زبان یعنی تقریر اپنی توضیح کی زیادتی اور محنت کی کمی سے اوّل نمبر ہو گئی ہے اور حق پوچھو تو کارروائی کے لیے سب برابر ہیں۔ اب یہ کہو کہ زبان کیونکر پیدا ہوئی؟ سبحان اللہ۔ ہر مذہب کی کتاب یہی خبر دیتی ہے کہ ہماری زبان خاص خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ یہ ہمیں ساتھ لے کر بہشت میں جائے گی اور اسی کے ذریعے سے ہم اہل جنّت سے باتیں کریں گے۔[1] لیکن غور کرکے دیکھو تو صانع مطلق نے اپنی صنعت کاملہ سے انسان ایک ایسا طلسم قدرت بنایا ہے کہ وہ خود زبان پیدا کر سکتا ہے اور یہ راز خیال کو وسعت دینے سے کھلتا ہے:

ہے انساں صانع قدرت کا اک صندوق سر بستہ
ولیکن یہ نہیں کھلتا کہ اس میں بولتا کیا ہے

راہِ تہذیب کے مسافرو! ذرا ابتدائی آفرینش کی طرف مڑ کر نگاہ کرو کہ انسان پیدا ہوا ہے۔ اس میں دل ہے۔ دماغ ہے۔ خیالات ہیں اور سب طرح کی ضرورتیں بھی ہیں، مگر اظہار مطلب کا اوزار نہیں، وہ کیونکر گزارا کرتا ہوگا؟ اچھا آج جو انسان بے زبان ہیں اور پہلے سے سو درجے زیادہ ضرورتیں رکھتے ہیں۔ انھیں دیکھو کیا کرتے ہیں؟ وہ کون؟ گونگے کہ اپنے اشاروں میں دنیا کی کوئی بات نہیں چھوڑتے سب کچھ کہہ دیتے ہیں اور گونگوں پر کیا منحصر ہے۔

---

1. یہ بھی درست ہے۔ یونان کی زبان نے فلسفۂ الٰہی کو پھیلا کر خدا رست فلاسفر کو بہشت میں پہنچایا۔ سنسکرت نے ہند میں دھرم۔ گیان۔ عرب نے معرفت الٰہی سکھایا۔

تم خود اکثر نہیں بولتے۔ سر کو آگے کو ہلا کر ہاں ظاہر کر دیتے ہو۔ دونوں شانوں کی طرف ہلا کر نہیں اور غور کرو تو یہ طبعی حرکت ہے۔ گھوڑے ہاتھی وغیرہ چارپائے جب مالک کا ارادہ ماننا نہیں چاہتے تو کس طرح سر جھڑ جھڑا کر سرکشی سے انکار دکھاتے ہیں۔ شوقِ سیاحت مجھے خود کئی ملکوں میں لے گیا، جہاں میں گونگا تھا۔ کیونکہ نہ میں کسی کو سمجھتا تھا، نہ کوئی میری۔ وہاں گزارے کا وسیلہ اشارے ہی تھے۔ انسان جوش ہائے مختلف کا تھیلا ہے۔ جب کسی بات میں ناراض یا خفا ہوتا ہوگا تو اس کی طبیعت سخت آواز نکالتی ہوگی۔ نہیں غراتا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ سمجھ بھی اپنے اپنے درجہ میں ہر جاندار کو ملی ہے۔ کتے، بلی کو دیکھو۔ جب تمھیں خوش کرنا چاہتے ہیں تو کن کن حرکتوں اور جنبشوں سے لگاوٹ کرتے ہیں اور کیسی مہین مہین نرم نرم آوازیں سناتے ہیں۔ اسی طرح ابتدائی انسان بھی دوسرے کا غصہ دھیما کرنے کو عجز و نیاز کی حرکات کام میں لانے لگا ہوگا۔ گونگوں کو بھی دیکھ لو اپنے اشاروں کو رنگ برنگ کی آوازوں سے مدد پہنچاتے ہیں۔

تم اب بھی کتے، بلی، سانپ وغیرہ جانوروں کے ڈرانے یا ہٹانے کے لیے لکڑی کھٹ کھٹا کر کام لیتے ہو۔ کبھی دوسرے شخص کو ہشیار یا آگاہ یا اپنی طرف متوجہ کرنے کو تالی بجا کر چھچکار کر، کھنکھار کر آگاہ کرتے ہو۔ آواز کا سمجھ جانا جاندار مخلوق کی طبیعت میں داخل ہے۔ جو جو بولیاں بول کر آپس میں سمجھتے سمجھاتے ہوں گے، وہ تو خدا ہی جانے۔ مگر بلی کو دیکھو، کسی ملک کی ہو، خواہ غافل سوتی ہو، خواہ کسی طرف جاتی ہو، جب پھش پھش کر کے آواز دو گے، فوراً دیکھنے لگے گی۔ کتا کسی ولایت کا ہو جب تم پُچس پُچس کر کے آواز دو گے، ضرور چونکتا ہو کر دیکھنے لگے گا۔ بلکہ محبت کی دُم بھی ہلانے لگے گا۔ یہ عموماً بازاری کتوں کا حال ہے اور جو تعلیم یافتہ ہیں ان کا تو کیا کہنا!

جب یہ بات قرینِ قیاس ٹھہری کہ انسان بھی ابتدائے آفرینش میں اشاروں سے سمجھتا سمجھاتا تھا تو یہ بھی ظاہر ہے کہ سوچنے اور ایجاد کرنے کی لیاقت اُسے خدا نے دی تھی۔ برس دو برس کے بچوں کو دیکھو فقط چیخیں ہی مارتے ہیں، یا مہمل آوازیں کام میں لاتے ہیں۔ جس بات کو جی چاہتا ہے یا کچھ چیز مانگتے ہیں یا نہیں کرنا چاہتے ہیں تو انگلیوں کے اشاروں سے سر کے ہلانے سے اور اُنھ اُنھ، ںے ںے کر کے تمھیں اپنی خواہشیں جتا دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ کچھ کچھ اور آوازیں بھی ٹھہرا لیتے ہیں۔ مثلاً پانی کے لیے مَم مَم اور کھانے کو پَپَہ پَپَہ یا بپہ وغیرہ وغیرہ۔ تم نے دیکھا! اعضائے تکلم میں ہونٹ سب سے زیادہ نرم ہیں۔ ذرا سے ارادے میں ہل جاتے ہیں۔

انہی سے یہ صدائیں نکلی ہیں، نہ کہ مسوڑوں سے یا ناک سے یا کان سے۔ رفتہ رفتہ کچھ اور آوازیں نکالنے لگتے ہیں، یا سیکھ جاتے ہیں۔ البتہ ان کے استاد یا رہنما بھی ہوتے ہیں (وہ کون؟ یہی گھر والے) اور یہ آوازیں بھی اوّل ان چیزوں اور ان آدمیوں پر کام آتی ہیں، جو ان کے آس پاس ہوتے ہیں۔

اسی طرح فرض کرو کہ آفرینش عالم طفولیت میں ہے اور ایک جگہ دو چار ہی آدمی رہتے ہیں۔ اس وقت ان کے کیا معاملات؟ اور کیا سامان ہیں؟ ایک پہاڑ کے بن مانس یا صحرا کے حبشی پر خیال کرو کہ اس کے پاس ایک ہڈی ہے، وہ اس میں سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ فرض کرو ایک ویسا ہی جنگلی اس پر ہاتھ بڑھا کر، آنکھیں نکال کر، گردن کو اینٹھا کر غرّایا تو پہلا جنگلی ضرور سمجھ گیا ہوگا کہ یہ ہڈی چھیننی چاہتا ہے۔ اگر برخلاف پہلی حالت کے اُوں اُوں کر کے، نرم نرم ہیمن آواز نکالی اور غریبی کا رنگ دکھا کر آنکھیں چندھیائیں اور آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا تو وہ سمجھ گیا ہوگا کہ یہ بیچارہ بھی بھوکا ہے۔ عاجزی سے ہڈی مانگتا ہے اور یہ حالتیں تم روز اکثر حیوانوں میں مشاہدہ کرتے ہو۔ بعد اُس کے اِس کے کھانے پینے کے علاوہ اور چیزوں کے لیے بھی آوازیں مقرر ہو گئی ہوں گی۔ پھر رفتہ رفتہ لفظ پیدا ہو گئے ہوں گے۔

تاریخی لطیفہ۔ اکبر کے دربار میں گفتگو ہوئی کہ انسان کی اصلی زبان کیا ہے؟ ایک مکان عالی شان شہر سے الگ تجویز ہوا۔ چند حاملہ عورتوں کو وہاں رکھا۔ گونگی انائیں، مامائیں، گونگے خدمت گار باہر کے لیے نوکر کیے۔ جب بچّے پیدا ہوئے تو ماؤں کو الگ کر کے بے زبانوں کو گونگی اناؤں کے سپرد کر دیا۔ پرورش کی ضروریات سب حاضر اور حکم تھا کہ کوئی بولتا آدمی ان کے پاس نہ پھٹکنے پائے۔ جب بچّے چار چار پانچ پانچ برس کے ہوئے تو بادشاہ خود گئے۔ بچّوں کو سامنے لا کر چھوڑ دیا۔ سب جنگلی جانوروں کی طرح غائیں پائیں کرتے تھے۔ ایک بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔

تم ننھے ننھے بچّوں کو دیکھتے ہو؟ جو چیزیں انھیں نظر آتی ہیں اور انہی سے کام پڑتے ہیں، اُنہی کے لیے سب سے پہلے اشارے اور آوازیں بھی قرار دیتے ہیں۔ ان میں سب سے اوّل پیاری ماں اور پیارا باپ ہوتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے بچّوں کے اعضا کا جز جز قابو میں نہیں ہوتا کہ حروف میں امتیاز اور فرق پیدا کر سکیں۔ سب سے آگے وہی ہونٹ ہیں۔ انھیں میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور بچّہ کہتا ہے مَ مَ بَ بَ۔ اس بات کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اختلاف وطن اور

آب وہوا کے فرق سے طبیعتوں میں بھی فرق ہو تا ہے۔ لیکن چونکہ انسانیت کے لحاظ سے سب ایک تھے۔ اس لیے دیکھو! طبیعت کے استاد نے سب کو ایک ہی نام سکھایا اگرچہ ذرا ذرا سا فرق ہو گیا ہے۔

لیکن تقریباً سب زبانوں میں ماں باپ کے نام جو بچّہ سب سے پہلے سیکھتا ہے ایسے اصوات سے مرکب ہیں جن کا تلفظ ہونٹوں کی جنبش یا محض منہ کھول کر آواز نکالنے سے ہو تا ہے۔ مثلاً

انگریزی میں باپ کو پاپا کہتے ہیں۔ ماں کو ماما
عربی میں باپ کو اب یا ابا کہتے ہیں۔ ماں کو ام
فارسی میں باپ کو بابا کہتے ہیں۔ ماں کو مام

اشارات میں دیکھ لو۔ طبیعتِ انسانی کا اتحاد ہر ملک کے بچّہ سے اشارہ کے لیے پہلے انگلی اٹھواتا ہے پھر آواز سے کہواتا ہے یُہ یُہ۔ پھر پاس کے لیے یہ اور دور کے لیے وُہ ہو جاتا ہے۔

بچّہ پہلے چیزوں کے نام یعنی اَسما سیکھتا ہے۔ اسی واسطے جب کوئی چیز لینی چاہتا ہے تو فقط اسی کا نام لے کر پکار تا ہے۔ بھوکا ہو تا ہے تو دُو دُو دُو دُو کہتا ہے۔ پیاسا ہو تا ہے تو فقط مَم مَم کہتا ہے۔ مٹھائی کو جی چاہتا ہے تو چیجی بلکہ چی کہتا ہے۔ جب گویائی میں ذرا زورِ رفتار پیدا ہو تا ہے تو فعل بھی لگانے لگتا ہے۔ مگر غلط سلط۔ رفتہ رفتہ حروف لگا کر باتیں کرنے لگتا ہے۔ زبان کے انجان پردیسیوں کو دیکھا اور خود سیاحتوں میں تجربہ ہوا کہ غیر ملک میں جا کر لین دین، کام کاج میں پہلے فقط اسموں سے کام نکالنا پڑتا ہے۔ مثلاً روٹی چاہیے تو پیسے دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نان۔ یعنی پیسے موجود ہیں روٹی دو۔ دکان دار روٹی دکھاتا ہے اور انگلی کا اشارہ کرتا ہے۔ یعنی ایک پیسا یا دو پیسے۔ اسی طرح گھی نمک وغیرہ۔ چند روز کے بعد کچھ فعل یاد ہو جاتے ہیں۔ حرف سیکھ لیتا ہے۔ اسی کہنے سننے میں آدھے سارے جملے جوڑنے لگتا ہے۔ باعتبارِ ولادت کے اشارت کا نمبر اوّل تھا۔ لیکن کلام بہت اچھی کارگزاری کرتا ہے۔ اس لیے زبان اس پر چرب ہوئی اور ادائے مطلب کا کام اٹھا لیا۔

الفاظ، جن سے زبان کا کام چلتا ہے، کیونکر پیدا ہوئے؟

ایک گروہِ کثیر ایک ہی دادا کی اولاد ہو، لیکن جب کنبہ کنبہ ایک ایک پہاڑی یا قطعہ زمین پر الگ الگ بستے ہوں تو ضرور ہے کہ ضرورتِ وقت یا قدرتی اتفاق ان میں نئی چیزیں پیدا کریں، اور ظاہر ہے کہ ہر مقام میں ایک ہی چیز کا جُدا جُدا نام پکارا جائے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک ہی چیز کے لیے مختلف مقاموں کے نام جمع کریں تو ہر چیز کے لیے کئی کئی نام ہوں گے۔ پھر جب کہ سلطنت کا امن یا باہمی ارتباط آمد و رفت کے کسا جال پھیلائے اور تعلیم و تربیت عام ہو جائے تو بہت سے نام خود بخود گر جائیں گے اور ہر شے کے لیے ایک نام رہ جائے گا۔ وہ کبھی تو مناسبت کے سبب سے زیبا و برجستہ ہو گا اور کبھی جو بندھ گیا وہی موتی۔ اس وقت یہ ضرور ہے کہ ہر شے کو نام خاص سے پکارنے کے لیے سب کا اتفاق ہو گا۔ اب اگر کوئی پوچھے کہ لفظ کیا شے ہے؟ تو تم کہہ سکتے ہو کہ وہ ایک زبانی تصویر ہے یا پتہ نشان ہے کسی چیز کا، یا فعل کا۔

دنیا ہمیشہ ترقی کے رستہ میں رواں ہے، کیسی ہی ابتدائی حالت ہو، شائستگی پھیلے جائے گی۔ علوم اور فنون کی دستکاری نئی چیزیں پیدا کرے گی۔ لین دین جسے ترقی نے تجارت کا خطاب دیا ہے ایک جگہ کی چیزیں دوسری جگہ پہنچائیں گے۔ اس سبب سے بھی نئے الفاظ ہر جگہ پیدا ہوں گے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچیں گے۔ کیونکہ چیزیں اور کام نئے ہیں۔ دیکھ لو! یہی سبب ہے کہ دیہات میں الفاظ کم ہوتے ہیں، شہروں میں بہت۔ اور شہری الفاظ کی خوش آوازی، خوش ادائی اور لطافت گاؤں والوں کو اپنی شاگردی پر مجبور اور مشتاق کرتی ہے۔ اسی کو خاص و عام کا اتفاق کہتے ہیں اور اس سے الفاظ اور اصطلاحیں پیدا ہوتی ہیں۔

اب کوئی پوچھے کہ تقریر کیونکر پیدا ہوئی؟ تم صاف کہہ دو گے کہ انسان میں جو چیخنے یا چلانے کی خاصیت ہے، وہ باہمی ضرورتوں اور آپس کے برتاؤ سے اصلاح اور ترقی کرتے کرتے تقریر ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ رتبہ پیدا کیا کہ جس طرح ایک مصورِ کامل کسی انسان یا باغ یا محل کا نقشہ کھینچ کر اس کی کیفیت آنکھوں کے رستے سمجھاتا ہے۔ صاحب زبان اپنے مافی الضمیر اور حرکت اعضا کے مجموعہ کو آواز کے رنگ میں کانوں کے رستے سمجھاتا ہے۔ پس گویائی گویا ایک عمدہ آلہ ادائے خیال کا ہے۔ لیکن نامکمل، کیونکہ کون سا قادر الکلام ہے جو دل کے خیال کو جوں کا توں پورا پورا اپنے لفظوں میں ادا کر لے۔ عمدہ سے عمدہ کلام دل کے خیالات کی تصویر ہے۔

لیکن ایسے پانی میں ہے جو گدلا ہے یا عکس ہے ایسے آئینہ میں جو دھندلا ہے۔

تم نے خیال کیا؟ زبان یعنی تقریر گویا انسان کے دل، انسان کی خواہش اور اس کے حرکات اعضائی کا مجموعی خلاصہ ہے۔ اسی خیال سے زبان عرب کے ابتدائی محققوں میں عباد بن سلیمان ضمیری نے کہہ دیا کہ "الفاظ اپنے حروف، اعراب اور آوازوں کے ذریعے سے خود بخود اپنے معنی بتلاتے ہیں۔" مگر یہ رائے عموماً درست نہیں۔ اصفہانی نے شرح منہاج بیضاوی میں لکھا ہے کہ جمہور اہل لغت اس پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اگر یہی بات ہوتی تو ہر شخص ہر لفظ کے معنی سمجھتا۔ بتانے اور لغت میں دیکھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ دوسرے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں، جو باہم مخالف ہیں۔ اگر الفاظ بالطبع اپنے معنوں پر دلالت کرتے تو یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ البتہ لفظ بھی بعض جگہ اپنے معنوں پر آپ اشارہ کرتا ہے۔ دیکھو۔

تندر (رعد) کو خیال کرو اس لفظ میں گرج زور و شور سنائی دیتا ہے یا نہیں؟

درشت کو دیکھو۔ کرخت پر خیال کرو، سختی اور کھردراپن نہیں پایا جاتا؟

تیر کی ی کو مد کی کشش میں دیکھو۔ صاف نظر آتا ہے کہ کوئی تیز چیز تیز رو ہے کہ سیدھی چلی جاتی ہے۔

خم یا خُسب بولنے میں بھی اپنی جھلاوٹ اور گلاوٹ کی تصویر دکھاتا ہے۔

یورپ کے دانا کہتے ہیں کہ پہلے طبیعت کی تاثیر نے حالت کے مناسب آوازیں نکالی تھیں۔ پھر استعمال اور تہذیب نے انہی کو لفظ بنا دیا، یہ رائے قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

چہچہہ بلبل کی آوازِ مسلسل کا نام ہوا۔ کوکو فاختہ کی آوازِ متواتر کا۔

غرّش جانوروں کی خفگی کی آواز۔ قہقہہ انسان کی ہنسی۔

غوغا غلغلہ۔ غلغل۔ شور و غل انسان کا ہوا۔

کوہستان خراسان و ایران کے کوّے دیکھے۔ چیل سے ذرا چھوٹے ہوتے ہیں اور بولنے میں صاف کلغ کلغ آواز دیتے ہیں۔ کلاغ ان کا نام ہو گیا۔ چغوک اسی آواز کے سبب سے چڑے کا نام ہوا (یعنی چڑیا کا نر)

تم ضرور کہو گے کہ اپنے رنگ آواز اور ادا کے انداز اور دل کی حالت کو ملا کر جو معنی چاہو پیدا کر لو۔ اصلی لفظ میں تو ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی درست ہے، لیکن میں

پہلے کہہ چکا ہوں کہ زبان انسان کی آواز، دل اور اشارات اعضائی کا مجموعہ ہے۔ اس صورت میں کسی جز کو روکنا نہیں چاہیے۔[1]

ولادتِ زبان کی بنیاد تم نے دیکھ لی؟ پہلے کچھ اشارے تھے۔ پھر کچھ آوازیں۔ پھر باہمی اتفاق سے کچھ الفاظ آپس کے سمجھنے سمجھانے کے لیے مقرر ہوگئے۔ پس جب آفرینش بڑھے اور آبادی پھیلے تب بھی واجب ہے کہ وہی الفاظ کام میں لائیں کہ سب کی سمجھ میں آئیں اور عام فہمی کے سبب سے انھیں سب سے پہلے کام میں لائیں۔[2]

زبان میں کسی کو اپنی طرف سے ایک لفظ بھی ایجاد کرنے کا اختیار نہیں ہے! یہ ہو سکتا ہے کہ میں شادمی کہوں اور اس کے معنی رکھوں آدمی۔ اسے شاید میرے نوکر چاکر یا دوست آشنا سمجھنے بھی لگیں مگر اور سب کب مانیں گے! اور مانیں کیا؟ اگر چند لفظ ایسے تصنیف کرلوں تو کوئی میری بات بھی نہ سمجھے گا۔

اسی بنیاد پر عرب کے اہل تحقیق نے کہا ہے کہ لغت[3] وہ ہے کہ جس پر جمہور کا اتفاق ہو۔ اصطلاح وہ ہے جس پر خاص گروہ کا اتفاق ہو۔ البتہ کوئی علمی مصنف یا صاحبِ ایجاد قادر الکلام شخص بھی الفاظ ایجاد کر سکتا ہے۔ لیکن ان کے قیام عمر کے لیے اسے بھی جمہور کا حسن قبول حاصل کرنا پڑے گا۔

---

1 اور یہی سبب ہے کہ اگر ایک فصیح صاحب تقریر لکچر دے رہا ہو اور تم اس پر یہ قید لگادو کہ کسی طرح کی حرکت اعضا میں یا تغیر چہرہ میں نہ آنے پائے تو دیکھ لوگے کہ بات بھی نہ کر سکے گا۔

2 یہاں سے یہ ثابت ہوا کہ جس لفظ پر محاورہ صحہ کر دے وہی فصیح ہے وہی درست ہے۔ صحیح لفظ ہو اور محاورہ میں نہ ہو تو نارواہے اگر اور کچھ نہیں تو کلام کو بدمزہ یا مکروہ ہی کر دے گا۔

3 لغت کسی زبان کے عام الفاظ جسے ملک مذکور کے عام رہنے والے سمجھتے تھے یا سمجھے ہوں یا زبان مذکور کے جاننے والے جانتے ہوں۔ اسی کو کہتے ہیں کہ لفظ کے معنی قوم نے تسلیم کیے اور اصطلاح وہ ہے کہ گروہِ خاص میں متعارف ہو۔ مثلاً جو بات پیل کے کشت سے ہو اسے پیل بند کہتے ہیں۔ دیکھو نعمت خان عالی نے وقائع میں ایک فرضی مہاجن کا معائنہ کیا ہے۔ اس کا شعر ہے :

آں صورتِ مہابتِ پیلانِ مینہ پول   ما را چہ پیل بند حساب و کتاب کرد

جو شخص اہل شطرنج کی اصطلاح کو جانتا ہوگا وہ اس شعر کا لطف اٹھائے گا، غیر کی سمجھ میں نہ آئے گا۔

عزیزانِ وطن! ولادتِ الفاظ اور آفرینش زبان کے خیالات مجملاً آپ کے تصور میں آگئے ہوں گے۔ اب یہ سنیے کہ فلسفی زبان کا منصب کیا ہے۔ اس کا منصب ہے تقریر کے ہر لفظ کو کریدنا جس سے کہ زبان مرکب ہے۔ اس سے شاید تم یہ سمجھے ہو گے کہ فلسفی زبان کو اکثر زبانوں کے لفظ اور معنی خوب آتے ہوں گے۔ وہ عبارت میں مبتدا۔ خبر۔ مضاف۔ مضاف الیہ۔ صلہ۔ موصول وغیرہ وغیرہ کو خوب سمجھتا ہوگا۔ نہیں! یہ تو بہت ادنیٰ کام ہے۔ وہ لفظ کی اصل و نسل ولادت سے وقتِ موجود تک دریافت کرتا ہے۔ تم نے کسی نیاریے یا تیزابیے کو دیکھا ہے؟ جب ایک دھات کی ڈلی اس کے ہاتھ میں آتی ہے تو وہ اسے دیکھتا ہے اور جانچتا ہے کہ ایک مادّہ ہے یا کئی مادّے گتھے ہوئے ہیں۔ تب کبھی تیزاب سے، کبھی آنچ کے زور سے گلا کر ان کا جوڑ جوڑ کھول لیتا ہے کہ اس کی اصل کہاں پہنچی ہے۔ اسی طرح ماہر زبان ایک لفظ لیتا ہے وہ تیزاب یا آنچ کام میں نہیں لاتا۔ فقط عقل کے تیزاب سے حرفوں کے جوڑ بند کھولتا ہے اور معنوں کو سوچ کر اس کی ساری اصل نسل دریافت کر لیتا ہے۔

میرے دوستو! تم حیران ہو گے کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا؟ ہاں لفظ کی بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفی لفظ کے جز جز کو الگ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت ان کی اصل کس کس ملک اور کس کس قوم میں پہنچتی آئی ہے۔ ان میں کیا رشتے ہیں؟ اور کیونکر وہ رشتے پیدا ہوئے ہیں؟ اور ملک بملک ان کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوئے ہیں۔ پھر اور زبانوں کے لحاظ سے اپنی باتوں پر غور کرتا ہے۔ ان کے نتائج کو بھی جانچتا ہے اور مطابقت اور مقابلہ کرتا ہے۔ یعنی ایک زبان کے لفظ دوسری زبان سے کن کن باتوں میں متفق ہیں اور کونسی باتیں ہیں کہ ایک ہی کے لیے خاص ہیں۔ پھر ان سببوں کی جستجو کرتا ہے جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں۔ اور یہ غیر منقطع کام ہے کبھی ترقی کے رنگ میں ہوتا ہے، کبھی تنزل میں، مگر جاری ہمیشہ رہتا ہے اور اسی کو زبان کی اصل نسل کہتے ہیں۔ اب چند مثالیں توضیح مطلب کے لیے لکھتا ہوں :

گریبان کو فلسفی زبان نے دیکھا۔ بان پر جوڑ معلوم ہوا۔ اس نے گریے کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بمعنی گلو پایا۔ سمجھ گیا کہ اس جزو لباس کا گلے پر قبضہ ہے اس لیے اس کا نام گریبان رکھا ہوگا کہ مالک گلو ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں گریو ग्रीवा انہی معنوں میں آیا ہے اور بان سنسکرت میں وان वान ہے۔ ثابت ہو گیا کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ ملک اور مدت کے انقلاب سے

آواز بدل گئی، یہاں مر گیا وہاں جیتا ہے۔
کلابتون کو سب پہنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں، فلسفی زبان اس کا بل کھولتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کلابہ۔ کلاوہ (سوت کا لچھا)۔ آلتون ترکی میں سونے کو کہتے ہیں وہی سنہرا لچھا ہوا۔
نیلوفر کو بے خبر آدمی ایک گلِ خودرو سمجھے گا، فلسفی زبان دیکھے گا کہ نیلوپر۔ نیلوفل۔ نیلوپل۔ نیلپر۔ سب طرح مستعمل ہوا ہے۔ تب ادھر ادھر نظر دوڑائے گا۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ سنسکرت میں نیل नील نیلا۔ اُت پل उत्पल پنکھڑی ہے۔ یعنی نیلی پنکھڑی والا پھول، فارسی میں اُدَل بدَل ہو کر کچھ سے کچھ ہو گیا۔
ناہار اور نہار ہندستان میں بھی سب جانتے ہیں۔ فلسفیِ زبان نے دیکھا تو ن پر جوڑ معلوم ہوا۔ اہار کو دیکھا تو فارسی بلکہ سنسکرت میں بھی بمعنی خورش آیا ہے۔ سمجھ گیا کہ صبح سے جب تک کچھ نہ کھایا ہو اس وقت تک ناہار یا نہار ہے[1]۔
خُربزہ کو سونگھا تو بو آئی کہ مرکب ہے۔ خر کو دیکھا بمعنی کلاں بھی آتا ہے۔ بُزہ کو دیکھا تو فارسیِ قدیم میں بمعنی ثمر ہے۔ سمجھ گیا کہ بڑا پھل تھا، اس لیے خُربزہ نام رکھا ہوگا۔ سنسکرت میں بھی بعینہٖ یہی دو جز اور یہی معنی ہیں۔

میرے دوستو! تم دل میں کہتے ہو گے کہ اس توڑ جوڑ اور لفظوں کے رگ پٹھے چیرنے سے کیا فائدہ؟ جب ہم ایک زبان سیکھتے ہیں تو اس میں یہی غرض ہوتی ہے کہ اور کی بات سمجھ لیں اپنی بات سمجھادیں۔ اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ لفظوں کے معنی آگئے۔ عبارت کا مطلب معلوم ہو گیا۔ والسلام۔ میں بھی کہتا ہوں۔ بے شک زبان سیکھنی ہو تو اس سے زیادہ کاوش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ذرا خیال کر کے دیکھو۔ جب تم کوئی شکل اقلیدس کی حل کرتے ہو یا ایک حساب کے سوال کا جواب نکال لیتے ہو۔ یا ایک بچّہ کوئی پہیلی بوجھتا ہے تو کیا خوشی ہوتی ہے! ہزاروں پھول، پھل، بوٹیاں، نباتات، جمادات ہیں۔ اگر ان کے مزے اور اصلی تاثیریں معلوم کر کے تمھیں خوشی حاصل ہوتی ہوگی تو لفظوں کی اصلیت دریافت کر کے بھی ضرور خوشی ہوگی۔ جن الفاظ کی توضیح میں نے بیان کی۔ انھیں سن کر کس کے دل کو فرحت

1۔ ایران میں کہتے ہیں نہار حاضر است یعنی دستر خوان پر صبح کا کھانا چنا ہوا ہے۔ آپئے نوش جان فرمایئے اور ہنوز نہار نہ کردم۔ یعنی ابھی صبح کا کھانا نہیں کھایا۔

نہیں ہوئی؟ البتہ بدمزہ۔ بے مغزے کہ الفاظ کو فقط منہ کی بھاپ یا پیٹ کا سانس سمجھتے ہیں۔ انھیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہونٹ سے لفظ نکلے ہوا ہوگئے۔ ان کے نزدیک کچھ بات ہی نہیں۔

الفاظ ظاہر میں ہوائی جنبشیں ہیں، لیکن حقیقت میں مستقل چیزیں ہیں۔ تم ضرور پوچھو گے کہ الفاظ مستقل چیزیں کیونکر ہو سکتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ جب تمھیں کوئی چیز مثلاً چاکو یا قلم درکار ہوتا ہے۔ اگر ایک لڑکے سے بھی کہتے ہو تو فوراً اٹھا لاتا ہے۔ دور ہو یا پاس۔ حالانکہ تم نے فقط لفظ کہا تھا چاکو یا قلم کی تصویر بنا کر نہیں دی۔ دیکھو لفظ نے اس کے دل پر اصل شے کا کام دیا۔

تم لفظوں میں فقط اتنا ہی نہ سمجھو کہ برائے نام خاص خاص چیزوں پر اشارے کرتے ہیں۔ غور کرو گے تو پاؤ گے کہ وہ بھی اور چیزوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں۔ ترقی و تنزل کرتے ہیں۔ سفر کرتے ہیں اور اس میں طبیعت اور رنگ بدلتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔ ان کے حالوں، چالوں اور انقلابوں کو دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ جس طرح قوموں کی تاریخیں اپنے حالات و مقالات سے کملائے ہوئے دلوں کو شگفتہ کرتی ہیں۔ لفظوں کی تاریخیں اپنے لطف و خوبی کے ساتھ اس سے زیادہ دماغوں کو شاداب کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا فائدہ ہوگا کہ لفظوں ہی کے مقابلہ اور مطابقت میں قوموں، نسلوں اور ان کے خاندانی رشتوں کے سر رشتے نکل آئے۔

الفاظ کے تغیر طبیعت اور ان کے رنگ بدلنے پر تمھیں ضرور کھٹکا گزرے گا کہ اسما حقیقت میں اشیا کے نام ہیں۔ جب چیزیں نہیں بدلیں اور نام ان کے بدل گئے تو الفاظ اور معانی میں عجب خلط ملط پیدا ہوگا۔ میرے دوستو! یہ تغیر ضرور ہوتے ہیں اور وہ قباحت نہیں پیدا ہوتی جس کا تمھیں خطر ہے۔ دیکھو؟

جیب۔ عرب میں اوّل سینہ کو اور دل کو بھی کہتے تھے۔ پھر گریبان کو کہنے لگے کہ سینہ پر ہوتا ہے۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ جَوب بمعنی قطع ہے گریبان کترا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا نام جیب رکھا۔ عرب کے لوگ جبّہ یا کرتہ کے گریبان میں ایک تھیلی ٹانک کر اس میں چیز رکھ لیا کرتے تھے۔ مدت کے بعد اسی کا نام جیب ہو گیا۔

فارس میں وہ تھیلی گریبان سے ڈھلک کر کمر کے نیچے آگئی اور نام وہی جیب رہا۔ تماشا یہ کہ اب گھڑی کے شوقینوں نے چھاتی کے بائیں طرف جگہ دی اور کوٹ پتلون والوں نے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ پھر بھی وہی جیب ہے اور عرب میں جیب وہی گریبان ہے۔

جب عرب میں علم ریاضی کا چرچا اور علم مثلث کا یونانی سے ترجمہ ہوا تو جو خط کسی قوس یا اس کے زاویہ کا اندازہ بتائے اسے جیب کہنے لگے۔ کیونکہ وہ بھی قوس کے لیے ایسا ہے جیسے سینہ کے لیے گریبان۔

شمع عرب میں موم کو کہتے ہیں۔ پھر موم کی شمعیں بننے لگیں۔ ان کا نام بھی شمع ہی رہا۔ فارس میں آکر چربی کے قالب میں ڈھلیں۔ یہاں شمع عام ہو گئی۔ موم کی بتی ہو خواہ چربی کی۔ عرب میں شمع وہی موم ہے۔

اسباب عربی میں سبب کی جمع ہے۔ فارسی میں اسباب خانہ داری کو کہتے ہیں۔

شراب عرب میں پینے کو اور اس چیز کو کہتے ہیں جو پینے میں آئے۔ فارس میں مرادف بادہ ہو گیا۔

(1) بعض الفاظ سفر کر کے آتے ہیں اور ملک غیر میں بے عزت ہو جاتے ہیں[1]۔

غلام عرب میں نوخط لڑکے کو کہتے ہیں۔ فارس میں لونڈی کا نر غلام۔

مہتر فارسی میں سردار کو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں چوڑھا ہو گیا۔

خلیفہ کا رتبہ عرب میں نائب پیغمبر اور خلیفہ الٰہی تک پہنچا ہوا ہے۔ ہندستان میں نائی کو کہتے ہیں۔

اس زمانہ میں لفظ ایجاد نہیں ہوتے۔ نئے خیالات کے ادا کرنے میں پرانے الفاظ مدد کرتے ہیں۔ مثلاً :

نفط رال کا مرادف ہے۔ اب مٹی کے تیل کو بھی کہتے ہیں۔

مداد پہلے سیاہی کو کہتے تھے۔ اب پنسل کو بھی کہتے ہیں۔ پہلے قلم سرمہ اور کلک فرنگی کہتے تھے۔ یہ لفظ مر گئے۔

بوقلموں چند سال سے فیل مرغ (پیرو) وہاں پہنچا ہے۔ اسے بوقلموں کہتے ہیں۔

(2) کبھی دو لفظ مرکب کر لیتے ہیں۔ مثلاً :

سیب زمینی آلو کو کہتے ہیں۔ یہ بعینہٖ ترجمہ ہے پوٹے ٹو کا۔ پس معلوم ہوا کہ فرانس کے رستہ سے پہنچا ہے۔

آبجوش سوڈا واٹر کو کہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ہزاروں لفظ پیدا ہو گئے ہیں۔

---

1 آلتہ۔ وصف کردن، شہوت، صحبت کردن و صحبت داشتن۔

(3) کبھی مشتق کر لیتے ہیں۔ وہاں بھی اب برف کوزوں میں جماتے ہیں۔ اسے **بستنی** کہتے ہیں۔

(4) کبھی جو شے آتی ہے اپنا نام ساتھ لاتی ہے **تلگراف** ایران میں تار کے پیغام کو کہتے ہیں۔ اس میں تصرف کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ہشت روز است خط نوشتہ بودم۔ جواب نیامد۔ ناچار امروز تیل زدہ ام (آج میں نے تار دیا ہے)۔

منات نوٹ کو کہتے ہیں۔ روسی لفظ ہے۔

پرتغال ایک قسم کا رنگترہ ہوتا ہے۔ اس کا پودہ پرتگال سے آیا تھا۔ وہی نام ہو گیا۔

کالسکہ بگّی کو کہتے ہیں۔ یہ بھی روسی لفظ ہے۔ ایسے سیکڑوں لفظ ایران میں زبان زدِ خاص و عام ہیں اور اکثر چیزوں کے نام بدل گئے ہیں۔ پہلے ناموں کو سمجھو کہ مر گئے۔

چاپ چھاپے کا کام ہندُستان سے گیا۔ اسی واسطے یہ نام پایا۔

(5) علمی الفاظ اور علمی اصطلاحیں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اکثر زندہ رہتی ہیں اور کارروائی کرتی ہیں۔ علم ہمیشہ ترقی کرتا ہے اور اصلاح پاتا ہے۔ اس لیے بعض الفاظ جلد مر جاتے ہیں۔ نئے پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج سے 30 برس پہلے کی ریاضی یا جغرافیہ کی کتاب اردو زبان میں دیکھو تو یہ تعجب جاتا رہے گا۔

(6) خوش ایجاد نام بھی اکثر کم عمر اور ناپائدار ہوتے ہیں۔

محمود غزنوی جب ہندُستان میں آیا اور آم کھایا تو بہت بھایا۔ مگر نام سن کر ہنسا اور کہا۔ سخت ستم ہے کہ ایسا لطیف میوہ اور نام میں یہ فحش! اسے **نغزک** کہنا چاہیے کہ اسم با مسمّٰی ہو چنانچہ بعض فارسی کی کتابوں میں **نغزک** بعض میں انبہ لکھتے ہیں۔ امیر خسرو نے قران السعدین میں ہندُستان کے میووں کی تعریف کرتے کرتے آم کے باب میں بھی چند اشعار لکھے ہیں :

نغزکِ خوش مغزکنِ بوستاں خوب تریں میوۂ ہندوستاں

نعمت خان عالی نے اپنے دوست حسن خاں کو آموں کی رسید لکھی۔ اس کی نظم میں ایک شعر ہے کہ نہیں بھولتا :

انبہ فرستاد حسن خاں بمن اَنۡبَتَهُ اللهُ نَبَاتاً حَسَنۡ

اکبر نے صدہا چیزوں کو ناموں کے خلعت دیے۔ کوئی باقی ہے کوئی پرانا ہو کر پھٹ گیا۔ ایک دن

اصطبل خاصہ میں گھوڑوں کے دیکھنے کو آیا۔ ہلاک خور ٹوکرے بھر بھر کر کثافتیں اٹھا رہے تھے۔ فرمایا کہ بڑی محنت کی روٹی کھاتے ہیں، انھیں حلال خور کہنا چاہیے۔ آج تک وہی نام چلا آتا ہے۔

ہار کو کہا کہ سنگار کی چیز اور مبارک چیز پر ہار کا نام آنا بدشگونی ہے۔ اسے 'پُھل مال' کہا کرو۔ یہ سرسبز نہ ہوا۔

اسی خیال سے گھوڑے کی اندھیری کا اُجیاری نام رکھا یہ پیش نہ گئی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسے اب ہم 'اندھیری' کہتے ہیں اس وقت اسے بھی اندھیاری کہتے تھے۔

جہانگیر نے شراب کا نام رام رنگی رکھا۔ مگر رنگ نہ جما۔

جمعرات کا نام مبارک شنبہ رکھا کہ جو خوشی ہمیں ہوتی ہے اکثر اسی دن ہوتی ہے۔

پیر کا نام گم شنبہ رکھا۔ لکھتا ہے کہ مجھے جو غم یا فکر ہوتا ہے اسی دن ہوتا ہے۔ اس کا نام ایام ہفتہ سے گم ہونا چاہیے۔

محمد شاہ نے بلبلِ ہندوستان کا نام گلدم رکھا تھا۔ اب تک اسی طرح چلا آتا ہے۔

رنگترہ کو پہلے سنگترہ کہتے تھے۔ محمد شاہ نے کہا کہ اس لطیف میوہ کو پتھر مارنا سخت ستم ہے۔ رنگترہ کہا کرو خوش رنگ بھی ہے، تروتازہ بھی ہے۔

شاہ عالم نے سُرخاب کو گلسرہ کہا مگر شہرت نے نامنظور کیا۔

کنجر اور کنجری ہندی میں زنِ رقاصہ کو کہتے تھے۔ اکبر نے ایک دن خوش ہو کر کہا کہ انھیں کنچنی کہا کرو۔

نواب سعادت علی خاں نے ملائی کا نام بالائی رکھا۔ اہل لکھنؤ اب بھی بالائی کہتے ہیں۔ اور شہروں میں شہرت نہ ہوئی۔

عزیزانِ وطن! تم ضرور کہتے ہوگے کہ زبان کی عمر کیا؟ اور اس کی تاریخ کیا؟ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ عالم میں بہت سے ملک۔ بے شمار اہل ملک اور ہزاروں قومیں ہیں۔ اسی طرح زبانوں کا بھی عالم گروہ در گروہ سمجھو کہ تھا اور ہے اور ہوتا رہے گا۔ جس طرح قومیں بڑھیں، چڑھیں، ڈھلیں اور فنا ہو گئیں اور ہوں گی۔ اسی طرح زبانوں کا عالم ہے کہ اپنے الفاظ کے ساتھ آباد ہے وہ اور اس کے الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔ ملک سے ملک میں سفر کرتے ہیں۔ حروف و حرکات اور معانی کے تغیر سے وضع بدلتے ہیں۔ بڑھتے ہیں، چڑھتے ہیں، ڈھلتے ہیں اور

مر بھی جاتے ہیں۔

تغیراتِ مذکورہ اکثر تغیر سلطنت کے صدمے سے ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کم ہوتے ہیں۔ پھر بھی ضرور ہوتے ہیں، کیونکہ عادتِ الٰہی اسی رستہ پر جاری ہے اور رہے گی اور میں عنقریب اس کی کیفیت دکھاؤں گا۔

امن و عافیت کے زمانہ میں بھی تغیر کی دستکاری الفاظ و عبارت پر اپنا کام کیے جاتی ہے۔ ان میں آفرینش، ترقی اور فنا کا عمل جاری رہتا ہے اور بہت چپکے چپکے چلتا ہے۔ لیکن اسی طاقت اور اسی انداز سے، جیسے دریا کا بہاؤ یا ہوا کا رخ، جس کا پھیر کسی کے اختیار میں نہیں۔ قوم اپنے گھر میں قائم اور ملک برقرار ہوتا ہے۔ پھر بھی تغیر مذکور اپنا کام کیے جاتا ہے۔ نثر میں شیخ بو علی سینا کی حکمتِ فارسیہ وغیرہ۔ نظم میں دیوانِ شاہ ناصر خسرو، شاہنامہ وغیرہ۔ دیکھ لو، صدہا لفظ ہیں کہ اب بولنے میں نہیں آتے۔ صدہا ہیں کہ فرہنگوں میں دیکھے بغیر معنی نہیں معلوم ہوتے۔ صدہا ہیں کہ فرہنگوں میں بھی نہیں ملتے۔ اسی کو مرنا کہتے ہیں۔

جب ایک زبان کی تصانیفِ مختلفہ کو عہد بعہد اور سال بسال برابر سجاتے ہیں اور تغیراتِ مذکورہ پر نظر کرتے ہیں تو زبان کا عالم ایک سرزمین معلوم ہوتی ہے کہ فصل بہ فصل پرانے نباتات جل کر خاک ہوتے جاتے ہیں اور نئے اگ کر ان کی جگہ کو ہرا کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ فلسفی زبان خواہ زمین کی طبیعت سے خواہ انسان کی ضروریات اور کارروائی پر نظر کر کے فقط تغیراتِ زبان کی تاریخ ہی نہیں جان لیتا۔ بلکہ جس طرح ایک تجربہ کار مورخ یا سلطنت کا مدبّر سابق اور موجودہ حالت کو دیکھ کر آئندہ کے واقعات پر پیش بینی کرتا ہے۔ یہ زبان موجودہ کے حالات پر حکم لگاتا ہے اور بتاتا ہے کہ آئندہ کس طرح اور کس انداز میں بڑھے گی۔ یا دب جائے گی۔ چنانچہ فارسی پر ایک زمانہ میں عرب کی چڑھائی تھی۔ اب ممالک یورپ کا زور نظر آتا ہے۔

الفاظ جو سفر و سیاحت کر کے ملکِ غیر سے آتے ہیں اور زبان میں گھر بناتے ہیں وہ اکثر تجارت کی وکالت یا قوموں کے ارتباط سے راہ پاتے ہیں۔ زبانوں میں عام دستور یہ ہے کہ بعض لباس، بعض کھانے، بعض اجناس، بعض علمی مطالب اور ان کے سامان ملکِ غیر سے آئے۔ وہ یا تو اپنے نام ساتھ لائے یا یہاں آ کر یہیں کی زبان سے نام پائے۔ فارس میں عرب کا تسلّط ہوا اور ملک، مملکت، مذہب، سکونت سب کو روک لیا کہ یہی رستے زبان کے استقلال یا

انقلاب کے تھے۔ اہلِ ملک بہت تو مسلمان ہو گئے، بہت سے آوارہ ہو گئے اور جو بھاگنے کے قابل ہی نہ تھے، وہ گمنامی کے غاروں اور پہاڑوں میں بیٹھ رہے۔ زبان قومی کی حفاظت کون کرتا؟ علوم، فنون، کتابیں اور علمی سامان جو یونان سے پہلو مارتے تھے۔ اس طرح فنا ہوئے کہ نام و نشان تک نیست و نابود ہو گئے۔ پھر جو علم، ادب اور شائستگی نے رونق پھیلائی۔ وہ علما اور شرفائے عرب سے پھیلی، یا ان نو مسلموں سے جنھوں نے عربیت اور اسلام کا جامہ پہن لیا تھا اور اسی کو فخر سمجھتے تھے۔ اقبال سلطنت ایک ایسی برکت ہے کہ جس قوم کے ماتھے کو لگ جاتا ہے۔ اس کی ہر چیز بلکہ بات بات دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ہزاروں فارسی کے لفظ گم ہو کر فنا ہو گئے۔ ہزاروں رہے، مگر بے رغبتی کے سبب بے رواج ہو کر متروک ہو گئے۔

بہت سے نئے الفاظ ہیں کہ سلاطینِ چغتائی کے عہد میں اشیائے مختلفہ کے لیے ہندستان کے اہلِ انشا یا دربار کے ارا کین نے پیدا کیے۔ یہاں کی معتبر تاریخوں میں مسلسل ہیں اور ان شعرا کے کلاموں میں منظوم ہیں، جو کہ ہندستان میں تھے یا آئے اور رہ کر چلے گئے۔

رسد جن معنوں میں بولتے ہیں ایران میں کہو تو کوئی نہ سمجھے گا۔ وہاں سور سات کہتے ہیں۔

منشی ایران میں کسی کو کہیں تو اس کے لفظی معنی (یعنی انشا پرداز) سمجھے جائیں گے اور بس۔ جسے یہاں منشی کہتے ہیں۔ وہاں اسے میرزا کہتے ہیں۔

تمسّک ہندستان میں جن معنوں میں متعارف ہے ایران میں کہیں تو کوئی نہ سمجھے گا۔

رسید یہاں قبض الوصول کو کہتے ہیں۔ ایران میں کہیں تو کوئی نہیں سمجھتا۔

گاؤ تکیہ ہندستانی فارسی ہے ایران میں متکا کہتے ہیں۔

روشنائی لکھنے کی سیاہی کو کہیں تو کوئی ایرانی نہیں سمجھتا۔ وہ مرکب کہتے ہیں۔

دست پناہ ہندستانی فارسی ہے۔ وہاں آتشگیر کہتے ہیں۔

مالیدہ یا ملیدہ ہندستان میں کہتے ہیں۔ وہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ وہ چنگنالی کہتے ہیں۔

اسی طرح عطر دان۔ پاندان وغیرہ وغیرہ۔ ہزاروں لفظ ہیں کہاں تک لکھوں۔

اکثر الفاظ ہیں کہ عربی، فارسی یا ہندی میں اپنے اپنے معنوں میں مستعمل تھے اور ہیں۔ ہماری آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے انقلابِ زمانہ نے نئے خیالات پیدا کیے اور وہی الفاظ جُون بدل کر نئے معنوں کے لیے نامزد ہوئے۔

تہذیب کے معنی لغت میں ہیں پاک کردن۔ اصلاح کردن۔ اب سولزیشن کے معانی کی ہیئت

مجموعی جو کچھ ہے تمھارے ذہن میں ہے اور یہ خیال بھی انگریزی سے ہماری زبان میں آیا ہے۔ تم خود غور کرکے دیکھو! جن جن معنوں کی رعایت سے آج لفظ تہذیب بولا جاتا ہے اور اس میں کوٹ، پتلون اور پھندنے دار ٹوپی بھی شامل ہے۔ وہ حقیقی معنوں سے کس قدر علیحدہ ہیں۔ یہ خیال اور یہ لفظ دونوں ہماری آنکھوں کے سامنے پیدا ہوئے ہیں اور یہی حالت ہے شائستگی کی۔

تعلیم یافتہ کے لفظی معنی تم جانتے ہو۔ انگریزی میں جسے ایجوکیٹڈ کہتے ہیں۔ اب ہم اسے تعلیم یافتہ کہتے ہیں۔ لیکن اس میں کئی صفتیں اور مقصود ہو گئی ہیں۔ جن میں شرافت کی بربادی اور کوٹ پتلون کی فرضیت لازم کی گئی ہے۔ جو تعلیم یافتہ کے اصلی معنوں سے بالکل الگ ہیں۔ یہ خیال انگریزی سے آیا اور حال ہی میں یہ لفظ بھی اس کے لیے نامزد ہوا۔

بلند نظری کے لفظی معنی ظاہر ہیں۔ لیکن حال کی تحریروں اور انگریزی کے ترجموں میں بلند نظر ایسے عالی دماغ، ہمت والے شخص کو کہتے ہیں کہ کوئی بلند رتبہ اور عمدہ حالت اس کی خاطر میں نہ آئے۔ ہمیشہ ترقی کا طالب رہے اور اس کی تحصیل میں کسی خطرناک تدبیر سے اندیشہ نہ کرے۔ یہ لفظ بھی تیس چالیس برس سے پیدا ہوا ہے۔

عزّت طلب۔ میں یہ لفظ عالم طفولیت میں اکثر شرفا کے باب میں سنا کرتا تھا۔ جو شخص کہ سامان، لباس، اخلاق، اطوار، عادات اور معاشرت احباب میں ہمیشہ ایسی حالت کے ساتھ رہے جس سے حکام اور خاص و عام اس کے ساتھ بہ عزّت پیش آئیں۔ اسے تعریف کے ساتھ کہتے تھے کہ فلاں شخص عزّت طلب آدمی ہے۔ لفظ مذکور تحریر میں داخل نہ تھا۔ اب مدت سے متروک ہے۔ ہم سے کچھ پہلے پیدا ہوا اور ہمارے سامنے مر گیا۔

وضعدار بھی ایسے ہی شخص کو کہتے تھے اور تہذیب انگریزی سے پہلے یہ الفاظ شرفا کے لیے تعریف میں داخل تھے کہ پابندیِ وضع لازمہ شرافت تھی۔ دلّی میں اب بھی وضعداری سے بانکپن اور حسن مراد لیتے ہیں۔

اخبار۔ جس صورت سے اب جاری ہیں پہلے یہ صورت ہی نہ تھی۔ اسی واسطے اس کے لیے نام بھی نہ تھا۔ یہ لفظ ان معنوں کے ساتھ ہندستان میں اب پیدا ہوا اور نہ ظاہر ہے کہ اخبار جمع خبر کی ہے اور بس۔ اہل ایران نے اس کے لیے روزنامہ یا خبرنامہ پیدا کیا اور یہ مناسب تر ہے۔

صاحب لوگ۔ عرب میں صاحب بمعنی ہم صحبت ہے۔ پھر اور لفظوں کے ساتھ مل کر فاعلیّت کے معنی پیدا کرنے لگا۔ مثلاً صاحب الصّولۃ۔ والملک والدولۃ۔ فارس میں آکر صاحبِ

ملک، صاحبِ دولت، صاحبِ مال رہا۔ ہندُستان میں آکر لفظ تعظیمی ہوا۔ میر صاحب، مرزا صاحب، نواب صاحب۔ اسّی نوّے برس سے صاحبانِ انگریز کے نام کا جز ہو گیا۔ پھر جو کمینہ سے کمینہ کرشان ہو، وہی صاحب لوگ ہو گیا۔

کوٹھی ہندُستان میں صاحب لوگ لباسِ تجارت میں آئے تھے۔ چونکہ تاجروں کا رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین تاجروں ہی سے ہوتا تھا۔ اوّل اوّل معاملات بھی بنگالہ کے تاجروں اور مہاجنوں سے ہی ہوتے ہوں گے۔ عالمِ مسافرت میں انھیں نوکر چاکر درکار ہوئے ہوں گے۔ وہ بھی انھیں سے لیے ہوں گے۔ عالیشان مہاجنوں اور سوداگروں کی دکانوں کو کوٹھی کہتے ہیں۔ چونکہ صاحب لوگ لباسِ تجارت میں تھے۔ جب کسی سے ملتے جلتے ہوں گے کوٹھی پر جاکر ملتے ہوں گے، وہ پوچھتے ہوں گے، آپ کی کوٹھی کہاں ہے۔ یہ پتہ بتا دیتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ کوٹھی گھر کو کہتے ہیں۔ کیونکہ مسافر تھے۔ ان کی دکان اور کوٹھی ایک ہی تھی۔ ان کے نوکر بھی کوٹھی ہی کہتے ہوں گے۔ کام کے موقع پر آپ کہتے ہوں گے۔ یہ چیز ہماری کوٹھی پر لے آؤ۔ اور لوگ کہتے ہوں گے جاؤ، یہ چیز صاحب کی کوٹھی پر دے آؤ۔ مدّت کے بعد تجارت کا پردہ اٹھادیا۔ وہی گھر دارالحکومت ہو گئے۔ جب سے کوٹھی کا نام جو محاورہ میں آگیا تھا۔ وہی رہا اور یہ نیک نیتی کا پھل ہے۔

چِٹھی۔ بنگالہ کے ہندو مسلمان خط کو چِٹھی کہتے ہیں۔ ابتدا میں جب کوئی صاحب لوگوں کو کچھ لکھتا ہوگا۔ نوکر آکر کہتا ہوگا۔ صاحب یہ چِٹھی آئی ہے۔ یہ بھیجتے ہوں گے تو کہتے ہوں گے۔ یہ چِٹھی فلانے مہاجن کو دے آؤ۔ ان سے باتیں کرتے ہوں گے تو بھی چِٹھی ہی کا لفظ محاورہ میں آتا ہوگا۔ صاحب لوگ اردو اور ہندی کے محاورہ سے واقف نہ تھے۔ چِٹھی ہی کہتے رہے۔ آگے کے شہروں میں بڑھے۔ پھر بھی جو لفظ محاورہ میں آگیا تھا، اسی طرح رہا۔ یہاں تک کہ اب انگریزوں کے خطوط اور ہر انگریزی خط کو چِٹھی کہتے ہیں۔

بڑا دن۔ دسمبر کی 25 تاریخ کو بڑا دن کہتے ہیں۔ حالانکہ برس کا سب سے بڑا دن یہ نہیں۔ البتہ ۲۶ سے دن بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ لیکن محاورہ میں یہی نام ہو گیا۔ جب کہتے ہیں سب سمجھ جاتے ہیں۔ ایسے ایسے ہزاروں لفظ ہیں کہاں تک لکھوں۔

زبان کا جینا اور مرنا

زبان اپنے کمالِ جوانی اور زور زندگانی پر شمار کی جاتی ہے۔ جبکہ اُس کے ذخیرہ میں ہر علم، ہر فن کی تصنیفات ہوں اور ہر قسم کے حالات و مطالب کے ادا کرنے کے واسطے الفاظ و محاورات کے سامان حاضر ہوں۔ اس کا مضائقہ نہیں کہ الفاظ مذکورہ خاص اسی کے ملک کی آفرینش ہوں خواہ غیر ملکوں سے آئے ہوں۔ زبان کا استقلال اور آئندہ کی زندگی چار ستونوں کے استقلال پر منحصر ہے۔ (1) قوم کا ملکی استقلال۔ (2) سلطنت کا اقبال (3) اس کا مذہب (4) تعلیم و تہذیب۔ اگر یہ چاروں پاسبان پورے زوروں سے قائم ہیں تو زبان بھی زور پکڑتی جائے گی۔ ایک یا زیادہ جتنے کمزور ہوں گے اتنی ہی زبان ضعیف ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ مر جائے گی۔ مرنا اس کا یہی کہ خواص و عوام کی زبانیں اس کے بولنے سے اور قلم اس کے لکھنے سے منہ پھیر لیں، یعنی نہ کہیں بولی جائے، نہ اس میں تصنیف و تالیف کا رواج رہے۔

زبان کا انقلاب کُلّی اکثر انقلاب تاریخی سے ہوتا ہے۔ وہ طوفان اسے چاروں طرف سے تہ و بالا کر دیتا ہے اور اسی میں اکثر زبانیں فنا ہو جاتی ہیں۔ میں اس موقع پر یونان اور روما کی زبانوں کے مرنے کا ذکر نہ کروں گا۔ کیونکہ میں اور میرے ہم وطن ان کے حال سے بے خبر ہیں۔ انھی چند زبانوں کا حال سناتا ہوں، جنھیں سب جانتے ہیں۔

سنسکرت کی زندگی

(1) قوم گھر میں قائم ہے اور یہ شکر کا مقام ہے۔

(2) سلطنت کے اقبال کے ساتھ زبان کا اقبال رخصت ہوا۔ زبان کو کون سنبھالے۔ دیکھ لو تصنیف و تالیف اور زبان کی ترقی بند ہے۔

(3) مذہب فقط گھروں میں قائم ہے۔ زبان کو زور دیتا ہے مگر بہت کم۔

(4) قدیمی تعلیم۔ قومی تہذیب اور علوم و فنون بھی نہ رہے۔ پہلے صرف ضرورت ہائے وقت کے سبب سے مسلمانوں کی تعلیم و تہذیب پسند کرنی پڑی تھی۔ اب انگریزی ہے۔ دو نئے رنگوں نے (سلطنتِ مغلیہ و انگلشیہ) پُرانے رنگ کو مدھم کر دیا ہے ان سب باتوں پر نظر کر کے دیکھ لو زبان سنسکرت کا کیا حال ہے۔

فارس کی قدیمی زبان

(1) قوم آوارہ وطن ہو کر بدحال ہو گئی۔

(2) سلطنت نے اسے چھوڑ دیا (مصلحتِ وقت نے رائج الوقت فارسی اس کے منہ میں رکھ دی)۔

(3) مذہب فقط اتنا زبان کو سنبھالے رہا کہ مرنے جینے اور ریت رسوم کے کام میں آتی ہے۔ وہ بھی اَن پڑھ لوگ بے سمجھے الفاظ میں کچھ کا کچھ کہہ لیتے ہیں۔ سمجھتے اصلاً نہیں۔

(۴) تعلیم اور تہذیب اور علومِ قدیمہ سب مٹ گئے۔ اب زبان مذکور کی حالت کو دیکھ لو کہ کیا ہے۔ ژند۔ پاژند۔ پہلوی کو کوئی جانتا بھی نہیں۔

سنسکرت اور فارسی زبان کی فیلالوجیا

عزیزانِ وطن! فارسی اور سنسکرت کی قرابتِ قدیم کا سلسلہ آج گروہ گروہ مخلوقاتِ الفاظ کو آپ کے سامنے حاضر کرتا ہے جن کے قیافے اور شکل و شباہت ان کے اتحادِ نسل پر شہادت دیں گے۔ پہلے اتنی بات اور بھی سن لو کہ یورپ میں فلسفۂ زبان کے ماہروں نے بہت سی زبانوں کو پڑھا اور ہر زبان میں حرفوں کی ترکیب، لفظوں کے جوڑ بند اور عبارتوں کے انداز پر خیال کر کے کل زبانوں کو تین حلقوں میں انتظام دیا ہے۔ ہر حلقہ میں کئی کئی شاخیں لگائیں۔ نکتہ اس میں یہ ہے کہ جو ایک نسل کی زبانیں ہیں، ان کے الفاظ کی نسل ایک ہی حلقہ میں ملے گی۔ دوسرے حلقہ میں نہ جا ملے گی۔ اس تقسیم نے بڑی آسانی کر دی کہ الفاظ کے سراغ لگانے والے کو اپنی سوئی جنگل جنگل میں ڈھونڈنی نہ پڑی اور ظاہر ہے کہ جنگل کی نسبت کسی چیز کو ایک محلہ میں ڈھونڈنا اتنا دشوار نہیں۔

تینوں حلقوں کی تفصیل یہ ہے:

(1) ایرین۔ اس کی شاخیں ہندستانی، ایرانی، یونانی، لاطینی، فرنچ، جرمن، روسی وغیرہ وغیرہ۔

(2) شیمیٹک۔ اس کی شاخیں عربی، عبرانی، کلدانی وغیرہ وغیرہ۔

(3) تیورنین۔ اس کی شاخیں متفرقات۔ جن میں بہت سی بے قاعدہ اور بے علم زبانیں شامل ہیں۔ مثلاً تاتار، سیام، برما، کمبجا، پیگو وغیرہ کی زبانیں۔

اب غرض اصلی پر آتا ہوں اور اسے دو فصلوں میں تقسیم کرتا ہوں :

(1) جب دو زبانیں ہمارے سامنے پیش ہوں تو ان کی نسل اور خاندانوں کی اصل پہچاننے کے کیا اصول ہیں۔ یعنی ہم ان کے رنگ و روپ اور خط و خال کو کس نظر سے دیکھیں، جس سے پہچان لیں کہ دونوں کی اصل نسل ایک ہے یا نہیں ہے اور سنسکرت اور فارسی بہنیں ان قیافوں سے ایک گھرانے کی اولاد معلوم ہوتی ہیں یا نہیں۔

(2) ان دونوں کے الفاظ جو مشابہ ہیں۔ ان میں تغیر و تبدّل کن اصول کے بموجب ہوئے ہیں۔

آغازِ مقصد

عزیزانِ وطن! گزشتہ لکچر میں سن چکے ہو کہ جب ایک ملک کی اجناس و اشیا دوسرے ملک میں آتی ہیں تو اپنے نام ساتھ لاتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رستہ میں سے نئے نام لیتی آتی ہیں۔ کبھی یہاں آکر نیا نام پاتی ہیں۔ اس طرح ہر ملک میں اکثر اشیا کے لیے الگ الگ نام ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر چیزیں لازمی اور ناگزیر ہوتی ہیں جن کے برتنے اور نام لینے سے کسی وقت بلکہ ابتدائے آفرینش اور شروع انسانیت میں بھی کسی کو چارہ نہ تھا۔ ہاں جبکہ جماعت مذکور کی جمعیت پھیلی ہوگی تو جہاں جہاں لوگ پھیل گئے ہوں گے، اشیائے مذکورہ کو اپنے ناموں سمیت ساتھ لے گئے ہوں گے۔ پس جن دو زبانوں میں ایسی چیزیں یا کاموں کے نام بعینہٖ یا کچھ تغیر کے ساتھ ایک ہوں تو جان لو کہ یہ دونوں قومیں ضرور کسی وقت ایک گھرانے اور ایک گھر کی رہنے والی تھیں۔ اور اسی سراغ پر چلو گے تو اور بہت سے لفظ نکل آئیں گے۔ جن سے امر مذکور کی تصدیق ہوگی، یہ سراغ کئی شاخوں میں چل کر منزل آگاہی پر پہنچتے ہیں۔

(1) نہایت قریبی رشتہ داروں کے نام ہیں جن سے کوئی گھر بلکہ اولادِ آدم کی نسل خالی نہیں رہ سکتی۔ اگر دو زبانوں میں یہ ایک ہی ہیں تو جان لو کہ بولنے والوں کی اصل بھی ایک ہی تھی۔

نام اقربا	فارسی	سنسکرت	
باپ	پدر۔باپ	पितृ	پتری
ماں	مادر۔مام	मातृ	ماتری
بھائی	برادر	भ्रातृ	بھراتری
بہن	خواہر	श्वसृ	سْوسری
بیٹا	پور	पुत्र	پُتّر
بیٹی	دختر	दुहितृ	دُہتری
داماد	داماد	जामाता	جاماتا
سُسُر	خُسر[1]	श्वसर	سْوسُر

(2) اعضائے بدن بھی انسان سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔ جن دو زبانوں کے اتحادِ اصل کی بابت تحقیق مدِ نظر ہو۔ ان میں اعضا کے ناموں کو دیکھو۔ اگر دونوں زبانوں میں ایک ہی نام ہے تو جانو کہ دونوں کے بزرگ ضرور کسی وقت میں ایک جگہ رہتے تھے۔

فارسی	سنسکرت		فارسی	سنسکرت	
سر	शिर	شِر	زبان	जिव्हा	جوہا
تارُک	तालुक	تالُک	گلو	गल	گل۔گوگو
چشم	चक्षु	چکشو	گرے۔گردن	ग्रीवा	گریوا
اَبرُو	भ्रु	اُبھرو	بازو(یاباہو)	बाहु	باہو
دند	दन्त	دنت	دوش	दोशन	دوشن
دست	हस्त	ہست[2]	سُرین	श्रौनि	شرونی

---

1 دیکھو۔ فصل خ اور اس کے مبادلے۔ 2 خان آرزو اور ٹیک چند بہار دو محقق ہمارے کہتے ہیں کہ 'اس' بمعنی فرسودن ہے۔ تین حرف نسبت۔ آستین پہونچے کو کہا جاتا ہے۔ اس لیے اس نے یہ نام پایا۔ بندۂ آزاد کہتا ہے کہ دست۔ ہست۔ ہست سے است۔ پھر استی۔ پھر آستی۔ پھر آستین ہو گیا۔ مثال کے طور پر، دیکھو۔ ذستا زبان ژند میں بمعنی دست ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ ژند کی ذ جب سر لفظ پر ہو تو فارسی میں د پڑھی جاتی ہے۔ اس لیے دال سین کے ساتھ ہو کر ہوئی ہو اور سنسکرت میں ہست ہو گیا ہو اور تے اپنی اصل پر رہا۔

مُشت	मुष्टिक	مُشٹِک	زانو	जानु	جانو
اَنگشت	अंगुष्ट	اَنگشٹ	پاے	पाव	پاؤ
پُشت	पृष्ट	پرِیشٹ	استہ ہستہ	अस्ति	استھی
کَش	कुशि	کُکشی (کوکھ)	خون	शोनड	شونڑ
ناف	नाभी	نابھی			

(3) قدرتی اشیا کہ ہر جگہ موجود ہیں اور ابتدائے آفرینش سے اخیر تک دُنیا ان سے خالی نہ ہوگی۔ ان کے ناموں کو بھی دیکھو۔ اگر وہ ایک ہیں یا قریب قریب ہیں تو جان لو کہ اس نسل کی اصل ایک تھی۔

خدا۔ سنسکرت میں स्वधाता سُودھاتا

زمین۔ سنسکرت میں पमा جماہ (دیکھو صفحہ 70)

سورج۔ فارسی میں ہور سنسکرت میں सूर्य سوریہ۔ (دیکھو صفحہ 87.64)

چاند۔ ماہ मास ماس۔

تارا فارسی ہے۔ وہی سنسکرت میں تارا तारा ہے۔

روز سنسکرت میں روج रोज اور روجری रोजरी روشنی ہے۔

رات فارسی میں شب ہے۔ سنسکرت میں शपा شپا ہے۔

شام سنسکرت میں شائم सांय شام کو کہتے ہیں۔

باد فارسی ہے۔ سنسکرت वात وات ہے۔

ہوا فارسی ہے۔ سنسکرت वायु وایو ہے

گرمی۔ سنسکرت میں گریشم ग्रीष्म ہے یا گریکھم اور گرم گھام घाम ہے۔

کیا عجب ہے کہ سنسکرت میں دو معنوں کے لیے جدا جدا لفظ رہے۔ فارسی میں گرم سے گرمی نکال لی۔ موسم کے لیے لفظ ہو گا وہ گم ہو گیا۔

سرد۔ سنسکرت میں شرد शरद یا शरत شرت ہے۔ تعجب یہ ہے کہ عربی میں شِتا بمعنی سرما ہے۔ شاید اس میں پہلوی کا شمول ہو۔

(4) جو اجناس کہ انسان کے لوازمات ضروری سے ہیں اور کوئی آبادی ان کی

ضرورت سے خالی نہیں ان کے ناموں کو دیکھو۔ اگر اس قسم کی چیزوں کو دونوں زبانوں میں ایک ہی نام سے پکارتے ہیں تو جان لو کہ دونوں کے بولنے والے کسی زمانے میں ایک گھر کے رہنے والے تھے۔

آتش۔ فارسی हुताशन ہتاشن

دود۔ 〃 धूम دھوم۔ دھواں

آب۔ 〃 अप آپ

آہار۔ 〃 आहार اہار۔ خوراک (دیکھو صفحہ 57)

استا۔ 〃 अशत اشت (دیکھو صفحہ 57)

گراس۔ 〃 ग्रास گراس

گندم۔ 〃 गोधूम گودھوم

جَو۔ 〃 यव یَو

ماش۔ 〃 माष ماش۔ ہندستان میں جسے مونگ کہتے ہیں۔ ایران میں ماش کہتے ہیں اور ماش کو ماشِ سیاہ کہتے ہیں۔

برنج۔ 〃 ब्रीही بریہی۔ اور بیہی بھی کہتے ہیں۔

شالی۔ 〃 शाली شالی

شیر۔ 〃 क्षीर کھشیر۔ دود

ماست۔ 〃 मस्तु مستو

کرپاس۔ 〃 करपास کرپاس۔ روئی اور سوت کو بھی کہتے ہیں۔

تار۔ 〃 तान تان۔ دیکھو۔ تنیدن سے مشتق ہے۔

پود۔ 〃 ब्यूति بیوتی

گرم سوت 〃 गर्भसूत گربھ سُوت

خُم۔ 〃 कुम्भ کُمبھ

پیالہ۔ 〃 पीना پینا۔ پیالنا۔ چونکہ پینے سے مشتق ہے اس لیے یقین ہے کہ فارسی میں بھی کوئی مصدر اسی مآخذ کا ہوگا۔ اب مر گیا اور جب بات کو یہاں تک گنجائش ہوئی تو کہہ سکتے ہیں کہ عہدِ قدیم میں پانی بھی فارسی میں ضرور ہوگا۔ ورنہ کیا سبب ہے 900 برس

سے زیادہ گزرے۔ حکیم سنائی جو کبھی خراسان سے ہند میں نہیں آئے ایک قصیدہ میں کہتے ہیں :

نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی　　نہ دراں معدہ جز حسد زندہ

پیمانہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت پرمان प्रमाण

چرم۔ فارسی ہے۔ سنسکرت چرم चरम یعنی چمڑا ہے۔

دار۔ فارسی میں درخت اور اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جس سے چھت چھائیں۔ سنسکرت میں دار दार اور دارو दारू لکڑی کو کہتے ہیں۔ اسی سے ہے دار چینی۔

در فارسی ہے۔ سنسکرت میں دوارہ اور خانہ کو खशा کھشان کہتے ہیں۔

پوزہ۔ فارسی۔ بوز پھل کو کہتے ہیں۔

شاخ۔ शाखा شاکھا۔

تعجب یہ ہے کہ درخت دیودار देवदार فارسی میں بھی دیودار ہے اور عرب نے شجر الجن ترجمہ کیا۔

دور۔ سنسکرت میں दूर ہے۔ ضد نزدیک۔

نزد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں نیند नींद ہے۔

دیر۔ ضد زود۔ سنسکرت میں धीर دھیر ہے۔

راست۔ یعنی سیدھا۔ سنسکرت میں ऋजु رجو

سفید۔ श्वेत سبیت

سیاہ۔ श्याम شیام

سنگم اور سنگار۔ فارسی میں رفیق اور ہمراہی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سنگم सगम ہمراہی اور رفاقت ہے۔

سنگ۔ فارسی میں پتھر کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شان शाणा کہتے ہیں۔

(5) جانوروں کے نام جن سے کسی زمانہ میں آبادی خالی نہیں ہوتی۔ انھیں بھی دیکھو :

فارسی		سنسکرت	فارسی		سنسکرت
مرد	मरतप	مرتپ	خر	खर	کھر
زن	जनी	جنی	اشتر	उष्ट्र	اشٹر

نر	नर	نر

فارسی میں نر کے مقابلہ پر مادہ کو رکھ دیا۔ ناری خدا جانے کیا ہو گئی۔ غالباً کچھ لفظ اسی مادہ سے ہو گا۔

کپی بندر دیکھو صفحہ 40

گاؤ	गो	گو
میش	महिष	مھش
اسپ	अश्व	اَشْو
میش۔ بھیڑ	मेष	میش
سگ	शुनक	شُنک
شغال	श्रृगाल	سری گال
خوک	शूक	شوکر
موش	मूशक	موشک
مگس	मक्षिका	مکھشیکا
کلاغ	काक	کاک
چتوک چغوک	चटिका	چٹکا

(6) کوئی قوم اور اس کی کوئی حالت ایسی نہیں جس میں اُسے گننے کی حاجت نہ ہوتی ہو۔ اس واسطے جن دو زبانوں کا اتحاد دریافت کرنا ہو، اُن کے شمار اعداد کو بھی دیکھو۔ کم سے کم ایک سے دس تک اور دہاکے اور صدی اور ہزار ضرور ملتے ہوں گے۔

فارسی	سنسکرت	
یک	एक	ایک
دو	द्वि	دُئی
سہ	त्रि	تری
چہار۔ چار	चतुर	چتر
پنج	पज	پنچ
شش	षष्ट	شٹ
ہفت	सप्त	سپت
ہشت	अष्टन	اشٹن
نہ	नव	نو
دہ	दश	دش

فارسی	سنسکرت	
بیست	विशति	وِنشتی
سی	त्रिशति	ترنشتی
چہل	चत्वारिंशति	چتوارنشتی
پنجاہ	पजाशित	پنجاشت
شصت	षष्टी	ششٹی
ہفتاد	सप्तति	سپتتی
ہشتاد	अष्टी	اشیتی
نود	नवती	نوتی
صد۔ ست[1]	शत	شت
ہزار	शहस्त्र	سہسر

1 اسی سے ہے دویست یعنی دو صد

عزیزانِ وطن! ان دو زبانوں میں مدّت دراز سے بے حد مسافت پڑ گئی ہے۔ مگر گنتی کو دیکھو، کتنی قریب ہے۔ قرابت میں اور کیا ہوتا ہے؟ باوجود اس کے 3 اور سہ کے عدد میں جو اختلاف ہے کانٹا سا کھٹکتا تھا۔ ایک دن برہان قاطع میں نظر پڑا کہ پہلوی میں 300 کو تیرست کہتے ہیں۔ دل اس سراغ پر آگے بڑھا۔ معلوم ہوا کہ زبانِ ژند میں 3 کو ترایو کہتے تھے۔ حرف اوّل اس کا ایسی آواز دیتا ہے۔ جو ت تھ یا س کے بیچ میں ہے۔ جیسے عربی میں ثَ۔ اِس کا مبدل اور مخفف ترا ہوا اور ست ژند وہی صد ہے جو سنسکرت میں شَتَ ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلوی میں 3 کو سہ کہتے ہیں اور س لکھتے ہیں۔ وہ بھی مخفف و مبدل ترایو کا ہے۔ کیونکہ حرف مذکور س کی بھی آواز دیتا ہے۔ تخت جمشید کی پُرانی کتابوں میں ایک جگہ ہے اتھنگینا یعنی اسنگینا اور جس سواری کو سنسکرت میں رتھ रथ کہتے ہیں۔ ژند میں رث اور پہلوی میں رس کہتے اور لکھتے تھے۔ پس برہان قاطع میں جو تیرست کو پہلوی لکھا ہے یہ غلطی ہے ژند لکھنا چاہیے تھا۔

اعداد فاعلی بھی دیکھو دونوں زبانوں میں کتنے مطابق ہیں :

فارسی		سنسکرت	فارسی		سنسکرت
یکم	پرتھم	प्रथम	بستم	بشتم	बिंशतम्
دوم	دویت	द्वितीय	سی ام	ترشتم	त्रिशतम्
سہ ام	ترتپ	त्रितीय	چہلم		चत्वारिंशतम्
چہارم	چترتھ	चतुर्थ	پنجاہم		पजीशितम्
پنجم	پنچم	पचम्	شصتم		षषृितम्
ششم	ششتم	षष्टी	ہفتادم		सप्तितम्
ہفتم	سپتم	सप्तम्	ہشتادم		अष्टीम्
ہشتم	اشتم	अष्टम्	نودم	نوات	नवत
نہم	نووم	नवम्	صدم	شتم	शितम्
دہم	دشم	दशम्			

جب تم دیکھتے ہو کہ اشیائے مذکورہ کے لیے دونوں زبانوں میں ایک ہی نام ہیں تو دل

تصدیق کرتا ہے کہ دونوں کے صاحبِ زبان بھی ضرور ایک ہوں گے۔ انھی سراغوں پر چل کر لغت کی کتابوں میں داخل ہو۔ تب پُرانے لفظ قدم بقدم آگے رستہ بتائیں گے۔ اس اندھیرے میں کبھی تاریخ کا چراغ، کبھی جغرافیہ کی لاٹھی لے کر چلو گے تو کتب مذکورہ میں حالاتِ قدیمہ کا گورستان نظر آئے گا۔ پھر وہ خرابے آنکھوں میں پھر جائیں گے، جہاں معلوم ہو گا کہ دونوں قوموں کے باپ دادا ایک زمانہ میں یہیں رہتے سہتے، کھاتے پیتے، سوتے بیٹھتے تھے اور اسی ایک بولی میں باتیں کر کے زندگی بسر کر گئے۔

اب میں مبادلہ کے قواعد شروع کرتا ہوں۔ لیکن اس میں چند باتوں کا خیال رکھو۔ یعنی اتحاد الفاظ کئی قسم کا ہے۔

اوّل اتحاد ابتدائی یعنی جب حضرت آدمؑ نے روئے زمین پر بود و باش شروع کی ہو گی اور اولاد کا سلسلہ جاری ہوا ہو گا تو وہ سب ایک جگہ رہتے ہوں گے۔ اسی واسطے سب ایک بولی میں بات چیت کرتے ہوں گے اور اسی بنیاد پر سب کی ایک زبان ہو گی۔ کچھ مدّت کے بعد آبادی کی بہتات اور جگہ کی کوتاہی سے اطرافِ عالم میں پھیلے ہوں گے۔ مقامات کے اختلاف سے ضرورتیں بھی بدلی ہوں گی۔ حالتوں کے اختلاف نے نئی چیزیں اور نئے کام پیدا کیے ہوں گے۔ ان کے لیے کچھ نئے لفظ پیدا ہوئے ہوں گے۔ کچھ پہلے لفظوں میں تبدیلیاں ہوئی ہوں گی۔ رفتہ رفتہ زبانوں میں یہ اختلاف پیدا ہوا ہو گا، جو آج دیکھ رہے ہو۔ بہت سے الفاظ اُول بدل گئے بہت سے نئے بن گئے ہوں گے۔ صرف بعض الفاظ مشترک رہ گئے۔ اُن کا کوئی خیال نہیں کرتا۔

(دیکھو صفحہ 40)

دوم۔ اتحاد وسطی کہ ایک قوم کے لوگ وطن سے نکل کر پھیلے۔ کچھ کہیں جا بسے کچھ کہیں۔ کئی سو بلکہ کئی ہزار برس کے بعد دونوں کی زبانوں کو دیکھتے ہیں تو پہچانی نہیں جاتیں۔ پھر بھی جب الفاظ و لغات کا پرکھنے والا غور کرتا ہے تو تاڑ جاتا ہے کہ ایک کان کے نگینے ہیں۔ ڈول ڈھنگ، رنگ سنگ بدل گئے ہیں۔ یہ ایسے جیسے ایک آریہ سے فارسی اور سنسکرت۔ انگریزی۔ فرنچ۔ یونانی۔ جرمنی وغیرہ نکلیں۔ اور اُن میں الفاظ مختلفہ ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ ان سب کی اصل کو آریہ سمجھنا چاہیے۔

سوم۔ دو غیر قوموں کے اشخاص نے دنیاوی اتفاقات کے ذریعوں سے آمد و رفت پیدا کی اور آپس میں مل کر رہنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے ضروریاتِ زندگی کی چیزیں حاصل

کیں۔ ایک ملک کی چیزیں دوسری جگہ جانے لگیں۔ کاروبار، اوصاف، صنائع بدائع میں الفاظ بھی خلط ملط ہو گئے۔ تم دیکھتے نہیں! عربی نے فارسی کو کتنے الفاظ دیے۔ پھر عربی فارسی نے ہندی کو کیا کچھ دیا؟ اور فارسی نے خود آکر ہندی سے کیا کچھ لیا؟ پھر انگریزی نے عرب سے کتنے الفاظ و مطالب لیے۔ اب اُردو کو کیا دے رہی ہے اور کیا کیا اُس سے لے رہی ہے۔ عرب اور فارس کی طرف دیکھو! یورپ کی زبانیں وہاں کیا دستکاری کر رہی ہیں۔ مجھے اس مقام پر نمبر اوّل سے بحث نہیں، کیونکہ پُرانی ہڈیوں کے اکھیڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ نمبر سوم سے بھی بحث نہ کروں گا۔ جو آنکھوں کے سامنے باتیں ہیں، اُن کی فہرست بنانے سے کیا حاصل۔ البتہ نمبر دوم تحقیق کا مقام ہے کہ ہمارے تمھارے بزرگوں کی زبانیں ہیں۔ انھیں بڑی غور سے دیکھنا چاہیے کہ سنسکرت اور فارسی کے لفظ جو اصل میں متحد ہیں۔ اُن میں تبدیلیاں کن اصول کے بموجب ہوئی ہیں۔ اُنھیں دیکھ کر تمھاری زبان کو ایسا ملکہ ہو جائے گا کہ جہاں اس طرح کا لفظ پاؤ گے حرفوں کو اُلٹ پلٹ کر فوراً معلوم کر لو گے کہ اصل دونوں کی ایک ہے۔

اب دیکھیے! یہ اتحادِ اصلیت 7 رنگ میں ظاہر ہوتا ہے :

(1) لفظ اور معنی کسی میں تغیر نہیں آتا۔ مثلاً **کُلال** कुलाल فارسی میں بھی کمہار کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھی कलाल ہے۔

کپی فارسی میں بھی بندر کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھی कपि ہے۔

شالی शाली دھان دونوں جگہ یکساں ہیں۔

جنگل فارسی میں بھی بمعنی صحرا مستعمل ہے۔ سنسکرت میں بھی जंगल ہے۔

شال دونوں جگہ یکساں ہے۔

آہار فارسی میں خوراک ہے۔ سنسکرت میں بھی आहार ہے۔

موری۔ یعنی پانی کا نکاس دونوں گھروں میں ایک ہے۔

نام नाम دونوں جگہ ایک ہے۔

نیل नील دونوں زبانوں میں ایک ہی رنگ ہے۔

نو नव (نیا) دونوں جگہ برابر ہے۔

نیک नीक دونوں زبانوں میں اچھا ہے۔

گراس یعنی نوالہ دونوں زبانوں پر ایک ہی مزا دیتا ہے۔

جال जाल دونوں زبانوں میں ایک ہی معنوں کو شکار کرتا ہے۔

(2) حرکت یا حرکتیں تبدیل ہوتی ہیں۔ مثلاً :

وَدْ۔ فارسی میں حکیم عاقل و دانشمند کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں وِدْ वैद بمعنی دانستن ہے۔

ہَلاہل فارسی میں اور ہلاہل हलाहल سنسکرت میں زہر قاتل ہے۔

مِہر فارسی میں اور مِہر मिहिर سنسکرت میں آفتاب کا نام ہے۔

(3) ایک حرف یا کئی حروف میں تغیر ہوتا ہے۔ مثلاً :

ماہ۔ فارسی میں چاند کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ماس मास ہے۔

دہ۔ فارسی میں 10 ہے۔ سنسکرت میں दश دش ہے۔

پاے۔ پاؤ पाव پاؤ ہے۔

(4) لفظوں میں کچھ تغیر نہیں ہوتا۔ معنوں میں فرق آجاتا ہے۔

بالا۔ فارسی میں بالا نیچے کے مقابل ہے اور قد و قامت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بالا बाला اس لڑکی کو کہتے ہیں، جو جوانی کی اٹھان میں ہو۔

نر۔ فارسی میں مقابل مادہ ہے۔ سنسکرت میں نر नर مرد۔ ناری नारी عورت ہے۔ خدا جانے کہ اصل میں عام تھا، ہند میں رہ کر خاص ہو گیا۔ یا اصل میں خاص تھا، فارس میں جا کر انسان و حیوان کے لیے عام ہو گیا۔

کام۔ فارسی میں مقصد و مطلب ہے۔ سنسکرت میں خاص مطلب نفسانی کو کام काम کہتے ہیں۔

دیو۔ سنسکرت میں देव روح پاک ہے۔ فارس میں بھی عہد قدیم میں روح پاک کو کہتے تھے۔ جب زرتشت نے مذہب میں فرق ڈالا تو اہل شیطان کو دیو کہنے لگے۔

آرام۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں आराम عیش باغ کو کہتے ہیں۔ اسی سے ہے باغِ ارم۔

بَنْ۔ فارسی میں باغ یا زراعت کو کہتے ہیں اور اُس کے کارندہ کو بنوان کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بن वन ایسے جنگل کو کہتے ہیں جہاں تمام درخت چھائے ہوں اور قدرت نے پھلے پھولے درخت لگائے ہوں۔

گنج۔ فارسی میں خزانہ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں गंज زر کثیر ہے۔

بال۔ فارسی میں پرندوں کے پروں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں बाल آدمی اور چرندوں کے

بالوں کو کہتے ہیں۔

روم۔ فارسی میں آدمی کے بالوں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں روم रोम या لوم लोम آدمی کے بدن کے رونگٹوں کو کہتے ہیں۔

مایہ۔فارسی میں اصل شے کو کہتے ہیں۔ جس پر افزائش اور کامیابی واقع ہو سکے۔ سنسکرت میں مایا माया اُس چیز کو کہتے ہیں جس سے نیست۔ ہست ہو اور نابود موجود ہو جائے۔ اسی لحاظ سے قدرتِ الٰہی کو کہتے ہیں اور ہیولیٰ یعنی مادّہ کو بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اسی سے دنیا موجود ہوئی ہے۔

(5) لفظوں میں کچھ تغیر نہیں ہوتا۔ معنوں میں فرق آجاتا ہے۔ مثلاً :

سُمَن۔ فارسی میں ایک خاص پھول کا نام ہے۔ سنسکرت سُمَن सुमन عموماً پھول کو کہتے ہیں۔

آش۔ فارسی میں اس کھانے کو کہتے ہیں جو پینے میں آئے۔ کتب لغت میں مطلق طعام کو بھی لکھا ہے۔ مگر آشامیدن سے مشتق کہا ہے۔ سنسکرت میں آش आश کھانا ہے۔

دام۔ فارسی میں جال کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دام दाम رسّی کو کہتے ہیں۔

(6) فقط جوہر لفظ میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا ہے۔ معنوں میں کچھ فرق نہیں آتا۔ مثلاً :

یک۔ فارسی میں ۱ ہے۔ سنسکرت میں ایک एक ہے۔

مہ۔ فارسی میں بڑے اور بزرگ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں مہا महा ہے۔

پُور۔ فارسی میں بیٹا ہے۔ سنسکرت میں پُتر पुत्र ہے۔

انگارہ۔ فارسی میں آگ کا دہکتا ڈلا ہے۔ سنسکرت میں अंगार ہے۔

(7) کمی بیشی کچھ نہ ہو۔ فقط کیفیتِ حروف میں فرق ہوتا ہے۔ مثلاً :

اُشتر۔ فارسی میں اُونٹ ہے۔ سنسکرت میں اشٹر उष्ट्र اونٹ کو کہتے ہیں۔

مُشت۔ فارسی میں مٹھی ہے۔ سنسکرت میں مُشٹ मुष्ट وہی مٹھی ہے۔

(8) کبھی مبادلہ کے ساتھ حرفوں کا پس و پیش ہوتا ہے۔ مثلاً فارسی کا چرخ چخ ہو کر چکر चक ہو گیا۔

(9) اختلافات مذکورہ میں سے کئی اختلاف ہوتے ہیں اور ساتھ ان کے معنوں میں بھی فرق آجاتا ہے :

آستان۔ فارسی میں گھر کی دہلیز ہے۔ ستان کثرت ظرفی کے لیے آتا ہے۔ مثلاً : گلستاں۔ بوستاں۔ کوہستاں۔ سنسکرت میں ستھان स्थान عموماً جگہ کو کہتے ہیں۔

شنا۔ فارسی میں تیرنے کو کہتے ہیں سنسکرت میں سنان स्नान نہانا ہے اور ظاہر ہے کہ بے نہانے کے تیرنا کب ہو سکتا ہے۔

کف۔ فارسی میں مشہور لفظ ہے۔ سنسکرت میں کھ कफ ایک خلط بدن ہے کہ اصل میں کف ہوتا ہے۔

بستر۔ فارسی میں بچھونا ہے۔ سنسکرت میں بسترت विस्त्रित بچھا ہوا ہے۔

بندہ۔ فارسی میں غلام کو کہتے ہیں۔ کیونکہ بند بمعنی قید ہے۔ یہ بھی قید حکم، قید اطاعت یا قید وفا میں ہوتا ہے اور سب سے بڑی قید اطاعت اور قید وفا خدا کی ماننی چاہیے۔ اس لیے بندۂ خدا ہوا۔ اسی سے بندگی بمعنی اطاعت اور عبادت ہوئی اور سنسکرت میں وِند विन्द بمعنی سلام اور عجز و نیاز ہے۔ چنانچہ شاگرد جب استاد کے سامنے جاتا ہے۔ وِند جگت گروں विन्द जगत गुरू اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل دونوں کی ایک ہے۔

آرام بَن ؟۔ فارسی میں اُس باغ کو کہتے ہیں جو آبادی میں ہو۔ سنسکرت میں آرام۔ عیش باغ کو کہتے ہیں اور فارسی میں بن ایسے باغ کو کہتے ہیں، جو شہر کے باہر ہو۔ اور کھیتوں اور زراعت کو بھی کہتے ہیں۔

(10) احتیاط۔ ایک قسم کے اتحاد کا پرکھنا بڑے غور کا کام ہے۔ اس کی مثالوں کو سن کر اہلِ نظر ہشیار ہو جائیں گے اور سمجھیں گے کہ جب تک دو زبانوں میں پوری مہارت نہ ہو۔ دو لفظوں میں اتحادِ اصلیت پر حکم لگانا خطرناک امر ہے۔ تم دیکھو گے کہ دو زبانوں کے بعض لفظوں میں حروف و حرکات کا اتفاقی اتفاق ہوتا ہے اور حقیقت میں ایک دوسرے سے اصلاً تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً :

جاروب فارسی میں مشہور لفظ ہے۔ جا۔ روب۔ اہل فارس تخفیف دے کر جارو بھی کہتے ہیں۔ ہندی میں جھاڑو ایک مستقل لفظ ہے کہ اسم فاعل کا صیغہ ہے اور جھاڑنا اس کا مصدر ہے۔ ناواقف سمجھتے ہیں کہ جھاڑو۔ جارو دونوں ایک ہیں۔

جناب۔ عربی کا ایک لفظ ہے جس اس کا مآخذ ہے۔ شمٹک کے دائرہ میں سے ہے۔ ایرین سے کچھ تعلق نہیں۔ سنسکرت میں जनाव انھی معنوں میں مستعمل ہے اور تعظیمی موقع پر بولا جاتا ہے۔ لیکن وہ حقیقت میں مرکب ہے جن जन آدمی اور اَوْ आव رکھیا کرنے والا اور۔ آپت आपत سچّا۔ معتبر۔ پرورندہ اور لائق بھی ہے۔ اسی واسطے جناب۔ جن۔ آپت۔ ناواقف آدمی

دونوں کو ایک سمجھے گا اور جو دونوں زبانوں کی اصلوں سے واقف ہو گا۔ وہ اس پر ہنسے گا۔

انتقال۔ عربی لفظ ہے۔ اس کا مآخذ نقل ہے۔ معنی ہیں نقلِ مکان۔ مجازاً مرنے کو بھی کہتے ہیں۔ بعض ناواقفوں سے میں نے خود سنا۔ کہتے ہیں انت अन्त انتہا۔ یا موت۔ کال काल وقت۔ یعنی وقتِ اخیر۔ یا وقتِ موت اور اس لیے کہتے ہیں کہ انت کال اور انتقال ایک ہی ہیں۔

اختیار۔ عربی لفظ ہے۔ خیر۔ خیار اس کا مآخذ ہے۔ فارسی میں آکر اس نے اور معنی پیدا کر لیے۔ اتفاق ہے کہ ان معنوں میں زبان سنسکرت میں ادھی کار अधिकार اُور ہی لفظ ہے۔ ناواقف کہتے ہیں کہ دونوں ایک ہیں۔

انتہا۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ جو لوگ کہتے ہیں۔ انتہا کا شوق پیدا ہوا اور انتہا کی خوشی ہوئی۔ یہ اصل میں سنسکرت سے نکلا ہے۔ انت अन्त تہاہ थाह یا اِن۔ تہاہ۔ وہ گھر اور یا جس کی تہ نہ ملے۔ اسے کیا معلوم کہ یہ عربی لفظ ہے۔ اس کا مآخذ نہایت ہے اور اس میں نفی کا کچھ تعلق نہیں۔

اپنا تجربہ۔ ایک دفعہ جوانی کی ہمت اور شوقِ سیاحت مل کر مجھے ترکستان کے ملک میں لے گئی۔ بلخ سے چند منزل آگے بڑھ کر ہمارا قافلہ اترا۔ اُن ملکوں کے لوگ کم علم، کم معلومات ہوتے ہیں۔ اپنی آرام طلبی اور رستوں کی دشواری انھیں ادھر کے سفر میں سدِّ راہ ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارے ملک کے آدمیوں کے ساتھ شوق سے ملتے ہیں اور ذرا ذرا سی بات معلوم کر کے خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ گاؤں کے لوگ آکر قافلہ میں پھرنے لگے۔ دستور ہے کہ اہلِ آبادی، روٹیاں، گھی، دودھ، دہی، انڈے، گوشت، مرغیاں، قالین (اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے) لاتے ہیں۔ قافلہ والے قیمت میں کپڑا، سوئیاں، رانگ، پیتل کی انگوٹھیاں، جگنیاں، کانچ اور شیشہ کے دانے دے کر خریدتے ہیں۔ ایک ترک بچہ طالبِ علم میرے بستر کے پاس آبیٹھا۔ دو تنگے[1] میرے ہاتھ میں تھے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے اُس نے پوچھا۔ در ملک شما ہمیں تنگہ رواج دارد۔ ایک افغان کا بستر برابر تھا۔ وہ بولا کہ در ہند روپیہ کلدار است فرنگی بر اں تصویر خود را نقش میکند۔ طالبِ علم نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ چہ طور؟ میں نے کہا راست ہے[2]

---

1 تنگہ۔ ترکستان بخارا میں چاندی کا سکہ ہوتا ہے /5 سے کچھ زیادہ۔

2 افغان کا مطلب یہ تھا کہ تصویر کے ذکر سے ہماری بت پرستی ثابت کرے اور ترک بچہ کے خیالات اسلامی کو چمکا دے۔

بگوید۔ روپیہ ہندسہ برابر تنگہ شاست۔ اُس نے پوچھا۔ تصویر چرا نقش میکند؟ میں نے کہا۔ سکۂ سلطنت است۔ در دور دائرہ نام و میانہ اش تصویر شاہ است۔ آں ہم تمام نیست۔ کلۂ اش را نقش میکنند۔ ترک بچہ بولا۔ آرے ہمیں سبب روپیہ را کلہ دار نام کردہ باشند۔ کلدار کو کلۂ دار کا مخفف سمجھا۔ خوب سمجھا۔ مگر غلط سمجھا۔

ایک دن میں کوکان میں چند اشخاص کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ ایک بڈھے فرتوت نے پوچھا کہ در ملک شما فرنگی سلطنت مے کند؟ میں نے کہا۔ بلے۔ اس نے کہا۔ او چہ نام دارد؟ میں نے کہا۔ بادشاہ در ملک فرنگ بپایہ تخت خود است۔ برائے ما نائبے فرستادہ است۔ او حکم میراند۔ بادشاہِ ما ہمانست۔ پوچھا۔ آخر او چہ نام دارد؟ میں نے کہا۔ بعد ہر چند سالے عوض میشود۔ البتہ باعتبارِ عہدہ و منصب آنرا لات میگویند۔ ایک بولا گوبرناس[1] باشد (یعنی گورنر) میں نے کہا۔ بلے۔ ہمچنیں۔ ایک اور ترک نے کہا۔ لات چہ معنی دارد؟ میں نے تامل کیا کہ کیا کہوں۔ دوسرا بولا۔ ہماں لات و منات است۔ دوسرا بولا۔ نے! فرنگ بت پرست نیست۔ بڈھے ازبک نے کہا۔ آخر کافر است۔ کفر بہر جا یکیست۔ لات شاں ہماں لات و منات باشد۔

اب تم غور سے خیال کرو۔ ہندوستان میں جو انگریزی روپیہ کے لیے **کلدار** کا لفظ پیدا ہوا۔ یہ بھی ایک عجیب اور اتفاقی ولادت تھی۔ پھر بھولے بھالے ترک نے جو اس کے لیے وجہ نکالی یہ عجیب در عجیب اتفاق ہے۔

لاٹھ کو اور لارڈ کے معنوں کو دیکھو کہ ہندوستان میں آکر لفظ میں کیا تغیر پیدا ہوا؟ اور معنی اس کے یہاں کیا خیال پیدا کرتے ہیں؟ پھر اُس اُزبک کو دیکھو کہ کیا سمجھا اور دلیل کیا خوب پیدا کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلیتِ الفاظ کی تحقیق بہت نازک کام ہے۔ قیاس و انداز ہمارا ہرگز قابلِ اطمینان نہیں۔ اندھیرے میں تیر پھینکتے ہیں۔ لگا تو لگا ورنہ یا قسمت۔

دیکھو! پہلا قدم اس تحقیق کا یہ ہے کہ جب دو لفظ دریافت طلب تمھارے سامنے آئیں تو اُن کی ملتی ہوئی آواز اور یکساں شکل و شباہت پر نہ بھولو۔ ہر ایک کے جوڑ بند کو کھولو اور اُن کی اصل کی طرف پیچھے ہٹو۔ اگر دونوں بیٹھتے بیٹھتے ایک اصل میں جا پہنچیں تو جانو ایک نسل ہے اور ایک گھر کے لفظ ہیں اور اگر اصلیں جُدا جُدا ہوں تو جانو کہ رشتہ کچھ نہیں فقط شباہت نے شبہ ڈالا تھا۔

---

1. روس کی بدولت یہ لفظ وہ بھی جان گئے تھے۔ گورنر کو 'برناس' کہتے تھے۔

اشکال حروف

(تحریر بہ تصویر)

یورپ کے محقق کہتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں دل کے مطالب تصویروں سے جتایا کرتے تھے اور جہاں اشارہ یا آواز نہ پہنچ سکے وہاں شبیہ سے کام نکالتے تھے۔ چنانچہ جب کسی سے کوئی چیز منگانی ہوتی تو اس کی تصویر کھینچ کر بھیج دیتے تھے۔ اس ترکیب نے ترقی کی کہ تصویروں کو ترکیب دے کر مطالب کی زیادہ توضیح کرنے لگے۔ مصر کی پرانی تحریریں اس بات کی گواہی دیتی ہیں اور وہی تصویریں یہ بھی کہتی ہیں کہ حروف مذکورہ شمار میں حروف حال سے بہت زیادہ تھے۔ وہ اشخاص۔ عہدہ داروں۔ حیوانوں اور درختوں وغیرہ کی تصویریں ہوتی تھیں۔ چین میں عہد بہ عہد کی اصلاح کے بعد اب تک ایسی تحریر جاری ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کی الف بے تے میں سیکڑوں حروف ہیں۔

یورپ کے اہلِ تحقیق یہ بھی کہتے ہیں کہ عرب نے حروف تہجی عبرانی سے لیے ہیں۔ یہ بھی حقیقت میں مختلف تحریروں کے اختصار ہیں۔ مثلاً 'الف' کے معنی تھے سرکنڈا یا نرسل۔ دیکھ لو حرف مذکور سرکنڈا ہے کہ ریگستان میں کھڑا ہے۔

ب۔ بیت کا مخفف ہے۔ ابتدائے آبادانی میں گھر بھی سیدھے سادے مختصر ہوتے تھے۔ ب کو غور کر کے دیکھو۔ عرب کے ریگستان میں جنگل میں ایک دیوار کے دو کنارے مڑے ہوئے ہیں۔ وہ گھر ہے۔ گھر والا دیوار کے آگے بیٹھا ہے وہ نقطہ ہے۔

ج۔ جمل کا مخفف ہے۔ یعنی اونٹ۔ یہ پہلے اونٹ کی تصویر تھی۔ اصلاحیں ہوتے ہوتے یہ صورت بن گئی۔

ش۔ شجر کا مخفف ہے۔ پہلے ـلاٗ کی شکل کھینچتے تھے کہ ایک درخت ہے۔ 3 نقطے اُس پر 3 پرندے ہیں۔ کوئی بیٹھا ہے۔ کوئی بیٹھنے کو ہے۔ ہوا میں تھرا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔

رفتہ رفتہ تصاویر مذکورہ یہ رہ گئیں جو دیکھتے ہو اور تلفظ میں آواز کا پہلا حصہ رہ گیا جو سنتے ہو! اصل اشیا کا جس طرح نام اڑ گیا۔ اُسی طرح اصل نشان مٹ گیا۔

کیا سبب ہے کہ جس زبان کو دیکھو۔ دوسری زبان کے بعض حرف تہجی تو اس میں نظر آتے

ہیں، بعض نہیں۔ پھر یہ کہ جو حرف ایک زبان کے لیے خاص ہیں۔ اُس حرف والا لفظ جب دوسری زبان میں جاتا ہے تو حرف مذکور کسی اور حرف سے بدل جاتا ہے۔

اوّل یہ سمجھو کہ حروف تہجی کیا ہیں؟ زبان و دہان کے اختلاف جنبش سے جو آوازوں میں فرق پیدا ہوتے ہیں، اُن کا نام حرف ہے۔ مُنہ، زبان اور گلے میں بال بال بھر فرق سے نیا حرف پیدا ہو جاتا ہے[1]۔ کاغذ پر جو لکھتے ہو، یہ گویا اُن آوازوں کی تصویریں ہیں۔ تم نے قواعد فارسی میں پڑھا ہوگا کہ عرب کے 8 حروف فارسی میں نہیں آتے ث۔ ح۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ ق۔ سبب اس کا فلسفی زبان سے سنو۔ کہتا ہے کہ ملک کی آب و ہوا اور آفرینش خاک کے اختلاف سے جس طرح اہل فارس کے قد و قامت اور شکل و شباہت میں فرق ہے اسی طرح اُن کے لب و دہان اور گلا و زبان کی ساخت میں فرق ہے اور اسی سبب سے اُن کی حرکتوں میں بھی فرق ہے۔

جب اہلِ عرب ایران میں آئے تو اہلِ ملک کے لب و لہجہ میں بعض آوازیں پائیں کہ خاک عرب کی زبان میں نہ تھیں۔ یہاں ایرانی اپنی آواز تلفظ کو اپنے حروف میں لکھتے تھے اور اعراب کے لیے ایسی عمدہ علامتیں لگاتے تھے کہ کسی زبان میں نہ تھیں۔ عرب نے جب ان کی زبانوں کو لیا تو حروف ان کے چھوڑ دیے، اپنے حرفوں میں لکھنے لگے (جس طرح تم اب ہندی کو فارسی حرفوں میں لکھتے ہو) فاضل عرب جو پہلے پہل ایک ایرانی کی تقریر کو تحریر کرنے لگا ہوگا تو دیکھا ہوگا کہ 'ض' کی آواز بالکل کان میں نہیں آتی۔ پھر خیال کیا ہوگا تو معلوم کیا ہوگا کہ ع، ق کی آواز بھی نہیں آئی وغیرہ وغیرہ۔ جب صفحے کے صفحے لکھ گیا اور اِن میں حرف مذکورہ نہ آئے تو اُس نے کہہ دیا کہ یہ حرف فارسی میں نہیں ہیں۔ اسی کو کتب نحو میں بطور قاعدہ کے لکھ دیا گیا کہ 8 حرف عربی میں ہیں جو فارسی میں نہیں آتے۔ ورنہ ان کے لکھنے یا بولنے کے لیے ملک فارس میں نہ کسی شریعت نے ممانعت کی نہ کسی قانون نے جرم قرار دیا ہے۔ در حقیقت خاک فارس سے جو لب و دہان پیدا ہوئے، اُن کی ساخت ایسی واقع ہوئی تھی کہ اُن کے بولنے میں یہ آوازیں نہ تھیں۔ ورنہ انسان ہر قسم کی آواز نکال سکتا ہے۔

اس تحریر میں فاضل عرب کو ایک آواز آئی کہ ب نہ تھی۔ مگر اُس کے قریب

---

[1] ٹ۔ ڈ۔ ڑ وغیرہ فارسی میں ت۔ د۔ ر ہو جاتے ہیں اور چ۔ گ وغیرہ عربی میں ص۔ ج ہو جاتے ہیں۔

قریب ایک آواز تھی اور اسی واسطے اُس کے پاس آواز مذکور کے لکھنے کے لیے کوئی حرف بھی نہ تھا۔ اصل فارسی میں اس کے لکھنے کے لیے الگ صورت موجود تھی۔ فاضل مذکور نے اپنی تحریر میں اس کے لیے اپنا حرف ب لکھا اور امتیاز کے لیے 3 نقطے کر کے پ نیا حرف پیدا کیا۔

پھر ایک نئی آواز آئی کہ ج کی آواز نہ تھی۔ اس کے قریب قریب ایک آواز تھی اس کے لیے ج کے نیچے 3 نقطے کر کے چ پیدا کر لیا۔ اسی طرح ژ۔ گ۔ اسے لوگ کہتے ہیں کہ فارسی کے 4 حرف عربی میں نہیں آتے اور بات وہی ہے کہ خاکِ عرب نے جو گلے اور لب و دہان پیدا کیے، ان کی ساخت ایسی ہی تھی کہ ان کی زبان و دہان اور کلّہ اور گلے کی حرکت میں جو آوازیں نکلتی تھیں۔ ان میں پ۔ چ۔ ژ۔ گ کی آوازیں نہ تھیں اور اسی واسطے عرب کے لکھنے والوں نے اُن کے لیے صورتیں بھی نہیں مقرر کیں۔ جنھیں ہم حرف کہتے ہیں۔

اسی طرح عرب اور فارس کے منہ اور گلوں میں تھ۔ ٹ۔ ٹھ۔ دھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ ڑ۔ ڑاں۔ کھ۔ گھ وغیرہ کی آوازیں نہیں۔ فارسی مروجہ کی کارگزاری اب عربی کے حروف کر رہے ہیں۔ اس لیے ان کی صورت بندی کے لیے حرف بھی نہیں۔ اب تک کسی عرب یا ایرانی سے باتیں کر کے دیکھ لو، حروف مذکورہ ان کی زبان سے نہیں نکلتے۔ اور خاص خاص حرفوں کے ساتھ خاص خاص ملک کے لوگوں کا یہی حال ہے۔ تم سمجھتے ہو؟ جس طرح ہر ملک کے آدمی کی طبیعت جدا ہے۔ اسی طرح دہان و زبان کی طبیعت بھی جُدا ہے۔ بعض آوازیں بھی بعض دہانوں سے موافق ہیں۔ بعض منافر۔

خاک ہندُستان کی زبانوں میں خ۔ ذ۔ ز۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق کی آواز نہیں ہے۔ جب کوئی ایسے حروف والا لفظ سنسکرت یا کسی ہندی زبان میں جاتا ہے تو حرف مذکور دوسرے حرف سے بدل جاتا ہے۔ جب سلسلۂ کلام یہاں تک پہنچا تو ایک سوال پیدا ہوا۔ جس کا جواب فلسفی زبان آسان طور پر سمجھاتا ہے :

س۔ کیا سبب ہے کہ جہاں ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں گیا ہے تو بعض حروف و حرکات اَدَل بَدَل اور اُلٹ پلٹ ہو گئے ہیں؟

ج۔ عزیزانِ وطن! دُور کیوں جاتے ہو۔ تم ایک ہی زبان میں پاؤ گے کہ

سوفار سوفال چست چفت

چنار	چنال	بانچہ	باغسہ
لبالب	لمالم	پاس	پاد۔ اسی سے ہے پادشاہ
بُت	بُد	خروس	خروج۔ خروہ
توت	تود	رخش	رخت
دُرّاج	تُرّاج	خوک	خوگ

ایسے ایسے ہزاروں لفظ ہیں کہ فارسی ہیں اور فارسی ہی میں دونوں طرح مستعمل ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ جن حرفوں کا مبادلہ کتب قواعد میں لکھا ہے۔ کسی شریعت کی کتاب یا ملک کے بادشاہ نے جائز کیا ہے اور باقی ممنوع۔ بات فقط یہ ہے کہ جو حرف قریب المخرج ہیں وہ باہم بدل جاتے ہیں۔ جن حرفوں کے مخرج دُور ہیں اور جن کے مقام بہت پاس پاس ہیں، وہ نہیں بدلتے۔ اس مقام پر ممکن ہے کہ ہر حرف کا مخرج لکھ کر پاس اور دُور کا فرق دکھاؤں، مگر نہیں چاہتا کہ کتاب کو مشکلات کی پڑیا بنا کر طبیعتوں کو بدمزہ کروں۔ اس لیے مطلب کی تصویر نئے رنگ سے کھینچتا ہوں۔

مثلاً ملک ایران میں قطعہ قطعہ کی آب و ہوا اور مخلوقات کے اعضا کی ساخت میں کہیں بہت کہیں تھوڑا فرق ہے۔ اسی نسبت سے ان کی جنبشوں میں فرق ہے۔ اسی کے بموجب آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک ملک کے لوگ بعض حرف صفائی اور آسانی سے بعض حرف مشکل سے نکالتے ہیں۔ جو حرف مشکل سے نکلتے ہیں، جب وہاں ٹھیک زبان نہ لگی، تو اُس کے پاس کا حرف پیدا ہو گیا۔ یعنی سوفار کا سوفال بن گیا۔

تبریز وغیرہ قطعات ایران کے لوگوں کی زبان سے 'گ' نہیں نکلتا۔ اُس ملک کے لوگ سگ کو سے اور انگور کو اینور کہتے ہیں اور اسی طرح اور صدہا الفاظ۔ اکثر صحرا نشین فرمود کو پرمود کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ انھی حرفوں کے مبادلے جائز سمجھو۔

کشمیری تازہ وارد سے باتیں کرو۔ جن لفظوں کے اوّل میں آ ہے ی بولے گا۔ مصرع یلہی غنچۂ اُمّید بکشا اور ایران کو "یران" کہے گا۔ ل کو تالو کے اندر سے اس طرح نکالتا ہے کہ ساری آواز گلے میں گُتھل ہو جاتی ہے۔ کیفیت اس کی سننے پر منحصر ہے، تحریر میں نہیں آسکتی۔ آصف الدولہ مرحوم کے عہد میں بندہ "لوکنو" کے درمیان موجود تھی۔ وغیرہ۔

اہل پنجاب سے باتیں کرو تو ذرا خیال رکھنا۔ گیارہ کو ہمیشہ یارہ کہتے ہیں۔

اپنے ملک میں سُن لو۔ اہل شہر کے منہ سے سارے حرف کیسی صفائی سے نکلتے ہیں۔ ان کی زبان کیسی نرم اور تیز معلوم ہوتی ہے اور گلا گداز۔ باہر والے خصوصاً ناخواندوں کی زبان سخت اور موٹی معلوم ہوتی ہے۔ اُس سے ہر حرف آسانی سے نہیں نکل سکتا۔ بعض حرفوں میں زبان ٹھیک جگہ پر نہیں لگتی، ذرا ورے پرے لگ جاتی ہے۔ کوئی اور حرف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے سکّر، سُر دا، ہزاروں لفظ بولتے ہیں۔

زبان	کو	جبان
حضور	کو	حجور
خالی	کو	کھالی
فرمانا	کو	پھرمانا
آٹا	کو	اٹا اور آنٹا
روٹی	کو	روٹّی
پانی	کو	پانڑیں

کہیں تشدید۔ کہیں کوئی حرف ہی بڑھا دیتے ہیں۔ کہیں گھٹا دیتے ہیں۔

اکثر لفظوں میں حرفوں کو آگے پیچھے کر دیتے ہیں۔ کہیں کہیں شہر کے عوام بھی ان میں مل جاتے ہیں اور اس سے معلوم ہوا کہ ایسی تبدیلیاں زبانِ انسانی کا خاصہ ہے۔

مطلب	کو	مطبل
فصیل	کو	صفیل
قفل	کو	قُلف
لعنت	کو	نالت

اسی خیال کی تصویر ایک اور رنگ سے کھینچتا ہوں۔ ذرا ننّھے ننّھے بچّوں کو دیکھو۔ کیا مزے سے تُتلا تُتلا کر باتیں کرتے ہیں۔ ایک تکیہ پر چڑھ بیٹھا ہے اور کہتا ہے۔ آہا ہم دولے پل چلے (ہم گھوڑے پر چڑھے)۔ دوسرا کہتا ہے۔ ہمالی لال دیند۔ تُمالی چھجّ دیند (ہماری لال گیند۔ تمھاری سبز گیند)۔ بگڑتے ہیں تو کہتے ہیں۔ ماؤں گا۔ مالوں دا (ماروں گا)۔ بھوک لگتی ہے تو کہتا ہے۔ لوتی تاؤں گا۔ کوئی کہتا ہے۔ اوتی کھاؤں گا۔ بوت لدی ہے (روٹی کھاؤں گا۔ بھوک لگی ہے)۔

فلسفیِ زبان انھی میں سے مبادلہ حروف کے اصول نکالتا ہے۔ بچّوں کے مزاج اور اعضا میں رطوبت زیادہ ہوتی ہے۔ غدود اور پٹھے پھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے لب و دہان میں تیزی و سبکی نہیں ہوتی کہ جب کوئی لفظ بولیں، ہر حرف کے لیے نقطہ نقطہ زبان کا مُنہ کے اُسی نقطہ پر لگے، جو اس کا اصلی مخرج ہے۔ کبھی ذرا آگے کبھی ذرا پیچھے لگ جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا وہی کہ اصلی حرف کی جگہ اس کا قریب المخرج کوئی اور حرف نکل جاتا ہے۔ تم خود ذرا ذرا۔

ورے پرے زبان لگا کر د اور ت کا تجربہ کرلو۔ دو چار دفعہ متواتر۔ ڈِل۔ ڈِل۔ تِل۔ پھر۔ ڈِل۔ تِل۔ برابر۔ ڈِل تِل کہہ کر دیکھو۔ خیال کرنے سے کچھ ان کے قریبِ مخرج کااثر معلوم ہو گا۔

اسی طرح دو چار دفعہ کہو۔ بار۔ بال اور تار۔ تال۔ تمھیں معلوم ہو گا کہ ر اور ل قریب المخرج ہیں اور ایسے ایسے چند حرف اور ہیں کہ قربِ مذکور کے سبب سے بچّوں اور بڑوں کی زبانوں پر اَدَل بَدَل ہو جاتے ہیں اور جو حروف ایسے نہیں یعنی بعید المخرج ہیں۔ ان میں اَدَل بَدَل بھی نہیں ہوتی۔ انھی سے فلسفیِ زبان نے مبادلاتِ حروف کے قواعد باندھے ہیں۔ مختلف زبانوں میں غور کر کے دیکھو۔ وہاں بھی اکثر انھی حرفوں میں تبدیلی ہوتی ہو گی، جو قریب المخرج ہیں۔

س۔ قواعد فارسی میں ایک فصل مفصّل مبادلہ حروف کی کیونکر بن گئی؟

ج۔ عہد قدیم سے ایران کے ہر قطعہ زمین میں علم کا چرچا ہے۔ علما، خصوصاً شعرا صاحبِ تصنیف ہوتے ہیں۔ اِن کے تلفظ اور لہجے جدا جدا ہیں۔ جو الفاظ شعرا کے کلام، علما کی تصنیف میں آگئے، اہلِ لغت کو ان کا لکھنا اور اہلِ قواعد کو اپنے سلسلہ میں کھینچنا واجب ہوا۔ وہ مستقل الفاظ بن گئے اور تحریروں اور تقریروں میں دونوں طرح مستعمل ہو گئے۔ ملک اور غیر ملک کے لوگ انھیں بھی لغت جانتے اور مانتے ہیں اور ایسا ہونا چاہیے۔ کیونکہ جو الفاظ خاص و عام کے استعمال میں اور تحریر تقریر میں عام و تام ہوں اور اقسام و اغراض کے پورا کرنے میں کام دیں۔ وہی اس کے الفاظ و لغات ہیں۔

نکتہ۔ تجربہ اور مشاہدہ نے قانون بتایا کہ اکثر الفاظ ابتدا میں لچر اور غلط شمار ہوتے ہیں۔ پھر اگر محاورہ نے انھیں منظور کر لیا اور خواص نے زبان میں جگہ دی اور نظم و نثر نے تحریری سند دے دی تو وہی غلط سلط لفظ مستقل لغت ہو کر اجزاے زبان ہو جاتے ہیں اور جو تبدیلی کہ کوتاہیِ تکلّم یا غلطیِ مخرج سمجھی جاتی تھی وہی ایک عرصہ کے بعد تعلیل و تبدیل کا قاعدہ ہو جاتی ہے اور اس سے یہ قاعدہ نکلا کہ ملکِ سخن میں کوئی لفظ صحیح نہیں، کوئی لفظ غلط نہیں، جس پر قبولِ عام اور رواجِ تام مہر کر دے، وہ ایک لفظ صحیح ہے۔ یہ نہ ہو تو صحیح بھی مردود۔

اصفہان۔ شیراز وغیرہ اکثر مشہور شہر ایران کے ہیں۔ وہاں کے خاص و عام ایران کو ایردن۔ زبان کو زبون کہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ مگر قافیہ میں نہیں باندھتے۔ نہ کتاب میں لکھتے ہیں۔ اسی واسطے یہ تبدیل اور اس کا تلفظ غلط ہو کر لغت سے خارج ہوا۔

نقل۔ کسی بے استعداد شاعر ایرانی کے شعر کا ایک مصرع مجھے یاد ہے ع

کار معجونِ کمونی 1 مے کند پیکانِ او

کمان کو تمام ملک ایران کمون کہتا ہے۔ یہ بیچارہ بے علمی کے سبب سے غلط کو اصلیت سمجھا اور اس سے ایک مضمون شاعرانہ پیدا کر لیا۔ کمون غلط ہے مگر لطف شعر کی بنیاد اسی پر ہے۔

لطیفہ۔ ایک ایرانی صاحب زبان سے کسی ہندی نے کہا۔ آغا! اکثر اہلِ ایران را دیدم بجائے غ۔ ق میگویند۔ ایرانی چمک کر بولا۔ کے قلط گفتہ باشد۔

فارسی اور سنسکرت کے متّحد الاصل لفظوں میں کن اُصول کے بموجب تبدیلیاں ہوئی ہیں

عزیزانِ وطن! اب مطلب کا میدان آیا۔ فلسفہ زبان کے تمام خیالات ایک نقشہ کی طرح سامنے کھنچے ہیں۔ ان سے تم خوب سمجھ سکتے ہو کہ دونوں زبانوں میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ خود بخود طبیعتِ ملک اور طبیعتِ زبان کے زور سے ہوئی ہیں۔ مَیں ایک ایک حرف کا حال مثالیں دے کر تمھیں دکھاتا ہوں۔ دیکھو زبان کی طبیعت نے کن قواعد کے سلسلہ میں جنبش کی ہے۔ اس کی بعض تبدیلیوں پر تمھیں ضرور تامل ہوگا اور بے شک نقطہ نقطہ پر اٹکنا چاہیے کہ تحقیق میں کسر نہ رہ جائے اور شاید اسی میں کوئی اور نقطہ نکل آئے۔ مذکورہ بالا بیانوں میں تم نے دیکھا کہ اکثر لفظ اور معنوں میں جو تبدیلیاں ہوئیں، کتابوں میں لکھی ہیں۔ بلکہ اکثر تغیر ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں۔ جبکہ وہ تغیر ان تغیروں سے کم نہیں تو ان لفظوں کی ہڈیوں کو قرابت کے گوشت سے کیوں الگ کرتے ہو۔ ہزاروں برس گزر گئے۔ یہ بہنیں جدا ہوئیں، ہزاروں کوس کے پردیس میں جا پڑیں۔ دونوں پر اپنی اپنی جگہ مذہبوں اور سلطنتوں کے انقلاب سے طوفانِ نوح گزر گئے۔ ملکوں کی آب و ہوا نے آدمیوں کے کلوں اور جبڑوں کی ساخت، لب و

---

1 جوارش کمونی اور معجون کمونی ایک دواے ہاضم ہے۔ کمون زیرۂ خراسانی کو کہتے ہیں۔

دہان کی حرکتیں، گلوں کی آوازیں، زبان کے لہجے بدل دیے۔ زمانہ کی گردشوں نے اُن کے لفظوں کو گھسا پسا کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ پس جو تغیر اِن کے حرفوں میں نظر آئے، تھوڑا ہے اور جتنی صورتیں ملتی جلتی باقی رہیں، غنیمت ہے۔ بہر حال اب میں ایک ایک حرف اور اس کے ساتھ کچھ کچھ الفاظ لکھتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ کس کس طرح تبدیلی نے اُن پر اثر کیا ہے۔

اس مقام پر مَیں حرفوں کے مخرج ایک فہرست کی صورت میں لکھتا ہوں کہ ہر ایک حرف کہاں کہاں سے آواز دیتا ہے۔ تم دیکھو گے کہ جو حرف قریب المخرج ہیں وہی آپس میں اَدَل بَدَل ہوتے ہیں۔

مخرج اوّل۔ ء۔ ہ۔ گلے کے نیچے سے نکلتے ہیں۔
دوم۔ خ۔ غ۔ اُن سے ذرا اوپر سے نکلتے ہیں یعنی کوّے کے پاس سے۔
سوم۔ ق۔ ک۔ گ۔ کوّے کے اوپر سے۔
چہارم۔ ش۔ ج۔ چ۔ ژ۔ ے۔ اُن سے بھی اوپر سے یعنی وسط زبان اور تالو سے۔
پنجم۔ ل۔ ن۔ ر۔ ڑ۔ نوکِ زبان اور اوپر والے سامنے کے دانتوں سے مل کر نکلتے ہیں۔
ششم۔ ت۔ ٹ۔ د۔ ڈ۔ نوکِ زبان اور اوپر والے دانتوں کی جڑ سے مل کر۔
ہفتم۔ س۔ ز۔ نوکِ زبان اور نیچے والے دانتوں سے مل کر۔
ہشتم۔ ب۔ پ۔ ف۔ م۔ و۔ دونوں ہونٹوں سے مل کر نکلتے ہیں۔

حرکات

جس طرح تینوں مقصورہ حرکتیں اَ۔ اِ۔ اُ۔ اور تینوں ممدودہ حرکتیں آ۔ اِی۔ اُو۔ وغیرہ سنسکرت میں اجزائے حرفی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح ژند اور پہلوی میں ہیں۔ کئی قسم کے ن۔ جس طرح سنسکرت میں خاص خاص سورتوں کے ساتھ لکھے جاتے ہیں اسی طرح اُن میں لکھے جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب کتابت میں زبان مذکور نے حروف عربی کا لباس پہنا تو پہلی صورتیں بدل گئیں۔

ابتدا بہ سکون سنسکرت میں عام ہے۔ عجب نہیں کہ فارسی کی قدیم زبانوں میں بھی پہلا حرف ساکن ہوتا ہو۔ خاک عرب کی طبیعت میں ابتدا بہ سکون نہ تھا۔ عرب اُسی کے

عادی تھے اور اسلام کے بعد فارس میں ابتدائی مصنف عرب ہی تھے، یا اُن کے شاگرد۔ تم یہ بھی سنتے ہو کہ بعض الفاظ فارسی کے اوّل میں الف اصلی ہے، بعض میں زائد ہے۔ کیا عجب ہے کہ انھوں نے جس لفظ کا پہلا حرف ساکن سنا ہو۔ اپنے تلفظ کی آسانی کے لیے اوّل ایک الف متحرّک لگا دیا ہو۔ وہ زائد مشہور ہو گیا۔ جیسے اشگرف۔ شگرف۔ اسمندر۔ سمندر۔ اشکم۔ شکم۔ اشتر۔ شتر۔ دونوں طرح بولتے ہیں۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں کہاں الف اصلی ہے اور کہاں عرب کا عطیہ ہے۔ ذرا غور کر کے دیکھو! جب لفظ کے اوّل سے الف گراتے ہو تو زبان کی طبیعت چاہتی ہے کہ بعد کا حرف ساکن ہو۔ ہماری زبان کو اس کی عادت نہیں، اس لیے کچھ حرکت دے دیتے ہیں۔ غرض جب ہم دیکھتے ہیں کہ طرز تحریر، اقسام حرکات وغیرہ وغیرہ بہت سی باتیں سنسکرت کے مطابق ہیں تو ابتدا بہ سکون پر تعجب کیوں کریں!

تعجب ہے تو یہ ہے کہ سنسکرت کا قلم بائیں ہاتھ سے داہنے ہاتھ کو چلتا ہے اور ژند کا داہنے سے بائیں کو اور اس کا سبب اکثر پارسیوں اور جرمن کے عالموں سے بھی پوچھا۔ کچھ معلوم نہ ہوا۔

الف مدّہ

کہیں فارسی میں ہے سنسکرت میں نہیں۔ کہیں سنسکرت میں ہے فارسی میں نہیں۔

(1) بستر۔ فارسی میں چھوٹے سے بچھونے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بستار बिस्तार بچھانے کو کہتے ہیں۔

ترس۔ فارسی میں ڈر ہے۔ سنسکرت میں تراس त्रास کے یہی معنی ہیں۔

مہ۔ فارسی میں بزرگ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں مہا महा ہے۔

دو۔ فارسی میں 2 کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دُوا یا دوتیا द्वय या दुतिया ہے۔

زلو اور زلوک فارسی میں جونک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں جلوکا जलौका ہے۔

شاخ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت شاکھا शाखा ہے

(2) گاؤ۔ فارسی۔ سنسکرت میں گو गौ کہتے ہیں۔

پار۔ فارسی میں سالِ گزشتہ اور اس سے پہلے برس کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پر पर ہے اور

اُس میں اس سے زیادہ وسعت ہے۔ چنانچہ پُوتر पुत्र بیٹا۔ پُوتْر पौत्र پوتا ہے۔ پتامہ، دادا، پرپتامہ पर पितामह پردادا ہے۔

پارینہ۔ کتب فارسی میں لکھا ہے کہ منسوب بہ پار ہے۔ اسی واسطے پرانے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پران पुराणा پُرانااور پراتن पुरातन اور پراچین पराचीन پُرانے کو کہتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ پراچین۔ پرائین سے پارینہ ہوگیا ہو۔ دیکھو پارینہ کا پُراناپن ایک برس کا نہیں معلوم ہوتا۔

ناوَ۔ فارسی میں چھوٹی کشتی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں نَو नाव کہتے ہیں۔

مندک۔ فارسی میں اُس چیز کو کہتے ہیں، جس کی فروخت کا بازار میں کم رواج ہو جائے۔ سنسکرت میں مند۔ تھوڑا۔ بے نصیب۔ بُرا۔ سُست۔ بیمار۔ کمینہ۔ بے عقل ہے۔

کافور۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کرپور ہے۔ (دیکھو فصل ر صفحہ 69)

الف متحرّک

فارسی میں اکثر اصلی ہوتا ہے۔ اس طرح کہ حذف نہیں ہو سکتا۔ جیسے 'اختر'۔ 'ارمغان' وغیرہ صدہا لفظ ہیں۔ کہیں حذف بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ 'اشتر'۔ 'شتر'۔ 'اسمندر'۔ 'سمندر' وغیرہ۔ ابھی بیان ہوا ہے کہ دونوں طرح آتے ہیں۔ کہیں اہل زبان خود زیادہ کر دیتے ہیں۔ یا یہ کہو کہ اصلی کو گرا دیتے ہیں۔ جیسے 'بر'۔ 'ابر'۔ 'بے'۔ 'ابے'۔ 'با'۔ 'ابا'۔ یہ زیادتی نظم میں ہوتی ہے، نثر میں نہیں۔ وہ بھی چھ سات سو برس پہلے ہوتی تھی۔ کئی سو برس متروک رہی۔ چالیس پچاس برس سے پھر قصائد میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر جو حرف شرط ہے، ہمیشہ نظم و نثر دونوں میں آتا ہے اور گر فقط نظم میں آتا ہے۔ از بھی نظم و نثر دونوں میں آتا ہے۔ ز فقط نظم میں ہو جاتا ہے۔ ان الفاظ کو دیکھ کر سمجھ میں آتا ہے کہ الف متحرّک کے مزاج میں دونوں قوّتیں ہیں۔ گرنا بھی اور زیادہ ہونا بھی۔ فہرست مندرجہ صفحہ 53 میں مخارج حروف کو دیکھو۔ معلوم ہوگا کہ ا اور ہ قریب المخرج ہیں اسی واسطے فارسی کے اکثر لفظوں میں ا ہ سے بدل جاتا ہے۔ مثلاً افیون۔ ہپیون وغیرہ۔ اکثر الفاظ ہیں کہ اہلِ زبان میں دونوں طرح مستعمل ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان دونوں حرفوں کے مزاج میں مبادلہ کا میلان ہے۔ ار،

صورت میں اگر کوئی لفظ ایسا ہو کہ اس کا الف متحرّک ہ سے بدلیں اور لفظ مذکور سنسکرت میں جا ملے تو صاف سمجھ لو کہ اصل میں اس چیز کا ایک ہی نام تھا۔ دوسرے ملک میں جاکر جس طرح اہل ملک کے رنگ و روپ، ڈیل ڈول، وضع لباس بدلے، اسی طرح ان کے لب و دہان کی نئی جنبش نے لفظوں پر اثر کیا۔ ا کا مزاج قرب مخرج کے سبب سے ہ کی طرف مائل تھا۔ اس لیے ہ بن گیا۔ لفظ کی صورت بدل گئی۔ بے خبر سمجھتے ہیں کہ اس شے کو فارسی میں یہ کہتے ہیں اور سنسکرت میں وہ۔ حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔

اب میں الف کے گرنے کی مثالیں دیتا ہوں

یک۔ فارسی میں عدد '۱' ہے۔ وہی سنسکرت میں ایک एक ہے۔
ابرو۔ فارسی میں بھوں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں भ्रु بھرو ہے
سَتَہ۔ بفتحتین اور کبھی بہ تشدید۔ فارسی میں باسی چیز کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اَستُوَہ असत्व کہتے ہیں۔

اب دیکھو ا کیونکر ہ سے بدل جاتا ہے

اے۔ فارسی میں حرف ندا ہے۔ سنسکرت میں ہے हे کہہ کر پکارتے ہیں اور ایے अये ۔
استہ اور ہستہ فارسی میں عموماً ہڈی کو کہتے ہیں اور گٹھلی کو بھی کہتے ہیں۔ مثلاً ہستہ خرما (کھجور کی گٹھلی)۔ ہستہ شفتالو (آڑو کی گٹھلی)۔ سنسکرت میں استھی अस्थि عام ہڈّی کو کہتے ہیں۔ تھ مخلوط الہا تھی، وہ خالص ت ہو گئی۔ اس کی ہ اخیر میں ہائے مختفی ہو گئی۔ ی حذف ہو گئی۔ تغیر زبان اور تغیر لہجہ سے ایسا اور اس سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔
انگوزہ فارسی میں ہینگ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ہنگو हिंगु ہے۔ 'زہ' فارس میں زیادہ ہوا یا ہند میں اڑ گیا۔

فارسی کا الف ابتدائی کبھی ے ہو جاتا ہے۔ جیسے آمد۔ بیامد۔ افتاد بیفتاد وغیرہ۔ سنسکرت میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے۔

ایدر۔ فارسی میں ادھر اور یہاں کے معنی دیتا ہے۔ سنسکرت میں اتر इतर یہاں اور ان یتر अन्यत्र غیر اینجا اور تتر तितर وہاں کو کہتے ہیں۔ وہی اِتر برج میں بگڑ کر 'ایدھر' ہوا اور اب بگڑ کر 'اِدھر' ہو گیا۔ جب ہندوستان میں رہ کر یہ تبدیلی ہوئی اور اس پر تمھیں تعجب نہیں آتا تو فارس میں جاکر جو تبدیلی ہوئی اس پر تعجب کیوں کرو۔

الف ممدودہ

فارسی میں جن لفظوں کے اوّل میں الف ممدودہ ہوتا ہے۔ کبھی گر پڑتا ہے، کبھی الف مفتوحہ رہ جاتا ہے اور لفظ کی صحت میں فرق نہیں آتا۔ اگر ایسی تبدیلی سے کوئی فارسی لفظ سنسکرت ہو جائے تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ تغیر طبیعت میں داخل ہے۔

ادرک۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں آدرک आदरक کہتے ہیں۔ الف ممدودہ کی طبیعت تمھیں معلوم ہو گئی کہ 'مد' کسی لفظ میں فقط زبر رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ایک ہے الف کی کیفیت میں تبدیلی ہو گئی 'ء' حذف ہو گئی۔

آہار۔ فارسی میں بمعنی خوراک ہے۔ سنسکرت میں آہار आहार خوراک کو کہتے ہیں فرق اتنا ہے کہ آہار اب فارسی کی تحریر اور محاورہ میں نہیں۔ ناہار محاورہ اور تحریر دونوں میں ہے۔ صبح سے جب تک کھانا نہ کھاؤ۔ ناہار ہو (یعنی کچھ نہیں کھایا)۔

آش۔ فارسی میں اس خوراک کو کہتے ہیں جو پی جائے۔ سنسکرت میں اشن خوراک اور اَشِت अशित اس شخص کو کہتے ہیں جو کھانا کھائے ہو۔ فارسی میں ناشتا بمعنی ناہار ہے، یعنی جب تک کچھ نہ کھایا ہو۔ قیاس کہتا ہے کہ عہدِ قدیم میں وہاں بھی اشتا، بمعنی خوراک خوردہ۔ یا خوراک ہوگا۔ اب متروک ہو گیا۔

آتش۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں ہتاشن[1] हताशन خورندۂ خود و فنا کنندۂ خود ہے۔ اسی لحاظ سے آتش کو بھی ہتاشن کہتے ہیں۔ چونکہ فارسی میں آ کبھی اُ ہو جاتا ہے اور ا ہ سے بدل جاتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ مدت دراز گزر کر تغیر لہجہ سے آ نے ہ کی آواز پیدا کی ہو۔ ن زاید اور محذوف فارسی اور سنسکرت دونوں میں آتا ہے۔ حرفوں اور حرکتوں کی تبدیلی ہوتے ہوتے آتش ہو گیا ہو (اور دیکھو فصل ش صفحہ 74)۔

---

1. ایک صاحب ژند پہلوی اور سنسکرت سے واقف ہیں۔ انھوں نے اس اتفاق پر اعتراض کیا اور کہا کہ 'ہتاشن' اُس آگ کو کہتے ہیں۔ جو 'ہوم' کے کام آتی ہے اور یہ آتش عام ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ 'آتش' زبان ژند میں 'آترش' ہے اور بعض ترکیبوں میں اس کا ش گر پڑتا ہے۔ فقط 'اُتر' رہ جاتا ہے۔ وہی 'آذر' ہو جاتا ہے۔

آستان۔ فارسی میں دروازہ یا دہلیز کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ستھان स्थान عموماً جگہ کو کہتے ہیں۔ فارسی میں ابھی دیکھ لیا کہ اپنے گھر میں الف ممدودہ کبھی فقط مفتوحہ ہی بولا جاتا ہے، کبھی حذف ہو جاتا ہے۔ یہاں اُس کے ہونے یا نہ ہونے سے آپس کے اتفاق میں کیوں خلل ڈالیں۔

آغاز۔ فارسی میں شروع کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اَگر अग्र ہے اور برج بھاشا میں آگا आगा فارسی میں د الف ہو گئی۔ ذ زیادہ ہو گئی۔

ب

ب اور و قریب المخرج ہیں۔ گویا دونوں کی طبیعتیں موافق ہیں۔ اس لیے فارسی زبان میں بھی باہم مبادلہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً سیب۔ سیو۔ آب۔ آو۔ باز۔ واز۔ بڑے بڑے پنڈتوں کو دیکھا، جب سنسکرت الفاظ بولتے ہیں تو نہیں کھلتا کہ ب بول گئے یا و۔ یہی سبب ہے کہ فارسی کے اکثر الفاظ جو سنسکرت سے متحد الاصل ہیں۔ ان میں ب و سے بدلی ہوئی ہے۔

آبستن۔ آبست۔ آبستہ۔ فارسی میں زنِ حاملہ اور وہ زمین ہے جو کھیتی کے لیے تیار کریں۔

آبشت۔ نہفتہ و پنہاں۔ سنسکرت میں آوشت आवेशित ایک چیز کا دوسری میں گھس جانا ہے۔ چونکہ نہفتگی دونوں میں آشکارا ہے۔ عجب نہیں کہ دونوں کی اصل ایک ہو۔

بانگ۔ فارسی میں آواز ہے۔ سنسکرت میں واک वाक आواز ہے۔ اور جب یہ لفظ کسی ایسے لفظ سے ملتا ہے، جس کے اوّل میں م یا ن ہے تو وانگ کی آواز پیدا کرتا ہے۔ دیکھو وہی فارسی میں بانگ ہے۔

بار۔ فارسی میں ایک بار۔ دو بار۔ سہ بار۔ سنسکرت میں وار वार کے یہی معنی ہیں۔

تاب اور تاو۔ فارسی میں گرمی اور چمک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں تاؤ ताउ ہے اور اصل میں وہ بھی تپ तप ہے۔

بیوہ۔ فارسی میں رانڈ عورت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ودھوا विधवा ہے۔

بیو۔ بیوک۔ فارسی میں نئی بیاہی عورت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں وواہ विवाह اور بواہ بیاہ کو کہتے ہیں۔

باد۔ ہوا ہے۔ سنسکرت میں وات वात ہے۔ (دیکھو فصل و صفحہ 83)

بند۔ اسی سے فارسی میں ہے پابند۔ سنسکرت میں کہتے ہیں پادوندھ۔ पाद پاد یعنی پاے۔

وندھ بندھا ہوا۔

بندہ۔ فارسی میں خدمت گار و تابع فرمان کو کہتے ہیں۔ اسی سے ہے بندگی بمعنی طاعت و اطاعت۔ سنسکرت میں विन्द وند بمعنی فرمانبرداری ہے۔ چنانچہ شاگرد استاد کے سامنے جاتا ہے تو کہتا ہے वन्दे जगदगुरुः وندے جگت گرو ہو ہمو (اطاعت ہے استاد عالم کی)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل دونوں کی ایک ہے۔

بھ

عرب اور فارس کے گلے میں یہ آواز نہیں ہے۔ تم نے گفتگو میں ان ملکوں کے اشخاص کو سنا ہوگا کہ ان حرفوں کے تلفظ میں خالص ب اور پ بولتے ہیں اور بھائی کو بائی اور پھول کو پول کہتے ہیں۔ چنانچہ ان حرفوں کے مبادلہ سے اکثر فارسی اور سنسکرت کے لفظ مل جاتے ہیں۔

ابر۔ فارسی میں بادل ہے۔ سنسکرت میں ابھر अभर ہے۔

ابرو۔ (دیکھو فصل الف صفحہ 56)۔

بیم۔ فارسی میں ڈر کو کہتے ہیں۔ بھے भय خوف اور بھیم भीम خوفناک امر کو کہتے ہیں۔

بار۔ فارسی میں بوجھ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھار भार ہے۔

بخش۔ فارسی میں حصہ کو کہتے ہیں اور ژند میں یہی ہے۔ سنسکرت میں بھاگ भाग ہے اور بھج भग्य سے بھی ہو سکتا ہے اور شاید وہی لفظ ہو جو سنسکرت میں پکش पक्ष ہے۔

برادر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں وہی بھراتر भ्रात्र ہے۔

بروت۔ فارسی میں موچھ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھرُودَتؔ भ्रूदत کہتے ہیں۔ بھرو، بمعنی ابرو ہے اور دت مفید فاعلیت۔ چونکہ موچھیں بھوؤں کے مقابل واقع ہوئی ہیں۔ گویا بھوؤں کی صاحب رتبہ ہیں، اس لیے ان کا نام بھرُودَت رکھا۔

آزاد۔ عجب نہیں کہ اہل فارس کے بزرگ بھی اس اصلیت سے آگاہ ہوں۔ محاورہ میں 'چار ابرو زدن' سارے چہرہ کی صفائی سے مراد ہے۔

بوم۔ فارسی میں زمین، جگہ اور مقام کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھومی اور بھوم بمعنی زمین ہے۔

بَتّہ۔ بُجُو۔ فارسی میں خشکے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھکت भुक्त کہتے ہیں۔ جس طرح برج کی زبان میں بھات اور بھتہ ہو گیا، اسی طرح فارسی میں تبدیلی ہو گئی ہو گی۔

پ

فارسی لفظوں کی ب کبھی سنسکرت میں پ کی آواز دیتی ہے اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ ترکِ وطن اور تغیرِ آب وہوا سے آواز بدل گئی۔

باب۔ فارسی میں باپ کو کہتے ہیں اور اس میں پیار کا 'ا' لگا کر بابا کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت اور ژند میں باپ ہے۔

شب۔ فارسی میں رات کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شپا शपा ہے۔

کبوتر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کپوت कपोत کہتے ہیں (دیکھو فصل ر صفحہ 69)۔

کرباس۔ فارسی میں روئی اور سوت کے بنے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں کپاس कपास ہے۔

ہرپاسب۔ (دیکھو فصل ہ صفحہ 84)۔

آب۔ فارسی میں پانی ہے۔ سنسکرت میں آپہ आपा کہتے ہیں۔

تباس۔ فارسی میں بمعنی عبادت ہے۔ سنسکرت میں تپسیا तपस्या عبادت کو کہتے ہیں۔

پود۔ فارسی میں بانے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اسے بیوتی व्युती کہتے ہیں۔

کبھی فارسی کی پ سنسکرت میں واؤ کی آواز دیتی ہے۔

اسپ۔ فارسی میں گھوڑے کو کہتے ہیں سنسکرت میں وہی اشو अश्व ہے۔

کبھی حذف بھی ہو جاتی ہے

وای۔ فارسی میں 'باولی' کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں واپی वापी اور بھاشا میں واں یا وائیں वाई کہتے ہیں اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ پ اصل میں نہ تھی سنسکرت میں زیادہ ہو گئی یا اصل میں تھی، فارسی میں فرسودہ ہو گئی۔ اب بھی عرفِ عام میں وائیں یا بائیں کہتے ہیں۔ دلّی میں 'احمد کی بائیں' ایک مشہور باولی ہے۔

ت

قربِ مخرج اور مناسبت طبع نے اپنے گھر (یعنی فارسی) میں بھی دال کے مبادلہ پر بہت راغب کیا ہے۔ چنانچہ توت سے تود۔ بُت سے بد ہو جاتا ہے۔ پس سنسکرت فارسی کے دو لفظ اگر ایسے مبادلہ سے متّحد ہو جائیں تو اُن کے ایک سمجھنے میں کیا کلام ہے۔

تاک۔ فارسی میں درختِ انگور کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دراکشا द्राक्षा انگور کو کہتے ہیں۔ دیکھو سنسکرت میں क्ष سے لکھا جاتا ہے اور وہ کبھی کھیَہ کی آواز بھی دیتا ہے۔ وہی خراب ہو کر برج بھاشا میں داک दाक ہو گیا ہے۔

کبھی سنسکرت کی ت فارسی میں گر پڑتی ہے یا یہ کہو کہ اصل میں نہ تھی، سنسکرت میں زیادہ ہو گئی۔

پور (بیٹا) فارسی ہے۔ سنسکرت میں پوتر पुत्र کہتے ہیں۔

تھ

یہ آواز بھی خاکِ فارس میں نہیں۔ تم کسی ایرانی سے بات کر کے دیکھو۔ جب ایسا لفظ تقریر میں آئے کہ اُس میں حرف مذکور ہو تو اس کی جگہ خالص ت بول جائے گا۔ اگر پُرانے لفظوں میں کہیں ایسا اتفاق ہو تو اُسے اتحاد سمجھنے میں کیا عذر ہے۔

ستیا۔ زبانِ ژند میں دُنیا کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ستھتی स्थिति بمعنی موجود ہے وہی فارسی حال میں ہستی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ تینوں لفظوں کی اصل ایک ہو۔

استہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں استھی अस्थि ہے۔ (دیکھو فصل آ صفحہ 56)

ٹ

یہ آواز فارس اور عرب کی خاک میں نہیں۔ جب ایران یا عرب کے لوگ اس حرف کو بولتے ہیں تو ت کی آواز نکلتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ :

انگشت۔ فارسی میں انگلی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں یہی انگشٹ अंगुष्ट ہے۔ اتنا فرق اور بھی ہے کہ انگوٹھے کو کہتے ہیں (یعنی نر انگشت)۔

اُشتر۔ فارسی میں اونٹ کو کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں اشٹر उष्ट्र ہے۔
آوشت۔ سنسکرت میں آوشٹ आविष्ट ہے (دیکھو فصل ب صفحہ 58 میں آبستن)۔
مُشت۔ فارسی میں مٹھی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں مشٹ मुष्ट ہے۔
بتو اور بتہ۔ فارسی میں بٹے کو کہتے ہیں۔ ہندی میں بٹا बट्टा اور وٹا वट्टा ہے کہ ورتُل वर्तुल سے نکلا ہے۔ گول چیز کو کہتے ہیں۔ یہ تعجب کی بات نہیں۔ ہند کی زبان نے اس طرح تبدیلی کی۔ ایران کی زبان نے اُس طرح کی۔
تہ۔ نیچے (اوپر کی ضد)۔ سنسکرت میں ستھا स्था ہے اور اسی سے ہے تھاہ थाह اور اتھاہ سمندر۔ جس دریا کی تہ نہ معلوم ہو سکے۔
چتوک اور چغوک۔ فارسی میں چڑے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں چٹکا चटका ہے۔
دشت۔ فارسی میں بد اور زشت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دشٹ ہے۔ (دیکھو دشنام اور دشمن صفحہ 82)۔
سرشت۔ گندھاوٹ اور اصل خلقت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سرشٹی श्रृष्टी ہے۔

ج

مناسبتِ طبعی اُسے چند حرفوں سے مبادلہ کے لیے آمادہ رکھتی ہے۔ چنانچہ فارسی میں بھی کبھی گ سے بدل جاتا ہے۔ جیسے جہان۔ گہان اور نارنج۔ نارنگ۔ کبھی ی سے بدل جاتا ہے۔ جیسے جوغ۔ یوغ۔ اسی طرح سنسکرت اور فارسی کے الفاظ میں سمجھو۔
جوغ اور یوغ۔ خاص فارسی لفظ ہیں۔ ہل کی لکڑی کو کہتے ہیں، جو بیلوں کی گردن پر رکھتے ہیں۔ سنسکرت میں جوغ کو یوکتر योक्त्र کہتے ہیں اور یہی ادل بدل ہُوا ہو گیا۔ ایک ہی گھر کے لفظ ہیں۔ غیر ملکوں میں جاکر آوازیں بدل گئیں۔
جو۔ فارسی میں مشہور غلہ ہے۔ سنسکرت میں یو यव کہتے ہیں۔
جوان۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں یُوا युवा ہے اور یَون यौवन جوانی کو کہتے ہیں۔ بھاشا میں جوبن ہو گیا۔

ف۔ آریا۔ اریا۔ ارین۔ ایران۔ جو مختلف زبانوں میں مختلف زبانوں پر آواز دیتے چلے آتے ہیں۔ شاستر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ متبرک قوم ہندُستان میں پہنچی تو اس

کی آبادی سے یہاں کا ملک ہماچل سے بندھیاچل تک آریہ ورت کہلاتا تھا۔اس نے غیر قوموں سے امتیاز جتانے کو آرج اپنا نام رکھا اور غیر قوموں کو انارج کہتے تھے۔وہی آریا اور اَن آریا ہوگئے اور شاید اناڑی جو بمعنی نادان و بے ہنر اور بے تمیز ہے وہ بھی اَن آریا ہو۔لطف یہ ہے کہ فارس کی کتبِ قدیمہ میں بھی ایرین یا ایران کے معنی شریف۔دانا اور ہنر مند تھے۔

ج اور چ کی قرابتِ قریبہ خود ظاہر ہے۔

جَندال۔ فارسی میں گروہ بیہودہ اور پواچ وارزل اور شراب خوار کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ایک کمینہ فرقہ کا نام چنڈال चण्डाल ہے۔وہ لوگ پہلے اکثر شراب کھینچتے تھے۔ بعضے سور چراتے تھے اور اُدر اسی قسم کے ذلیل کام کرتے تھے۔

پنج۔ فارسی میں پانچ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پنچ पञ्च کہتے ہیں۔

مگرمچھ۔ فارسی میں وہی آبی جانور ہے۔جسے سنسکرت میں مکرمتسیہ मकरमत्स्य کہتے ہیں۔

خ

خاک ہند میں یہ آواز نہیں۔دیکھو فارسی کی خ ہندیوں کی زبان پر ک۔ کھ ہو جاتی ہے۔فارسی میں بھی اکثر حرفوں سے بدلتی ہے۔انہی میں سے مفصلہ ذیل ہیں :

س سے مثلاً۔شناخت سے شناسد۔

ش سے مثلاً افراختن سے افراشد۔فراخیدن سے فراشیدن (رونگٹے کھڑے ہونا)۔

ک سے مثلاً۔خمان سے کمان۔خمند سے کمند۔

ہ سے مثلاً۔خاگ سے ہاگ (انڈا)۔

جب اپنے گھر میں حروف مذکورہ سے اس کی آواز بدلتی ہے تو ہند میں آکر بدل جانے کا کیا تعجب ہے۔اسی واسطے جہاں سنسکرت اور فارسی کے دو لفظ آج غیر معلوم ہوتے ہیں اور خ کو حروفِ مذکورہ میں سے کسی حرف کے ساتھ بدلنے سے متحد ہو جاتے ہیں تو عجب نہیں کہ اصل میں دونوں ایک ہی ہوں۔ زمانہ کے انقلاب سے ایک گھر کے رہنے والے مسافت ملکی اور مسافت زمانی میں کہیں کے کہیں جا پڑے۔ سب باتیں بدلیں اس کی آواز بھی بدل گئی۔ پھر زمانے گزر گئے، پشتیں پلٹ گئیں۔لوگوں نے جانا دو لفظ غیر ہیں۔

فارسی کی خ سنسکرت میں کبھی س کی آواز دیتی ہے۔

خور۔ فارسی میں آفتاب کو کہتے ہیں۔ اسی کو سنسکرت میں سور सूर کہتے ہیں۔ فارسی قدیم میں جو ہُور ہے، وہ اصل میں ژند کا لفظ ہے۔

خواب۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں سوپن स्वप्न کہتے ہیں اور سُواپ स्वाप کے بھی معنی یہی ہیں۔

خواہر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں سوسری स्वसृ کہتے ہیں۔

خوش۔ فارسی میں بمعنی خوب آتا ہے۔ مثلاً خوش آواز۔ خوشبو وغیرہ وغیرہ۔ سنسکرت میں سو सु حرف ہے کہ دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر خوبی کے ساتھ اسم صفت بناتا ہے۔ چنانچہ سناد सुनाद خوش آواز۔ سگندھ सुगंध خوشبو کو کہتے ہیں اور سُشٹو सुष्टु خوب اسم صفت ہے۔ دوسرے اسم کے ساتھ ملنے کی ضرورت نہیں۔ فقط ب کی کمی زیادتی ہے اور اس قدر انقلابوں اور مدتوں کے بعد اتنا تغیر کچھ بڑی بات نہیں۔

خود۔ فارسی میں آپ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں स्व بمعنی خود ہے اور یہ لفظ اپنے اصل پر ہوتا ہے۔ یعنی اشتقاق یا ترکیب کے اثر سے پاک ہوتا ہے تو سوت स्वत تلفظ میں آتا ہے۔ ت۔ د۔ ہمسایہ ہیں۔ مبادلہ ہو گیا۔

خوے۔ فارسی میں پسینہ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سُوید स्वेद کہتے ہیں اور بموجب سنسکرت کے قواعد کے یہ 'د' آدھی ہے، پوری نہیں۔ ایرانی پلاؤ خور ہو گئے۔ ان کی زبان بیچاری دال کو کیا سمجھتی تھی اڑا دیا۔

خُسر۔ فارسی میں سُسرے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سُوسُرُ स्वसृ اور شوسر शुसर کہتے ہیں۔

سنسکرت میں کبھی ش کی آواز دیتی ہے

خوب۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شبھ शुभ کہتے ہیں۔

خون۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شون शोण سرخ اور۔ شونت शोणित لہو ہے۔

خوک۔ فارسی میں سؤر کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شوکر शूक کہتے ہیں۔ سنسکرت کی ر فارسی میں اکثر اڑ جاتی ہے۔ (دیکھو صفحہ 69)

خشک۔ فارسی ہے اور ششک سنسکرت ہے۔ اتنی کسر ہے کہ ششک ष سے لکھا جاتا ہے۔ شاید کسی پرانے زمانے میں یہ اختلاف تحریر نہ ہو۔

سنسکرت میں کبھی ک یا کھ کی آواز دیتی ہے

خاشہ۔خاشاک۔ فارسی ہے۔'اک' نسبت کا یازائد ہو! اصل خاشہ ہوگا۔گھاس پھوس کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کشا कुशा ہے۔خ کے بعد جو الف مدہ ہے، گر پڑا، یا فارسی میں زیادہ ہوگیا۔ اخیر کی 'ہ' اور 'ا' کا مبادلہ کچھ بڑی بات نہیں۔ہائے مختفی فقط زیر کے ظاہر کرنے کو لگاتے ہیں۔ خود کچھ چیز نہیں۔

خر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کھر खर کہتے ہیں۔

خم اور خنب فارسی میں مٹکے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کُنبھ कुम्भ ہے (دیکھو صفحہ 35-81-82)

چرخ۔فارسی ہے۔پلٹ کر چخر اور بدل کر چکر चक हو گیا۔

خشخاش۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کھس کھس खसखस اور کھس تل खसतिल کہتے ہیں۔

شاخ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شاکھا शाखा ہے

ناخن۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں نکھ नख کہتے ہیں۔ن کی زیادتی محاورہ میں عام ہے۔ (دیکھو صفحہ 81)

سخت۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شکت शक्त طاقت کو کہتے ہیں۔ سخت چیز خود طاقت دار ہوتی ہے اور طاقت چاہتی ہے۔ عجب نہیں کہ لفظ ایک ہو۔معنوں میں مجاز نے تبدیلی کردی ہو۔

دشخوار۔ فارسی میں دشوار ہے۔ سنسکرت میں دشکر दुष्कर کہتے ہیں۔

سنسکرت میں کبھی 'ہ' سے بدل جاتی ہے

دختر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں دہتری दुहितृ کہتے ہیں۔ایک یورپین محقق لکھتے ہیں کہ یہ سنسکرت میں مشتق ہے، اُس دُہ दुह سے جس کے معنی ہیں دودھ دُہنا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عہد قدیم میں ناکتخدا بیٹیوں کا کام اپنے گھروں میں دودھ دُہنا ہوگا، اس لیے دُہتری کہتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ فارسی میں بھی دوختن بمعنی دوشیدن ہے اور اسی سے دختر ہے اور دوشیزہ فارسی میں دختر بکر کو کہتے ہیں۔ یہ بھی دوشیدن (دودھ دُہنا) سے مشتق ہے۔خان آرزو کہتے ہیں کہ ابتدا میں دوشیزہ چھوٹی لڑکی کو کہتے تھے جسے دوش پر لیے پھرتے تھے۔ پھر عموماً دختر کو دوشیزہ کہنے لگے۔ پھر دختر بکر کے لیے خاص ہوگیا۔ ہزاروں برس کی باتیں ہیں خدا جانے

اصلیت کیا ہے۔ سند ایک کے پاس بھی نہیں۔

ف۔ دیکھو! انگریزی میں سپنسٹر (spinster) کے معنی ہیں کاتنا۔ عہدِ قدیم میں یورپ کے اکثر شہروں میں بن بیاہی لڑکیاں گھروں میں بیٹھی کاتا کرتی تھیں اس لیے لڑکی کو سپنسٹر (spinster) کہتے تھے۔ وہی نام اب تک چلا آتا ہے۔

خواندن سے خواں (پکارنا) فارسی ہے۔ سنسکرت میں وہان आव्हान بلانا ہے اور صیغہ مضارع خواہد۔ سنسکرت میں ہوایت हुयत۔

خرامیدن۔ خرام۔ فارسی میں رفتارِ ناز کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کرم करम دھاتو ہے اور وہی معنی ہیں۔

خریدن۔ خر۔ فارسی میں مول لینا ہے۔ سنسکرت میں کریہ कय خریدنے کو کہتے ہیں۔

د

قربِ مخرج اور موافقت طبعی کے سبب سے چند حرفوں کے ساتھ فارسی میں بھی آواز ملاتی ہے۔ چنانچہ کبھی ت سے بدل جاتی ہے۔ جیسے درّاج سے تّراج اور کدخدا سے کتخدا۔ کبھی گ سے اور یہی طبیعت سنسکرت کے لفظوں میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔

اندر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں انتر अतर ہے۔

ایدر۔ فارسی میں اِدھر یا یہاں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اتّر अत्र کہتے ہیں

(دیکھو فصل الف متحرک صفحہ 56)

زاد۔ زاد بوم (یعنی پیدائش) فارسی ہے۔ سنسکرت میں جات जाति ہے۔ عربی میں ذات شے، نفس شے۔ اس صورت میں پہلوی سے پہلو ملتا ہے۔

بادام۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں باتام बाताम ہے۔

باد۔ فارسی میں ہوا ہے۔ سنسکرت میں وات वात ہے۔

بدست۔ فارسی میں بالشت کو کہتے ہیں سنسکرت میں وتستِ वितस्ति ہے۔

مادر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت ماتری मातृ ہے۔

مردہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت۔ مرت मृत اور مرتک मृतक ہے (ہ۔ ک۔ کا تعلق۔ دیکھو صفحہ 85)۔

بید۔ فارسی میں مشہور لکڑی ہے۔ سنسکرت میں ویتر वेत्र کہتے ہیں۔(و۔ کا حذف دیکھو صفحہ 85)
پدر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں پتری पितृ ہے۔
دند۔ فارسی میں دانت کو کہتے ہیں۔ پھر واحد متروک ہو گیا۔ اب واحد جمع سب کو دندان کہنے لگے۔ سنسکرت میں دنت दन्त ہے۔
سرد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شرد शरद یا شرت शरत کہتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ عربی میں شتا موسم سرما ہے۔
سد۔ فارسی میں عدد 100 ہے۔ سنسکرت میں شت शत ہے۔
پود۔ فارسی میں بانے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بیوتی व्यूति بانا ہے۔

کبھی ج سے بدل جاتی ہے

داماد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں جاماتری जामातृ ہے (دیکھو بیان حذف اور ی دیکھو صفحہ 97)

کبھی گ سے بدل جاتی ہے

اژدر۔ فارسی میں بڑے سانپ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اجگر अजगर کہتے ہیں۔

دھ

فارسی کی زبان میں یہ حرف بھی نہیں۔ جہاں ہوتا ہے، خالص دال کی آواز دیتا ہے۔

مثلاً :

بند۔ فارسی میں گرہ اور رسّی وغیرہ باندھنے کی چیز کو کہتے ہیں۔ کیونکہ بستن سے حاصل مصدر ہے اور مجازاً قید کو بھی کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بندھ बन्ध اسی مآخذ سے ہے اور یہی معنی ہیں (دیکھو صفحہ 58)
دُود۔ فارسی میں دھوئیں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں یہی دھوم धूम ہے۔
دیر۔ فارسی میں زود کی ضد ہے۔ سنسکرت میں دھیر धीर متحمل آدمی کو کہتے ہیں۔ دھیریہ धैर्य دیر اور توقف کرنے کو کہتے ہیں۔
گندِش۔ فارسی میں گندھک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گندھک गंधक ہے۔
گندم۔ فارسی میں غلّہ ہے جس کی ہم تم روٹیاں کھاتے ہیں۔ سنسکرت میں گودھوم गोधम ہے۔

دایہ۔ فارسی میں اس عورت کو کہتے ہیں جو کسی کے بچّہ کو دودھ پلائے۔ سنسکرت میں دھا
धाय ہے۔

ڈ

خاکِ فارس اور عرب سے اس کی طبیعت موافق نہیں۔ اس لیے ہمیشہ خالص دال کی
آواز دیتا ہے۔

آدَہْ۔ فارسی میں اس لکڑی کو کہتے ہیں، جس پر پرند جانوروں کو بٹھاتے ہیں۔ سنسکرت میں اڈّہ
अड्डा کہتے ہیں۔

دول۔ فارسی میں یہی چیز ہے، جس سے پانی کنوئیں سے کھینچتے ہیں۔ ہندستان میں ڈول
کہتے ہیں۔ مگر ہندی بھاشا ہے سنسکرت نہیں اور لطف یہ ہے کہ عربی کا دلو صاف ڈول کا
مقلوب ہے۔

ڈھ

حرفِ اوّل کا بھائی ہے۔

دَہُل۔ فارسی میں ڈھول ढोल کو کہتے ہیں۔ مگر یہ ہندی بھاشا ہے۔ سنسکرت نہیں اور غور کرو
تو طبل۔ تول۔ دول۔ دہل۔ ڈھول سب ایک ہیں۔ عرب اور فارس جاکر مسافروں کی آواز
بدل گئی۔

ر

فارسی میں بھی اکثر قریب المخرج حرفوں کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ اُنھی میں سے یہ
ہے کہ کبھی ن سے مبادلہ ہوتا ہے۔ مثلاً استوار۔ استوان۔ کبھی ل سے جیسے سوفار۔ سوفال۔
کبھی زیادہ ہو جاتی ہے، کبھی گر پڑتی ہے جیسے کابک، کاوک، کاورک، یاگرسنہ اور گشنہ۔ کبھی ہ سے
جیسے آسر اور آسہ۔ جوتی ہوئی زمین۔ اسی مناسبت سے سنسکرت میں آواز بدلے تو تعجب نہ کرنا
چاہیے۔

آغاز۔ سنسکرت میں اگر अग्र ہے۔ ر۔ الف ہوگئی۔ ز زیادہ ہوگئی۔ (دیکھو صفحہ 58 و 78)

تار۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں تان तान اور تنتو तन्तु ہے اور اسی سے ہے تانا۔
پور۔ فارسی میں بیٹے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پتر पुत्र اور پوہ पूः بھی آیا ہے۔
تارک۔ فارسی میں تالو کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں وہی تالو तालु ہے۔

کبھی فارسی میں نہیں ہوتی، سنسکرت میں ہوتی ہے۔

کافور۔ سنسکرت میں کرپور कर्पूर ہے۔
شغال اور شگال۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شری گال श्रगाल ہے۔
تشنہ۔ فارسی میں پیاسا ہے۔ سنسکرت میں ترشنا तृष्णा تشنگی کو کہتے ہیں۔
ادرک۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں آدرک आर्द्रक کہتے ہیں۔
شکر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شرکرا शर्करा کہتے ہیں۔
آک۔ یہی درخت جنگلی ہے۔ جس کا دودھ کیمیا گر لیتے پھرتے ہیں۔ سنسکرت میں آرک کہتے ہیں۔
اشک۔ فارسی میں آنسو کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اشرو अश्रु کہتے ہیں۔
گام۔ فارسی میں گاؤں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گرام ग्राम کہتے ہیں۔ یہی برج بھاشا میں گاؤں ہو گیا۔

پیمانہ۔ فارسی میں ماپ کے باسن کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پرمان परिमाण کہتے ہیں۔

کبھی فارسی میں ہوتی ہے سنسکرت میں نہیں ہوتی

کبوتر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کپوت कपोत ہے۔
کرباس۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کپاس कपास کہتے ہیں۔ (دیکھو فصل پ صفحہ 60)

ز

مناسبتِ مزاج اسے اپنے گھر میں بھی چند حرفوں کے ساتھ مبادلہ پر آمادہ کرتی ہے۔ ایک اُن میں سے ج ہے۔ مثلاً روز۔ روج۔ دوسرا چ۔ جیسے پزشک۔ پچشک۔ کبھی ک۔ مثلاً مزیدن۔ مکیدن۔ کبھی ہ۔ جیسے بازو۔ باہو۔ کوزپشت۔ کوہ پشت۔ کبھی ے۔ جیسے آواز۔ آوازے۔

خاکِ ہند میں ز کی آواز بالکل نہیں نکلتی۔ ہمیشہ ج کی آواز بدل کر بولتی ہے۔

کبھی کبھی چ۔ گھ۔ ہ۔ے بھی۔

روز۔ روج۔ فارسی میں دن ہے اور آفتاب کو بھی کہتے ہیں۔ سنسکرت میں روچی रोचि روشنی کو کہتے ہیں۔ شاید مجازاً دن کو کہنے لگے۔

ارز۔ جو بمعنی قیمت و قدر ہے۔ فارسی میں بھی ارج ہے اور اسی سے ارجمند ہو گیا۔ سنسکرت میں ارج अर्ज قدر و قیمت اور رتبہ و منزلت ہے۔

زبان۔ فارسی ہے۔ یہی سنسکرت میں جِھا जिब्हा ہے۔

زانو۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں جانو जानु ہے۔

زاد۔ جات (دیکھو فصل دال صفحہ 66)۔

زلواور زلوک۔ فارسی میں جونک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں جلوکا जलोका ہے۔

زمین۔ فارسی کے اہلِ لغت کہتے ہیں کہ زم سردی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ اسی سے ہے۔ موسم زمستان۔ چونکہ جوہر ارض ٹھنڈا ہے۔ اس لیے اس کا نام زمین رکھا ہے۔ سنسکرت میں جما जमा زمین کو کہتے ہیں۔ جما जमा کو جنم जन्म سے مشتق سمجھا ہے کہ کل مخلوقات کا جنم یعنی پیدائش اسی سے ہے۔

کوز۔ فارسی میں کبڑے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کبجا कुब्जा کہتے ہیں۔ وہی خراب ہو کر ہندی میں کبڑا ہو گیا۔

مازو۔ ایک چھوٹا سا پھل ہے کہ سرو کے پھل سے مشابہ ہوتا ہے۔ ہندستان سیاہی اور بعض سیاہ رنگوں میں پڑتا ہے۔ سنسکرت میں اسے ماجو پھل माजूफल کہتے ہیں۔

زن۔ فارسی میں عورت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں جنی जननी عورت کو کہتے ہیں (یعنی جننے والی)۔

زنجبیل۔ یعنی سونٹھ کو سنسکرت میں شرنگ بیر ऋगबीर کہتے ہیں۔ شرنگ शृग شاخ ہے اور بیر बीर خشک۔ سوکھی سوکھی شاخیں ہوتی ہیں اس لیے یہ نام پایا۔ مگر یہ اتحاد اُن دو لفظوں کا نہیں جو ایک گھر کی آواز تھی۔ سونٹھ ہندستان کی پیداوار دوا ہے۔ طبابت اور تجارت کی وکالت سے عرب میں پہنچی۔ ان کی زبان نے اپنی طبیعت کے بموجب حرفوں پر اثر کیا۔ جسے تعریب کہتے ہیں۔

زیرہ۔ مشہور دوا ہے۔ سنسکرت میں جیر जीर یا جیرک जीरक کہتے ہیں۔

تیز۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں تیکشن तीक्ष्णा ہے اور اس وقت क्ष کشا اپنی پوری آواز دے رہا ہے۔ وہ کئی آوازیں رکھتا ہے (دیکھو صفحہ 77)۔

کیا عجب ہے کہ اصل زبان میں ایک وقت فقط ش یا ک کی آواز سے یعنی تیشن یا تیکن بولا جاتا ہو۔ن۔ دونوں زبانوں میں اکثر گر پڑتا ہے۔جب تیش یا تیک ہوا تو تم جانتے ہو کہ ش اور۔ک۔ز۔ سے بدل جاتے ہیں۔کیا عجب ہے کہ اس طرح تیز ہو گیا ہو۔

بوز۔ فارسی ہے۔ بکری کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بوج बोज بکری یا اترے ہوئے بکرے کو کہتے ہیں۔

کبھی چ سے بدل جاتی ہے

سوزن۔ فارسی میں سوئی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سوچی सूची کہتے ہیں۔

کبھی گھ سے بدل جاتی ہے

دراز۔ فارسی میں لمبے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دیرگھ दीर्घ ہے۔

ہ سے بھی بدل جاتی ہے

زر۔ فارسی میں سونا ہے۔ سنسکرت میں ہرن हिरणा سونے کو کہتے ہیں۔ مگرن اصلی نہیں ہے۔ہ اور۔ز۔ کا مبادلہ عام ہے۔چنانچہ فارسی میں زدن کا امر ہے۔

زن۔ سنسکرت ہے۔ ہن، हन۔اسی قاعدہ سے ہر हर کا زر بن گیا۔

ے سے بھی بدل جاتی ہے

نزد۔ فارسی میں نزدیک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں نید नेद کے یہی معنی ہیں۔

فارسی کی 'ز' سنسکرت میں 'ہ' ہو جاتی ہے

بازو اور باہو۔ دونوں فارسی لفظ ہیں۔ کیونکہ ان کے ہاں خود۔ز۔ہ۔ کا مبادلہ ہو جاتا ہے۔ دیکھو سنسکرت میں اسے باہو बाहू ہی کہتے ہیں۔

ژ

ز کی بہن ہے۔ خاص فارس کی آواز ہے۔ عرب ہند وغیرہ اکثر ملکوں میں نہیں۔ اپنے گھر میں بھی کبھی کبھی بعض حرفوں کی آواز میں بولتی ہے۔ مثلاً فازہ۔ فاژہ۔ فاجہ (جمائی)۔ کژ۔کج۔ نژند۔ نجند (غمگین)۔اب سنسکرت میں دیکھو :

اژدہا۔ فارسی میں بڑے سانپ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اہی دشک अहिदशाक ہے۔ اہی अहि سانپ کو کہتے ہیں۔ دشک दशाक کاٹنے والا۔ ز۔ کا مبادلہ 'ہ' کے ساتھ دونوں زبانوں میں

عام ہے۔ ہی زیادہ ہو گئی۔ ش۔ س ہو کر 'ہ' سے بدل گئی۔ کاف 'ہ' سے بدل گیا (دیکھو فصل ک صفحہ 79 و فصل ہ صفحہ 84)۔

اژدر۔ وہی اژدہا ہے۔ سنسکرت میں اجگر अजगर ہے (دیکھو فصل دال صفحہ 67)

اَنکس۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں اَنکش अकुश ہے۔ جس سے ہاتھی کو ہولتے ہیں۔

س

قرب مخرج کے سبب سے فارسی میں بھی چند حرفوں کے مبادلہ پر زبان کو مائل کرتا ہے۔ ان میں سے ہے ج۔ ریواس۔ ریواج۔ ریباس۔ ایک جنگلی روئیدگی ہے۔ چ۔ جیسے خروس۔ خروچ۔ باغسہ۔ باغچہ (اہل شیراز صحن کو کہتے ہیں اور وہاں ہر ایک شخص کے گھر میں صحن اور صحن میں چمن ہوتے ہیں)۔ د۔ جیسے پاس۔ پاد (حفاظت۔ اور اسی سے ہے پادشاہ)۔ ش۔ جیسے گستی۔ گشتی (کستن۔ کوفتن۔ پہلوان بھی آپس میں ٹھونکتے پیٹتے ہیں، اس لیے کشتی پہلوانی ہو گئی) فرستہ۔ فرشتہ (فرستادۂ خدا ہوتا ہے)۔ اس مزاج نے سنسکرت اور فارسی کے الفاظ میں بھی مبادلہ پر مائل کیا ہوگا۔

راست۔ فارسی میں کج کی ضد ہے۔ سنسکرت میں رِجُو ऋजु سیدھے اور آسان کو کہتے ہیں۔ وہی ژند میں رز ہے۔ دیکھو۔ ج۔ ز۔ س۔ سب قریب المخرج ہیں۔ سنسکرت میں اسی سے ہے رجسٹ ऋजष्ट نکلا۔ یعنی بہت سیدھا اور نہایت آسان۔ ٹ فارسی میں ت ہو جاتی ہے۔ عجب نہیں کہ راست اور رجسٹ کی اصل ایک ہی ہو۔

سایہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں چھایا छाया ہے۔

ش کی مثالیں دیکھو

اسپ۔ فارسی میں گھوڑے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اشو अश्व ہے۔ واو۔ ب۔ سے بدل کر پ ہو گیا۔

باش۔ فارسی میں فعل ہے اور سکونت کے معنی دیتا ہے۔ سنسکرت میں باس बास کے وہی معنی ہوتے ہیں۔

گیسو۔ فارسی میں ان بالوں کو کہتے ہیں جو زلف سے مقدار اور درازی میں زیادہ ہوتے ہیں اور ایک سرا کانوں کے اوپر نکالتے ہیں۔ سنسکرت میں کیش केश عموماً بالوں کو کہتے ہیں۔

ایاس۔ اہلِ خراسان شبنم کو ایاس کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اوشائے उषा اور اُوش उवष آخر شب کو کہتے ہیں اور۔ اُش उष وہ جو کہ آخر شب میں واقع ہو۔ شبنم آخر شب میں پڑتی ہے۔ اس لیے یہ نام پڑ گیا۔ اسی رعایت سے فارسی میں شبنم نام پایا ہے۔ یہی اوش بگڑ کر برج بھاشا میں اوس ہو گیا۔

سر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شرس शिरष کہتے ہیں۔ اخیر کا 'س' اڑ جاتا ہے 'ہ' پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت شرہ शिर کہتے ہیں۔ دیکھو وہی س ہ کا مبادلہ ہے۔

سرد۔ فارسی ہے۔ مقابلِ گرم۔ سنسکرت میں شرت शरत ہے اور۔ شرد शरद بھی کہتے ہیں۔

سرون۔ فارسی میں سینگ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شرنگ श्रृंग ہے۔

سُرین۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شرونی श्रोणी۔

سریر۔ فارسی قدیم میں جسم اور کالبد کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شریر शरीर ہے۔

سدٔ۔ وہی 100 کا عدد ہے۔ جسے اب صد لکھتے ہیں۔ سنسکرت میں شت शत ہے۔

مگس۔ فارسی میں مکھی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں مکشیکا मक्षिका کہتے ہیں۔ دیکھو क्ष میں ش۔ کا اثر موجود ہے۔ مگر آواز۔ س۔ کی دی۔

سنگ۔ فارسی میں پتھر کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شان शाण کہتے ہیں۔

کبھی و سے بدل جاتا ہے

ساں۔ فارسی میں مشابہت کے لیے ہے۔ سنسکرت میں وان वान بمعنی مشابہ ہے۔

س گر بھی پڑتا ہے

دشستہ۔ محسوس چیز۔ دشستہا۔ محسوسات۔ فارسی قدیم کا علمی لفظ ہے۔ سنسکرت میں درشٹ दृष्ट جو چیز دیکھنے میں محسوس ہو۔ کیونکہ درشٹی दृष्टि نظر کو کہتے ہیں۔

'ز' کا حال تم دیکھ چکے

مست۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں مدّ मद اور متّ मत्त کہتے ہیں۔

ش

فارسی میں قربِ مخرج کے سبب سے کئی حرفوں کے ساتھ مبادلہ قبول کرتا ہے۔ ان میں سے ہے چ۔ جیسے کاچی، کاشی اور چاچی، شاشی اور لچہ، لخشہ۔ کبھی س سے بدل جاتا ہے۔

جیسے شارک۔ سارک (مینا)

آتش۔ الف ممدودہ کے فصل میں لکھا گیا ہے کہ ہتاشن سے اس کا اتحاد ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سنسکرت میں تیج بمعنی شعلہ، روشنی، حرارت وغیرہ ہے۔ پس تیج اور تمش۔ متحد، تمش پر الف ممدودہ زائد ہو کر آتمش ہو گیا۔ پھر آتمش کم اور آتش عام مستعمل ہو گیا ہے یا سنسکرت میں پہلے جا کر آتیج اور پھر تیج ہو گیا ہو۔

سنسکرت میں فارسی کا ش کبھی چ اور کبھی چھ کی آواز دیتا ہے۔

کشف۔ فارسی میں کچھوے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کچھ چپ कच्छप کچھوا ہے۔

شاطر۔ کیا عجب ہے کہ چتر चतुर سے نکلا ہو۔ جس طرح شطرنج چترنگ चतुरंग سے بنی۔ اسی طرح چاتر سے شاطر بن گیا۔

کبھی س کی آواز دیتا ہے

شام۔ سنسکرت میں سانم सानम کہتے ہیں۔

شنا۔ فارسی میں تیرنے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سنان स्नान فقط نہانا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جو تیرے گا وہ پہلے نہائے گا (دیکھو بہارِ عجم)

نوشادر۔ سنسکرت میں نرسار नरसार ہے۔

آشتی۔ فارسی میں صلح کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں آسکتی आसक्ति میلان اور ملنے کی خواہش کو کہتے ہیں۔

کبھی ک سے آواز بدلتا ہے

گندش۔ فارسی میں گندھک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گندھک गंधक ہے۔

مبادلۂ ش کے اصولِ خاص

سنسکرت میں 3 حرف ہیں کہ ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ ش کی آواز دیتے ہیں۔

اوّل श کہ خالص 'ش' کی آواز دیتا ہے۔

(2) ष ش کے قریب قریب ایک آواز دیتا ہے کہ کچھ 'ژ' کچھ 'ی' کی آواز سے ملتی ہے اور پہلے ایک ہوا 'ک' کی بھی آتی ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر کش اور ایک موقع پر کھیا کی آواز بھی دے جاتا

ہے۔ مثلاً :

برشا۔ برکھا वर्षा بارش۔

شٹرس۔ کھٹرس षटरस شٹرس۔ بھوجن۔ چھ مزے والی چیز۔

مکش۔ منش۔ منکھ मनुष्य آدمی۔

اس قسم کے الفاظ ہندُستان کے مختلف شہروں میں مختلف تلفظ سے بولے جاتے ہیں اور بجائے خود ہر ایک صحیح ہے۔ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ اس حرف میں تینوں آوازوں کا مادّہ ہے اور جب کسی لفظ میں ہوتا ہے تو دو دو تین تین آوازوں سے بولا جاتا ہے۔ پس جب ایک سنسکرت لفظ میں ہے اور 'ش' کی آواز دے رہا ہے اور فارسی میں وہی لفظ ہے۔ مگر 'ش' کی جگہ 'ک' کی آواز آتی ہے تو اس حرف کے اختلاف سے لفظ کو غیر نہ سمجھو۔ ष اپنے گھر میں کئی آوازیں بدلتا ہے۔ غیر ملک میں جاکر آواز بدل گئی ہو تو تعجب کیا ہے۔

(3) بعض موقع پر اسی 'ش' ष میں 'ک' کی آواز ملی ہوتی ہے تب اس کی صورت میں ذراسی تبدیلی ہو جاتی ہے क्ष پھر یہی چار آوازوں کا کام دے جاتا ہے۔ کش۔ کھیا۔ چھ اور کبھی خالص 'ش'

چنانچہ :

لکشمی	لکھیمی	لچھمی	लक्ष्मी	دولت	بدھیاوان لوگ چھ سے نہیں
دکشنا	دکھینا	دچھنا	दक्षिणा	خیرات	بولتے مگر اس سے اتنا معلوم
لکش	لکھیے	ـ	लक्ष्य	نشان والا	ہوگیا کہ اس کے مزاج میں
رکشیا	رکھیا	ـ	रक्षा	حفاظت	چھ کی طرف میلان ہے۔
بھکش	ـ	ـ	भक्ष्य	خوراک	
ـ	ـ	لکھے	लक्ष	لاکھ رقم اعدادی	
شیا	ـ		क्षया	رات	

یہ الفاظ مختلف شہر ہائے ہندُستان میں الگ الگ تلفظ سے بولے جاتے ہیں اور اس سے سمجھا جاتا ہے کہ حرف مذکور میں بھی تینوں آوازوں کی طاقت ہے۔

دیکھو ष والے لفظ فارسی میں کیسی کیسی آوازیں بدلتے ہیں :

بارش۔ فارسی میں باریدن سے حاصل مصدر ہے۔ سنسکرت میں برشا (برکھا) वर्षा ہے۔

بَرَسات۔ فارسی میں یہی موسم کا نام ہے۔ سنسکرت میں برشارت वर्षाऋतु ش۔ س کا مبادلہ بمقتضائے طبیعت عام ہے۔ اس لیے برساہوا۔ 'ر' بہہ گئی برسات رہ گئی۔

برشکال۔ فارسی میں وہی موسم ہے۔ سنسکرت میں برش۔ بارش اور کال۔ وقت ہے۔ اس واسطے برشاکال वर्षाकाल بارش کا موسم۔

خُشک۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں شُشک शुष्क ہے شु میں 'ک' کا اثر ہے۔ فارسی میں 'ک' ہمیشہ 'خ' کی آواز دیتا ہے۔ انقلابِ زمانہ اور انقلابِ وطن سے اُلٹ کر اوّل کُشک۔ بعد اس کے خشک ہو گیا۔

تشنہ۔ فارسی میں پیاسے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ترشنا तृष्णा خواہش اور ہوس ہے اور ترشا اور ترکھا तृषा پیاس کو کہتے ہیں۔

خاشہ اور خاشاک۔ فارسی میں گھاس پھوس کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کُشا कुषा ہے۔

اشک۔ فارسی میں آنسو کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اشرو अश्रु کہتے ہیں 'ر' گر پڑی۔ دیکھو فصل 'ر' صفحہ 69)۔

انوشہ۔ فارسی میں خوش۔ خوشا۔ خورم۔ شاہ نوجوان۔ آفرین۔ بارک اللہ ہے۔ سنسکرت میں انوکھا अणोषा خوب۔ عمدہ اور اچھی چیز کو کہتے ہیں۔

کبھی سنسکرت میں 'ش' کی آواز دیتا ہے۔ فارسی میں 'س' کی آواز دیتا ہے

ستوسر اور ستوسہ۔ فارسی میں چھینک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شوتھ क्षुवथु کہتے ہیں۔ شتھو۔ ستو ہو گیا۔ مگر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ سر فارس میں جاکر بڑھ گیا ہے یا اصل میں سر تھا سنسکرت میں کٹ گیا ہے۔

کبھی فارسی میں ک۔ ش کے عوض گ۔ س کی آواز دیتا ہے۔

مگس۔ (دیکھو فصل۔ س۔ صفحہ 73)۔

بخش۔ فارسی میں کسی چیز کے بخرہ اور حصہ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پکش पक्ष حصہ اور مقدار کو کہتے ہیں۔ 'پ' نے فارسی میں جاکر 'ب' کی آواز پیدا کی۔ 'ک' نے 'خ' کی جون بدلی۔ اس طرح بخش ہو گیا ہوگا اور شاید جو سنسکرت میں بھاگ भाग ہے۔ وہ فارسی میں بخش ہو (دیکھو فصل 'بھ' صفحہ 59)۔

فارسی میں کبھی فقط 'ش' کی آواز دیتا ہے

شیر۔ جو فارسی میں دودھ ہے۔ سنسکرت میں کشیر क्षीर پڑھتے اور لکھتے ہیں۔

شہد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کشودر क्षौद्र کہتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ سنسکرت کی 'ر' کو تم

جانتے ہی ہوا کثر فارسی میں گر پڑتی ہے۔

کشا کو دیکھو فارسی میں کیسی کیسی آوازیں بدلتا ہے

کبھی تو اپنی اصلی آواز یعنی ک۔ش کا حق ادا کرتا ہے

کِشت۔ فارسی میں کھیتی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کشت क्षित कہتے ہیں۔ وہی بھاشا میں کھیت ہوگیا۔ ہندُستان میں آکر یہ آواز بدلی۔ وہاں وہ بدل گئی ہوگی۔ تعجب کیا ہے۔

کِش۔ فارسی میں بغل اور پہلو کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اسی کو ککشی कुक्षी کہتے ہیں۔ یہی بھاشا میں بگڑ کر کوکھ कोख ہوگیا۔ لطف یہ ہے کہ اسی کو عربی میں کشح کہتے ہیں۔

کاہ۔ فارسی میں گھاس کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ککش कक्ष ہے۔ وہی تلفظ میں کُکھ ہوگیا اور فارسی میں آکر کک بن گیا۔ پھر 'ک' اور 'ہ' کا مبادلہ عام ہے جیسے آملک اور آملہ وغیرہ۔ اس لیے کہہ ہوا۔ بعد اس کے الف مدّہ بڑھ کر 'کاہ' ہوگیا ہوگا۔

تاک۔ سنسکرت میں دراکشا द्राक्षा ہے (دیکھو فصل 'ت' صفحہ 61۔ اور ک صفحہ 80)

غ

یہ آواز اہل ہند کے منہ اور گلے سے بالکل مخالف ہے۔ تم خود خیال کر کے سنو۔ جن اشخاص کے لب و لہجہ کو تعلیم نے تربیت نہیں کیا۔ اُن کی زبان سے 'غ' کی جگہ 'گ' نکلتا ہے۔ جب فارسی کے اکثر 'غ' والے لفظ خود فارسی میں 'گ' کی بھی آواز دیتے ہیں تو طبیب زبان سمجھ گیا کہ دونوں کا مزاج یکساں ہے۔ اُس نے یہ بھی دیکھا کہ اکثر الفاظ سنسکرت کے ایسے ہیں کہ ان میں 'گ' موجود ہے۔ لیکن جب اسے 'غ' سے بدلتے ہیں تو فارسی لفظ سے مطابق ہو جاتا ہے۔ یا بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ دونوں کی اصل ایک تھی۔ اختلافِ ملک نے آواز بدل دی۔

داغ۔ آگ سے جل کر جو نشان پڑ جائے۔ یا عام نشان کو فارسی میں داغ کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں داگھ दाघ ہے۔

کلاغ۔ فارسی میں کوّے کو کہتے ہیں وہی سنسکرت میں کاگ काग ہے۔ فارسی میں کوّے کی اواز کو کاغ کاغ بولتے ہیں۔

شغال اور شگال۔ فارسی میں گیدڑ کو کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں شریگال श्रृगाल ہے۔

میغ۔ فارسی میں ابر کو کہتے ہیں۔وہی سنسکرت میں میگھ मेघ ہے۔
آغاز۔ (دیکھو صفحہ 58۔ الف ممدودہ)۔
آروغ۔ فارسی میں ڈکار کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اُدگار उदगाार کہتے ہیں۔

ف

زبانِ فارس کا جوہر ہے۔ ہندستان میں نہیں ملتا۔ جب چاہو سُن لو۔ اس کی جگہ زبانوں سے 'پ' نکلتا ہے۔ بلکہ حرف مذکور اپنے گھر میں بھی اکثر 'پ' کی آواز میں بولتا ہے۔ جب ہم فارسی میں سفید اور سپید۔ فرمودن اور پرمودن کو ایک لفظ سمجھتے ہیں تو سنسکرت اور فارسی کے دو لفظوں کو ایسے اختلاف کے سبب سے غیر کیوں سمجھیں۔

سرشف۔ فارسی میں سرسوں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سرشپ सर्शप کہتے ہیں۔
فرمان۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں پرمان प्रमाणा سند کو کہتے ہیں۔
افیون۔ ابیون۔ پپیون۔ فارسی ہیں۔ سنسکرت میں آہی پھن अहिफन کہتے ہیں۔ آہی अहि سانپ اور پھن फन جھاگ झाग یہ بھی درخت خشخاش سے جھاگ کی صورت میں نکلتی ہے۔ رنگ بھی کالا ہے اور بیہوشی بھی کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ نام پایا۔
آفت۔ ظاہر میں عربی لفظ ہے اور سنسکرت میں آپت आपत ہے۔ در حقیقت عربی نہیں۔ فارسی قدیم یا پہلوی میں آ کفت تھا۔ عرب میں جا کر آفت اور عاتہ ہو گیا۔ دیکھو فارس میں اصل لفظ مر گیا۔ عرب سے نئی زندگی پا کر آیا اور 12 سو برس ہوئے۔ اب تک زندہ ہے۔
(دیکھو فصل ک، صفحہ 80)۔
فرتاب۔ فارسی میں فر و شکوہ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پرتاپ प्रताप جاہ و جلال۔ اقبال اور قہر و غضب کو کہتے ہیں۔
فرشاد۔ فارسی قدیم میں تحفہ۔ نذرانہ۔ تبرک کو کہتے تھے۔ سنسکرت میں پرساد प्रसाद ۔
فساں اور افساں وہی چیز ہے جس پر تلوار، چھری، چاقو تیز کرتے ہیں۔ سنسکرت میں پاشان पाषाणा کہتے ہیں۔
کافور۔ کو سنسکرت میں کرپور कर्पूर کہتے ہیں۔
کف۔ فارسی میں جھاگ کو کہتے ہیں۔ ٹیک چند بہار کہتے ہیں کہ کپھ कफ سنسکرت میں مادّہ بلغم

کو کہتے ہیں اور اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ جھاگ ہوتا ہے۔ عجب نہیں کہ دونوں اصل میں ایک ہوں۔
کشف۔ کچھوا۔ سنسکرت میں کچھ چپ कच्छप کہتے ہیں (دیکھو فصل 'ش' صفحہ 74)۔
نیلوفر۔ کو سنسکرت میں نیلوت پل नीलोत्पल کہتے ہیں (دیکھو صفحہ 19)۔
کبھی سنسکرت کا 'بھ' فارسی میں 'ف' کی آواز سے بولتا ہے۔
ناف۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں نابھی नाभि کہتے ہیں۔

ق

عرب کا حرف ہے۔ ہندستان کی خاک میں یہ آواز نہیں۔ سنسکرت کا 'ک' والا لفظ عربی زبان لوگوں کی زبان پر آجائے تو 'ق' سے بدل لیتے ہیں۔
مقیش۔ اصل میں سنسکرت کا لفظ ہے۔ میکش کیش मयष केश اس میں میکش मयष سورج کی کرن ہے اور کیش केश بال۔ دونوں مل کر موے شعاعی ہوگئے۔ تعجب ہے محقق ہند صاحب بہارِ عجم سے کہ اسے عربی کا لفظ مان کر کہتے ہیں کہ مقیش ہے۔ لیکن یہ نہیں لکھتے کہ عربی میں اس کا مآخذ اور اصل کیا ہے۔ صاحبِ غیاث اللغات اس کا حوالہ دیتے ہیں اور توضیح میں اس سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ جب اصل نہیں تو زور کیا چل سکتا ہے۔
آذوقہ۔ عربی لفظ ہے اور کتبِ لغت میں لکھا ہے کہ آب۔ ذقہ سے مرکب ہے مگر ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اجیو کا ہے۔
سرادق۔ عربی لفظ ہے۔ پردہ کو کہتے ہیں۔ مگر سنسکرت میں سراد सराद پردہ کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندی سے معرّب کیا ہے۔

ک

فارسی میں بھی قربِ مخرج چند حروف کے مبادلہ پر مائل کرتا ہے۔ سنسکرت کے لفظوں میں اثر مذکور ظہور کرے تو بیجا نہیں ہے۔ چنانچہ سنسکرت کا 'کھ' فارسی میں 'ک' کی آواز دیتا ہے۔
کان۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کھان खान اور کھنی खनि بھی کہتے ہیں۔
کنج۔ فارسی میں گوشہ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کنج कुज چھائی ہوئی، چھت پٹی ہوئی، رکی

ہوئی اور بند جگہ کو کہتے ہیں۔

تاک۔ سنسکرت میں دراکشا द्राक्षा ہے۔ کشا۔ اپنے گھر میں بھی کبھی کھیا کی آواز دیتا ہے۔ اگر فارسی میں 'ک' ہو گیا تو کچھ تعجب نہیں۔

کاہ۔ سنسکرت میں ککش कक्ष ہے۔ (دیکھو بیان کشا क्ष صفحہ 77)۔

کبھی سنسکرت میں 'ک' ہوتا ہے۔ فارسی میں گر پڑتا ہے

موش۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں موشک मूषक کہتے ہیں۔ زبانِ مذکور میں موش मूष چور کو کہتے ہیں۔ چوہا بڑا چوٹا جانور ہے۔ اس لیے یہ نام پایا۔ سنسکرت کا 'ک' خصوصیت وصفی پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے گندھک गंधक میں۔

نال۔ فارسی میں نرسل۔ نالی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں نالک नालक کہتے ہیں۔

آکفت۔ فارسی میں بمعنی آفت تھا۔ سنسکرت میں آپت आपत ہے۔ ک یا اصل میں تھا، سنسکرت میں ضائع ہوا۔ یا اصل میں نہ تھا، فارسی میں زیادہ ہو گیا۔ (دیکھو فصل 'ف' صفحہ 78)

بتو۔ بتہ۔ فارسی میں خشکی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھکت भक्त ہے (دیکھو فصل بھ۔ صفحہ 60)

گ

بموجب بیان ہائے مذکورہ بالا کے سنسکرت کا 'گھ' فارسی میں 'گ' خالص کی آواز دیتا ہے۔

گرم۔ فارسی میں اسم صفت ہے۔ سنسکرت میں گھرم घर्म بمعنی گرمی ہے۔ برج میں اسی نے آواز بدلی۔ گھام घाम ہو گیا۔

گیسو۔ فارسی ہے سنسکرت میں کیش केश ہے (دیکھو فصل ش۔ صفحہ 72)۔

مگس۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں مکشیکا मक्षिका ہے (دیکھو فصل س۔ صفحہ 73)

انگو۔ انکش (دیکھو فصل ژ۔ صفحہ 72)۔

کبھی سنسکرت کا 'ک'۔ فارسی میں 'گ' بولا جاتا ہے

شگون۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شکن शकुन کہتے ہیں۔

ل

تلفّظ کے حق میں ملائم اور صاف حرف ہے۔ قُربِ مخرج اور مناسبت طبع اسے 'ر' کے ساتھ ہم آواز کرتی ہے۔

پالان۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں پریان पर्यान اور پلیان पल्यान بھی کہتے ہیں۔

م

قُربِ مخرج اور ہمسائگی کے اثر سے چند حرفوں کے ساتھ فارسی میں مبادلہ پر آمادہ رہتی ہے۔ اِن میں سے ہے ن جیسے جِیم سے جِیْن اور بام سے بان۔

اس میں ن غنہ کا بھی مادّہ ہے۔ چنانچہ جب ن کے بعد ب آتی ہے تو م کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جیسے گنبد۔ گمبد۔ جنبش میں 'م' کی آواز ہے۔ لکھنے میں ن آتا ہے۔ دُم کی اصل دُنب تھی اور یہی اثر ہے کہ دھوم سنسکرت کا لفظ بگڑ کر برج بھاشا میں دھواں ہو گیا (دیکھو فصل ن کی تمہید)۔

خم اور خُسب۔ فارسی میں مٹکے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کنبھ कुंभ ہے۔

شام۔ فارسی میں دن کے کنارہ کو کہتے ہیں، جو رات سے ملتا ہے۔ سنسکرت میں سائے साय لکھتے ہیں اور سائنگ کہتے ہیں۔ اہل دکن پنڈت سائم کہتے ہیں۔ شاید فارس میں جا کر شام ہو گیا ہو، یا کوئی اور ایسا لفظ ہو کہ یہاں آکر سائنگ ہوا۔ فارس میں شام ہوا۔ دکن میں سائم کہلایا اور اس میں تو شک نہیں کہ श اکثر 'ش' کی آواز دے جاتا ہے۔(دیکھو فصل ن میں دش صفحہ 82)۔

کم۔ فارسی میں زیادہ کی ضد ہے۔ سنسکرت میں کن कणा ریزہ کو کہتے ہیں۔

گرم سوت۔ فارسی میں اس کپڑے کو کہتے ہیں جس میں سوت ریشم ملا ہوا ہو۔ سنسکرت میں گربھ سوتر गर्भसूत्र کہتے ہیں۔ (دیکھو فصل 'ر' میں حذف 'ر' کی مثالیں صفحہ 68)

ن

فارسی میں اس حرف کی آوازیں عجب رنگ دکھاتی ہیں۔ دیکھو جن یا جان میں، جبکہ ن کو ظاہر کر کے بولیں تو ایک آواز ہے۔ لیکن جب جان میں غنہ بولیں تو کچھ اور آواز ہے۔

جنگ میں کچھ اور رنگ ہے اور جب 'ن' ساکن کے بعد 'ب' آجائے تو خاصی 'م' کی آواز ہوتی ہے۔ انتہا ہے کہ خنب کا خم (مٹکا) بن گیا اور اب خنب کوئی جانتا بھی نہیں۔ اسی طرح دُنب کی دُم رہ گئی اور دُنب کوئی پہچانتا بھی نہیں۔ مگر سمجھنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ یہی پھیل کر دُنبہ ہو گئی ہے۔ (دیکھو فصل م کی تمہید صفحہ 81)

ستنبہ بوزن شکنبہ۔ فارسی میں بدشکل آدمی اور ہیبت ناک اور ڈراؤنی چیز کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ستمبہ स्तमभ اُس دُور کی چیز کو کہتے ہیں کہ نظر تو آئے، مگر نہ معلوم ہو کہ کیا ہے اور اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے سہارے سے اَدر چیز کھڑی ہو اور سخت اور قوی ہیکل آدمی کو اور میل کو بھی کہتے ہیں، جو نشانِ راہ کے لیے بناتے ہیں اور ستنب स्तभ بھی انھی معنوں میں آیا ہے۔

ریسماں۔ دیکھو فصل ے۔ صفحہ 87)۔

کبھی سنسکرت میں ہوتا ہے۔ فارسی میں نہیں ہوتا

دوش۔ فارسی میں کندھے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دوشن दोषण کہتے ہیں۔

کام۔ فارسی میں مقصد و مراد کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کامنا कामना کہتے ہیں یا یہ کہو کہ جو کام سنسکرت میں ایک مقصد نفسانی ہے، وہ اب فارسی میں عام مقصد کے لیے بولتے ہیں۔

ہشت۔ فارسی ہے۔ سنسکرت اشٹن अष्ट ہے۔

پُر۔ فارسی میں خالی کی ضد ہے۔ سنسکرت میں پُورن पूर्णा ہے۔

دُش۔ فارسی قدیم میں بمعنی بدی تھا۔ اسی سے ہے دشمن۔ دشنام۔ سنسکرت میں دوش दोष دوشہ یا دوشن दोषन عیب ہے۔

کبھی سنسکرت میں نہیں ہوتا فارسی میں ہوتا ہے

مہمان۔ فارسی ہے اور اہل لغت کہتے ہیں کہ مہِ بمعنی سردار اور مان حرف تشبیہ ہے (یعنی بزرگ وار)۔ ٹیک چند بہار کہتے ہیں کہ سنسکرت میں مَہما महिमा بمعنی تعظیم و توقیر ہے اور کبھی تعریف کے موقع پر بھی آتا ہے۔ چونکہ مہمان کی تعظیم و توقیر ہر قوم اور ہر ملک میں رسم عام ہے۔ عجب نہیں کہ مہمان کے لیے مستعمل ہو گیا ہو۔

و

قرب مخرج زبانِ فارسی میں بھی اسے بعض حرفوں کی طرف کھینچتا ہے۔ یہی اثر

سنسکرت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر ب کے ساتھ بدلا جاتا ہے۔

کوز۔ فارسی میں کبڑے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کبجا कुब्जा کہتے ہیں (دیکھو فصل ب)

کبھی 'ک' سے آواز بدلتا ہے

ہستو۔ فارسی میں بمعنی معترف واقراری ہے۔ مرکب ہے 'ہست'۔ 'و' سے یعنی تمھاری بات پر ہاں اور درست ہے۔ کہنے والا گویا ہست میں 'و' نے فاعلیت کے معنی پیدا کیے ہیں۔ سنسکرت میں آستک आस्तिक اقراری کو کہتے ہیں۔

نستوہ اور نستو۔ فارسی میں لڑاک۔ بداعمال۔ جھگڑالو آدمی کو کہتے ہیں اور امر تحقیقی وہی ہے کہ ن نفی کا ہے۔ اس لیے ہستو۔ اقراری۔ نستو بمعنی منکر ہے جھگڑالو آدمی بات کو نہیں مانتا۔ ہر دلیل کی نفی کرتا ہے۔ اس لیے اسے نستوہ یا نستو کہتے ہوں گے۔ سنسکرت میں ناستک नास्तिक بمعنی منکر ہے اور یہی سبب ہے کہ دہریہ منکرِ الٰہی کو ناستک کہتے ہیں۔

کبھی ے کی آواز دیتی ہے

سرون۔ فارسی میں سینگ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شرینگ शृंग کہتے ہیں

کبھی سنسکرت میں 'و' ہوتا ہے، فارسی میں نہیں ہوتا

جی۔ زبانِ ژند میں بمعنی پاک و پاکیزہ تھا۔ اس واسطے تعظیم کے لیے آتا تھا۔ سنسکرت میں جیو जीव روح کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ روح سے زیادہ کیا چیز پاکیزہ ہو سکتی ہے! غالباً اصلیت دونوں کی ایک ہو گی۔

در۔ دروازہ۔ فارسی ہے سنسکرت میں دوار द्वार کہتے ہیں۔

گری۔ فارسی میں گلے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گریو ग्रीवा کہتے ہیں۔ اسی سے ہے گریبان۔

پُر۔ فارسی ہے۔ خالی کی ضد۔ سنسکرت میں پورن पूर्णा کہتے ہیں۔

تن۔ فارسی ہے۔ ترجمۂ بدن۔ سنسکرت میں تنو तनू کہتے ہیں۔

گلو۔ فارسی میں گلے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گولو गोलव کہتے ہیں۔

ماست۔ فارسی میں دہی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں مستو मस्तु بلوئے ہوئے دہی کو کہتے ہیں۔

دش۔ فارسی میں دوشہ یا دوش दोष بمعنی عیب و بدی (دیکھو صفحہ 82)۔

کبھی سنسکرت میں نہیں ہوتا، فارسی میں ہوتا ہے

گیسو۔ سنسکرت میں کیس ہے (دیکھو فصل۔ گ۔ صفحہ 80)۔

پُور۔ بمعنی پسر۔ سنسکرت میں پتر ہے۔ (دیکھو فصل ت۔ صفحہ 61)۔

ہ

قرب مخرج اور مناسبت طبعی فارسی میں بھی اکثر حرفوں کے ساتھ مبادلہ پر آمادہ کرتی ہے۔ان میں سے ہے الف۔ جیسے ہیچ۔ ایچ۔ ہنگام۔ انگام۔ کبھی س سے۔ جیسے راہ۔ راس۔ کبھی ک سے جیسے پوتہ۔ پوتک (خزانہ) اور پروانہ۔ پروانک۔ کبھی ے سے جیسے راہگاں۔ رایگاں۔

یہی مناسبت طبع ہے کہ فارسی اور سنسکرت کے الفاظ میں بھی اکثر حرفوں سے آواز بدلتی ہے۔

فارسی کی ہ سنسکرت میں کبھی الف کی آواز دیتی ہے

ہرپاسپ۔ فارسی میں سیارۂ آسمانی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں آربشی उर्वशी اندر دیوتا کے ایک مصاحب کا نام ہے۔اُر उर بمعنی بزرگ۔بشی वुशी عزم و آہنگ۔

ہشت۔عدد 8۔ سنسکرت میں اشٹ अष्ट کہتے ہیں۔

ہستہ۔ (دیکھو استہ فصل الف۔ صفحہ 56)۔

ہویدا۔ فارسی ہے۔وہی سنسکرت میں ادے उदय ہے۔

ہکچہ۔ہلک۔ ہکہ۔ فارسی میں ہچکی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ہکّا हिक्का وہی ہے۔

فارسی کی ہ سنسکرت میں کبھی س کی آواز دیتی ہے

ہُور۔ فارسی ہے۔ آفتاب کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سوریے सूर्य्य کو کہتے ہیں۔

ماہ۔ فارسی میں چاند کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ماس मास مہینے کو کہتے ہیں اور یہ فرق بہت خفیف ہے۔ برہان میں لکھا ہے کہ ماس بمعنی ماہ ہے معلوم نہیں کس زبان کا لغت ہے۔

گیاہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں گھاس घास کہتے ہیں۔

ہفت۔ فارسی میں عدد 7 ہے۔ سنسکرت میں سپت सप्त کہتے ہیں۔

نہ۔ فارسی میں حرفِ نفی ہے۔ سنسکرت میں نِس निस اور नि: اور न ہے۔فارسی قدیم میں نیا اور ژند میں نید ہے۔

ہم۔ فارسی میں بمعنی ہمدگر ہے اور فارسی قدیم اور ژند میں بھی یہی معنی تھے۔ سنسکرت میں سم सम بمعنی باہم ہے۔

سنسکرت میں کبھی ش کی آواز دیتی ہے

کروہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کروش कोश کہتے ہیں۔ یہی خراب ہو کر کوس ہو گیا۔

دہ۔ فارسی میں 10 ہے۔ سنسکرت میں دش दश کہتے ہیں۔

سنسکرت میں ک کی بھی آواز دیتی ہے

آملہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں آملک आमलक کہتے ہیں۔

مردہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں مرتک मृतक اور مرت मृत بھی کہتے ہیں۔

(دیکھو فصل دال صفحہ 66)

زیرہ۔ (دیکھو فصل ز صفحہ 70)۔

کاہ۔ (دیکھو فصل ک صفحہ 80)۔

سنسکر میں کبھی 'و' کی آواز دیتی ہے

رجہ۔ فارسی میں الگنی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں رجو रज्जु رسّی کو کہتے ہیں۔

شہد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کشودر क्षौद्र کہتے ہیں۔ क्ष کبھی فقط ش کی آواز بھی دیتا ہے یافارس میں جاکر ک گر پڑا ہو۔ رسنسکرت میں اکثر زائد ہوتی ہے۔ (دیکھو فصل ر صفحہ 68)

پیہ۔ فارسی میں چربی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پیور पीवर اور پین पीन کہتے ہیں۔

نہ۔ فارسی میں 9 کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں نو नव ہے۔

سنسکرت میں کبھی ے کی آواز دیتی ہے

آہن۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں آیس अयस کہتے ہیں۔ س۔ ہ۔ سے بدل گئی۔ ی کی جگہ ن آگیا ہے اور پھر قلب ہو گیا ہے۔ زمانہ کی طول مدّت اور زبانوں کے انقلاب کس نے دیکھے۔ دونوں لفظوں کا کچھ نہ کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے۔

کبھی فارسی میں ہوتی ہے۔ سنسکرت میں نہیں ہوتی

ہَوَا۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں ہ۔ محذوف ہے۔ وایو वायु کہتے ہیں۔ اخیر میں و زیادہ ہو گیا۔

انگارہ۔ فارسی میں آگ کے ڈلے کو کہتے ہیں۔ اسی کو سنسکرت میں انگار अगार کہتے ہیں۔

گریوہ۔ فارسی میں پشتے اور چھوٹی پہاڑی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گرایو गिर پہاڑ کو کہتے ہیں۔

کبھی فارسی میں نہیں ہوتی۔ سنسکرت میں ہوتی ہے

نَے۔ فارسی میں نلی یانرسل کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں نیہو नेहु کہتے ہیں۔

ی

قرب مخرج کے سبب سے فارسی میں بھی کئی حرفوں کے ساتھ ہم آوازی کرتا ہے۔
ان میں سے ہے ج۔ چنانچہ جوغ۔ یوغ وغیرہ بہت سے الفاظ فارسی میں بھی ج اور ی دونوں حرفوں سے بولے جاتے ہیں۔ کبھی ہ سے جیسے رونده۔ روہنده۔ خوے۔ خوه (پسینہ)۔ اگر یہی میل طبیعت سنسکرت میں بھی ظہور کرتا ہے تو بیجا نہیں۔

یوغ۔ (دیکھو فصل ج۔ صفحہ 62)۔

یار۔ فارسی میں عموماً رفیق اور دوست کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں جار जार عورت کے یار کو کہتے ہیں۔ اُس کی بنیاد دوستیِ خبث پر ہے۔

پاے۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں پاد पाद کہتے ہیں اور اسی سے ہے پادک पादक جو فارسی میں پاےک ہے اور مخفف اس کا پیک اور پاے بند۔ سنسکرت میں ہے پادوندھ पादवध۔

کبھی فارسی کی ے سنسکرت میں و ہوتی ہے

بیو۔ فارسی میں دلہن کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اسے بدھو वधू کہتے ہیں۔ وہی اُول بدل کر برج بھاشا میں बहू بہو ہو گئی۔

بیوه۔ (دیکھو فصل ب۔ صفحہ 58)۔

مے۔ فارسی میں شراب ہے۔ سنسکرت میں مدّ मद्य اور مدھو मधु کہتے ہیں۔
(دیکھو فصل س صفحہ 72)۔

کبھی سنسکرت میں ہوتی ہے۔ فارسی میں نہیں ہوتی

کار۔ فارسی میں کردن سے حاصل مصدر ہے۔ سنسکرت میں کاریے कार्य्य اور کرم कर्म بھی کہتے ہیں اور اصل وہی ہے کہ افعال اور ان کے مشتقات ان دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔

گرِہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں گرہ गृह کہتے ہیں۔

کرم۔ فارسی میں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کرمی कृमि کہتے ہیں۔

ہوا۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں وایو वायु کہتے ہیں۔

ف۔ فارسی لفظوں کے اخیر میں جو 'ی' الف مدّہ کے بعد لکھی نظر آتی ہے کبھی تلفظ میں آتی ہے، کبھی نہیں آتی مگر اضافت اور صفت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اکثر محقق کہتے ہیں کہ

وہ 'ی' اصلی ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ زائد ہے۔ "اضافت اور صفت کی حالت میں اظہار حرکت کے لیے لکھ دیتے ہیں۔" جو اصلی سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر جزوِ لفظ نہ تھی، تو، پایہ، پایک، پیک، پایدار وغیرہ الفاظ میں کہاں سے پیدا ہو گئی اور سنسکرت کے الفاظ اُن کی تائید کرتے ہیں۔ دیکھ لو پاے کی 'ے' دال سے بدلی ہوئی ہے۔ ہوائے کی 'ے' کو تم نے خود دیکھ لیا۔ یہ بھی سنسکرت میں جزوِ لفظ ہے۔

کبھی فارسی میں ہوتی ہے۔ سنسکرت میں نہیں ہوتی۔

ریشم۔ ریشہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں رشمی रशिम تار، ریشہ، رگ وغیرہ کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے سورج کی کرن کو اور کبھی باگ اور باگ ڈور کو بھی کہتے ہیں اور عجب نہیں کہ ریشم بھی اسی سے نکلا ہو اور ہو سکتا ہے کہ ریسمان کا رشتہ بھی اُس سے جا ملتا ہو۔

فائدہ۔ عزیزانِ وطن! تم نے یہ قاعدہ دیکھ لیا کہ اہلِ تحقیق نے مختلف زبانوں کو سمجھ سوچ کر
3 حلقوں میں تقسیم کیا ہے اور اصل اصول اس میں یہ رکھا ہے کہ جو ایک حلقہ کی زبانیں ہوں گی، اُنھیں کے الفاظ باہم ملتے جلتے اور آپس میں مشابہ ہوں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ ایرین کے حلقہ کی ایک زبان ہو اور اُس کے الفاظ غیر حلقہ کی کسی زبان کے الفاظ سے مشابہ ہو جائیں۔ لیکن میں تمھیں اس مقام پر اکثر الفاظ ایسے بھی سناتا ہوں کہ ظاہر میں عربی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں اور اسی واسطے انھیں سیمیٹک کے دائرہ سے باہر نہ ہونا چاہیے تھا باوجود اس کے وہی لفظ سنسکرت میں موجود ہیں۔ جو کہ خاص ایرین زبان ہے۔ یہ اتفاقی اتفاق ہے۔

ذات۔ عربی لفظ ہے۔ سنسکرت میں جات जाति انہی معنوں میں موجود ہے۔ مگر یہ اصل میں زاد کا مبدل ہے۔ (دیکھو فصل د۔ صفحہ 66)۔

دینار۔ عربی میں سونے کے سکے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دینار दीनार انھی معنوں میں موجود ہے اور اس کا کچھ تعجب نہیں۔ یہ اصل میں فارسی قدیم کا لفظ ہے جس طرح ایک سکہ لین دین میں فارس سے عرب میں پہنچا۔ اسی طرح ہندستان میں بھی آ گیا۔

ارم۔ عربی میں باغِ شدّاد کا نام ہے۔ سنسکرت میں آرام आराम عیش باغ کو کہتے ہیں۔

اوج۔ عرب میں بمعنی بلندی ہے۔ سنسکرت میں اوچ उच्च کے یہی معنی ہیں شاید پہلوی ہو۔ جس کا پہلو عرب سے ملتا ہے اور عجب نہیں کہ سنسکرت اور نجوم کی وکالت سے ہند کا مسافر عرب میں جا پہنچا ہو۔

شک۔ عربی میں یہی لفظ ہے جسے ہم تم شک و شبہ کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اصلی لفظ شک शाक ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا ماخذ ہے کہ اس کے مشتقات میں ن زیادہ ہو جاتا ہے۔ انھی میں سے ہے شنک शाक جو کہ بھاشا کے محاورہ میں بھی بولا جاتا ہے۔

ناد۔ ندا۔ عربی لفظ ہے۔ اصلی آواز کا عکس جو کہ پہاڑ یا عالیشان مکانوں سے پلٹ کر آئے۔ سنسکرت میں ناد नाद بمعنی آواز ہے۔

بدن۔ عربی ہے۔ سنسکرت میں بدن बदन سر د چہرہ کو کہتے ہیں۔

صبح۔ عربی ہے۔ شُوۂ शवह سنسکرت ہے۔

قبر۔ عربی ہے۔ سنسکرت میں स्वभ्र سُوَبھر ہے۔

دوا۔ عربی ہے۔ سنسکرت میں دوَا दुवा کے یہی معنی ہیں۔

افعال

عزیزانِ وطن! تم جانتے ہو کہ سنسکرت کا جو کچھ رشتہ ہے، ژند کے ساتھ ہے۔ جو کہ ایک زمانہ میں فارس کی زبانوں پر خدائی سلطنت کرتی تھی۔ فارسی موجودہ وہاں کے ایک قطعہ کی پراکرت (عوام کی بولی) ہے۔ جیسے تمھارے ہاں برج بھاشا۔ باوجود اس کے دونوں کے فعل اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ اگر کوئی دونوں زبانوں کا ماہر مطابقت کرنے بیٹھے تو شاید چند فعل کا اختلاف رہ جائے۔ تم ضرور کہو گے کہ سنسکرت میں 24 صیغے ہیں اور فارسی موجودہ میں 6۔ میرے دوستو یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ پراکرت بولیوں میں زیادہ باریکیاں نہیں ہوتیں اور رشتہ ان دونوں کا واسطہ در واسطہ ہے۔ وہ بھی سیکڑوں برس دور جا پڑا۔ پھر بھی صیغوں کی ساخت اور صورت میں دیکھو، کس قدر ملتے ہیں۔

ہست	ہستند	ہستی	ہستید
استی अस्ति	ستہ स्ता	ہسی हसी	ستھ स्थ
	ہستم	ہستیم	
	ہسمی हस्मि	سمہ स्म	

بود	**بودند**	**بودی**	**بودید**
भवति بھوتی	भवन्ति بھونتی	भवसि بھوسی	भवथ بھوتہ
	بودم	**بودیم**	
	भवामि بھوامی	भवाम: بھوامہ	

یہاں پھر جتانا واجب ہے کہ است کو جو خاص و عام کتابوں میں حرف ربط لکھتے ہیں سنسکرت میں استی अस्ति بمعنی ہستن ہے اور انگلستان اور جرمن کے محقق کہتے ہیں کہ اعت ماضی کا صیغہ ہے استن سے۔ انگریزی میں اس کی جگہ ہے۔ is اِز۔ دیکھو اگرچہ 'ز' کی آواز دیتا ہے مگر s سے لکھا جاتا ہے اور وہاں بھی فعل سمجھا جاتا ہے۔ لاطینی میں ایست، یونانی میں ایست ہے۔ المانی میں است استعمال کرتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں فارس کے عربی دانوں کی بے پروائی سے حرف لکھا گیا اور اسی طرح کتابوں میں درج ہوتا چلا آیا۔ پھر کسی نے خیال نہ کیا۔ حقیقت میں فعل ہے کیونکہ تمام اوصاف و خواص فعل کے ہیں۔

(1) ضمائر فاعلی کو دیکھو۔ باوجودیکہ فارسی مروّج علمی زبان نہیں پھر بھی کس قدر سنسکرت سے مشابہ ہیں۔

اوداد۔ सोऽददत् سودَدَت۔ اگر 'ہ' کو بموجب رواج مندرجہ کے گرادو تو صاف او ہے۔

آنہادادند तेऽददन् تےدَدَن

تودادی त्वमदद: توم اَدَدہ تھے۔ توانک کا مختصر تو ہے۔

شمادادید यूयमददत् یوئن اَددتِ۔ ء اور ش قریب المخرج ہیں۔ ن غنہ اکثر میم ہوجاتا ہے۔ گھٹ بڑھ کر شما ہو گیا ہوگا۔ دیکھ لو ضمائر مفعولی میں بشما ہو گیا ہے۔

من دادم अहमदद اَہَن اددم

مادادیم वयंपददाम: ویم اَوَدَامَہ

(2) ضمائر مفعولی کو دیکھو:

اوراداد तंअददत् تن اَددت

آنہارادار तानअददन् تان اددن

تراداد त्वामअददः توأم أدَدَہْ

شمارادار युष्मान् अददत یشمان اددت

مرادار मांअदद مام اددت

مارادار अस्मान अददामः اسمان اددامہ

(3) حالتِ خبری

ایں پنڈت است अयं पंडितोऽस्ति اَیَم پنڈ توستی

اِنہا پنڈ تانند इमे पंडितोसन्ति اے پنڈ توسنتی

تو پنڈت ہستی त्वपंडितोऽसि توأم پنڈ توسی

شما پنڈت ہستید यूयं पंडितोऽस्थ یویم پنڈ توستھ

من پنڈتم अंह पंडितो स्मि اہم پنڈ توسمی

ماپنڈ تانیم वंय पंडितोऽस्मः ویم پنڈ توسمہ

(4) حالتِ اضافی کو دیکھو :

کارِ اُو तस्य कार्य्यम् تسی کاریم

کارِ آنہا ते षाम्कार्य्यम् تے شام کاریم

کارِ تو तव कार्य्यं توکاریم

کارِ شما युष्मा ककार्य्यं یشماکم کاریم

کارِ من मम कार्य्यं مم کاریم

کارِ ما अस्मा कम कार्य्यं اسماکم کاریم

جس طرح دونوں زبانوں میں ترکیبیں فعل کی اور حالتیں متعلقاتِ فعل کی ملتی جلتی ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل بیان نہ کروں گا۔ کیونکہ میں اور میرے ہمزبان دونوں سنسکرت سے کم واقف ہیں۔ البتہ فارسی کے مختلف مصدروں کے فعل اور ان کے مقابل میں سنسکرت کے فعل دکھاؤں گا۔ دیکھو کیسے ملتے ہوئے ہیں۔ یہ پہلے سن لو کہ فارسی کے ہر مصدر یا اُس کے ہر صیغہ کو سنسکرت میں ڈھونڈو گے تو پتہ نہ لگے گا۔ اکثر فارسی کا مضارع سنسکرت کے لنک लुङ्ग से ملتا ہوگا۔ اب چند مثالیں سنیے :

استادن۔ ستادن سے ایستد۔ سنسکرت میں ستھا स्था: صیغۂ حال ہے

ستودن۔۔ ستاید स्तौति ستوتی۔ صیغۂ حال ہے۔

فتادن۔ فتد۔ سنسکرت میں پتتی पतति صیغۂ حال ہے

آمدن۔ آید۔ سنسکرت میں آیاتی आयाति حال ہے۔

باریدن۔ بارش۔ سنسکرت میں ورشتی वर्षति صیغۂ حال ہے۔ ورش वृष ہے

بردن۔ برد۔ سنسکرت میں بھرتی भर्ति حال ہے۔

بستن بندد۔ سنسکرت میں بندھن बन्धन باندھنا बन्धति بندھتی۔ حال ہے۔ बध بندھ۔ بندھا ہوا۔

پزیدن۔ پزد۔ سنسکرت میں پچتی पचति حال ہے

رسیدن۔ رسد۔ پرسری प्रसृ پہنچنا पर्सति پرسرتی۔ صیغۂ حال ہے۔ پ یا تو اصلی تھا، فارس میں جاکر فرسودہ ہو گیا۔ یا اصل میں نہ تھا، سنسکرت میں زیادہ ہو گیا۔

تپیدن۔ تپ۔ سنسکرت میں تپْ तप گرم ہونا۔ چمکنا جلنا ہے तपति تپتی حال ہے۔

تابیدن۔ تاب۔ سنسکرت میں تاب ताव گرمی، روشنی ہے۔ तावयति تاب یتی حال ہے۔

چشیدن۔ چشد۔ سنسکرت میں چش चशू بمعنی چشیدن۔ اَچو شیت अचौशीत چشد یا مے چشد۔

بخشیدن۔ بخشد۔ بخش۔ سنسکرت میں बखश ۔

دادن۔ دہد۔ سنسکرت میں دَدَتی ददति ۔

دانستن۔ سنسکرت میں دو दो یا دا दा بمعنی دانستن ہے۔

دویدن۔ دَوَد۔ دَو۔ سنسکرت میں دو दव دھاوُ घाव بمعنی دویدن ہے۔ घावति دھاوتی حال ہے۔

زدن۔ زند۔ سنسکرت میں ہنتی हन्ति ہے۔ یہ تم جانتے ہو کہ سنسکرت میں ز۔ ہ کا مبادلہ ہو جاتا ہے۔ ژند میں جن بمعنی بزن ہے۔

زادن۔ زاید۔ سنسکرت میں جائتی जायति حال ہے۔

زیستن۔ زید۔ زی۔ سنسکرت میں جِوتی ज्येवति حال ہے۔ जिव جِو جینا۔

شنیدن۔ شنودن۔ شنود۔ سنسکرت میں شرنوتی ऋणोति شنوی ऋणोमि (شنوم)۔

کردن۔ کند۔ کن۔ سنسکرت میں کروتی करोति (کند)۔ کرو कुरू (کن)۔

گرفتن۔ سنسکرت میں گرہ गृह یا गरः بمعنی بگیر گرنہائی गृह्णाति صیغۂ حال ہے۔

گفتن۔ گوید۔ گوے۔ سنسکرت میں گدھیتن गद्यीतं ہے اور گدیتی गद्यति صیغہ حال ہے۔

لیسیدن۔ لیسد۔ سنسکرت میں الیکشت अलेक्षत् حال ہے

مردن۔ میرد۔ سنسکرت میں مریتی मृयति صیغۂ حال اور مرتک मृतक مردہ ہے۔

آہیختن۔ فارسی میں بمعنی کشیدن۔ محاورہ میں تلوار کے لیے خاص ہو گیا۔ آہیختہ مضارع آہتہ۔

اُس کا مخفف کہ کشیدہ شدہ کے معنی بھی دیتا ہے۔ سنسکرت میں ارہتی आर्हति حال ہے۔

آرہت आर्हुत کھینچا گیا۔ 'ر' کا حذف دونوں زبانوں میں آیا ہے۔ دیکھو اب متفق ہو گئے۔

سرشتن۔ سریشد۔ سریش۔ سنسکرت میں سرج सृज دھاتو یعنی ماخذ۔ سرش حاصل مصدر

سرجیب सजीव لنگ ہے۔ س۔ ج کا بدلہ عام ہے۔

پیمودن۔ پیماید۔ پیماے۔ سنسکرت میں ما मा دھاتو۔ ماپتا۔ ماپا گیا मापितः قلب ہو کر دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

مالیدن۔ مالد۔ مال۔ سنسکرت میں مرد मृद् دھاتو۔ مردیت मर्दीत् لنگ۔

دمیدن۔ دمد۔ دم۔ سنسکرت میں دھما ध्मा دھاتو ہے۔ جس کے معنی ہیں پھونکنا۔

تنیدن۔ تند۔ تن۔ سنسکرت میں تن तन दھاتو ہے۔

خرامیدن۔ خرام۔ فارسی میں رفتارِ ناز کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کرم कम دھاتو ہے اور وہی معنی ہیں۔

خریدن۔ خر۔ فارسی میں مول لینا ہے۔ سنسکرت میں کری क्रय خریدنے کو کہتے ہیں۔

جس طرح دونوں زبانوں میں فعل فاعل مفعول وغیرہ کی حالتیں ملتی جلتی ہیں ان کی تفصیل یہاں بیان نہ کروں گا۔ کیونکہ میں اور میرے اکثر ہم زبان سنسکرت میں ایسی مہارت نہیں رکھتے۔ تقریر بجائے لذت کے دقّت پیدا کرے گی۔ اس وقت جو کچھ ہو سکا اسی پر قناعت کرتا ہوں۔ اہلِ ذوق معاف فرمائیں۔

باب حروف

الف

فارسی قدیم میں 'ا' نفی کے معنی پیدا کرتا ہے۔ سنسکرت میں اب تک نفی کے معنی دیتا ہے۔

فارسی قدیم		سنسکرت		
اَجُنبا	بے حرکت	ابھے	अभय	نڈر
اخواستی	بے ارادہ	اَنِت یے	अनित्त्य	بے بقا
اِمیَر	جو کبھی نہ مرے	اَمر	अमर	جو کبھی نہ مرے
		اَجِت	अजित्	جس سے کوئی جیت نہ سکے

ت

ایشیائی زبانوں میں خطاب واحد حاضر کا جوہر اپنی ذات میں رکھتی ہے۔ مثلاً : تم
فارسی میں کہتے ہو تو بودی؟ دانائے ہند کہتا ہے۔ تُوانگ اَبھو त्वअभव
تم کہتے ہو۔ ترا دیدم۔ یا دید مت۔ وہ کہتا ہے۔ تُوں ددرش त्वा ददर्श
تم کہتے ہو غلامِ تو یا غلامت۔ وہ کہتا ہے۔ تُوسیوکہٗ तवसेवक

ج

فارسی قدیم میں نسبت کے معنی پیدا کرتا تھا اور اسی بنیاد پر فریدوں نے ایک بیٹے کا نام رکھا تھا ایرج۔ ایران والا۔ دوسرے کا تورج۔ توران والا۔ سنسکرت میں بھی یہی اثر کرتا ہے۔ چنانچہ نیر नीर پانی کو کہتے ہیں اور اسی واسطے نیلوفر کو کہتے ہیں کہ پانی میں پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح آتمج आत्मज آتما والا۔ لطف یہ ہے کہ فارسی میں آبو گل نیلوفر کو کہتے ہیں۔

کہ

فارسی میں استفہام کے لیے آتا ہے۔ تم کہتے ہو کیستی؟ سنسکرت میں کہتے ہیں کرسی کोसि اور تو کیستی۔ یا کہ گفت بشما۔ وہ کہتا ہے۔ کوسی توَن को सित्वं تُودَن کہ اَکْھت रतीवातज۔

ک

فارسی میں بعض لفظوں کے پیچھے چپک کر نسبت کے اثر سے فاعلیت کے معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً پردک (چیستان کو اس لیے کہا کہ مطلب کی بات پردہ میں ہے)۔ چوشک (ٹونٹی کو اس لیے کہا کہ چوشیدن چوسنے سے مشتق ہے)۔ سنسکرت میں رکشک रक्षक رکھوالی کرنے والا۔ بھکشک भक्षक کھانے والا۔ اشٹک۔ آٹھ عدد والا مجموعہ۔ موشک (دیکھو صفحہ 80)۔ گندھک (خاص قسم کی بو والی چیز)۔

فارسی میں کاف تصغیر کے لیے بھی آتا ہے جیسے کنیزک۔ سیاہک۔ سنسکرت میں بھی یہی معنی پیدا کرتا ہے۔ جیسے بال बाल سے بالک बालक۔

کاف سے پہلے کبھی ن بھی لگا دیتے ہیں جیسے کتھا कथा کہانی۔ کتھانک कथानक چھوٹی کہانی۔

م

متکلم کا جوہر اس کی طبیعت میں ہے۔ تم فارسی میں کہتے ہو۔ بودم۔ دانائے ہند کہتا ہے اَبھوم अभवम्۔ تم کہتے ہو۔ بودیم۔ وہ کہتا ہے اَبھوام अभवाम۔ تم کہتے ہو مرا۔ وہ کہتا ہے مام माम تم کہتے ہو۔ غلامم۔ وہ کہتا ہے۔ مم سیوکھ ममसेवक:۔

فارسی میں فاعل عددی کے معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً یکم۔ دوم۔ سوم وغیرہ۔ سنسکرت میں کہتے ہیں پرتھم प्रथम پنچم पन्चम سپتم सप्तम اشٹم अष्टम نوم नवम دشم दशम اس کے آگے کل اعداد کے ساتھ میم لگتا ہے۔

ن

اپنی طبیعت میں انکار کی تاثیر رکھتا ہے۔ فارسی میں نَ۔ نہ۔ نے عام مستعمل ہیں۔ سنسکرت میں نہ न اور نس निस اور نر निर نفی کے لیے آتے ہیں (باب حروف میں دیکھو 'س' وہی ہے جو فارسی میں 'ہ' ہو جاتی ہے اور 'ر' وہی ہے جو اکثر اڑ جاتی ہے)۔

و

فارسی میں عطف کے لیے آتا ہے۔ سنسکرت میں وا वा حرف تردید کا کام دیتا ہے جس کے لیے اب فارسی میں 'یا' کام دیتا ہے اور غور کرو تو بعض موقع پر حرف تردید بھی عطف کا کام دے جاتا ہے۔ مثلاً تم کہتے ہو۔ ازیاران درانجا شا بودید یا احمد۔ دگر ہیچکس نہ بود (اس کے کیا معنی ہیں؟ یعنی ہمارے یاروں میں وہاں کوئی نہ تھا۔ تم اور احمد تھے)۔

فارسی میں فاعلیت کے معنی بھی پیدا کرتا ہے مثلاً ہندو (ہند کا رہنے والا) ریشو (ڈاڑھی والا)۔ شاشو (مُتوڑا)۔ آبو (گلِ نیلو فر کہ پانی والا ہے) سنسکرت میں۔

ی

فارسی میں نسبت کے معنی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً ایرانی۔ تورانی۔ آبی۔ خاکی۔ سنسکرت میں بھی یہی معنی پیدا کرتی ہے مثلاً کابلی काबुलीय (کابل کا رہنے والا)۔ چینی (چین کا رہنے والا)۔ گُنی गुणी (گُن والا)۔ پکشی पक्षी (پکش یعنی پروں والا)۔ پاپی पापी (پاپ والا)۔ فارسی میں کبھی اس 'ی' کے بعد 'ن' بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ جیسے سیمین۔ آہنیں۔ سنسکرت میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ جیسے گرام سے گرامی ग्रामी اور گرامین ग्रामीण دونوں طرح آتا ہے۔

حروفِ متفرقہ

است۔ جو فارسی میں حرف ربط کہلاتا ہے۔ سنسکرت میں استی असति ہے (دیکھو فصل افعال صفحہ 88)۔ اور فارسی میں کبھی ہےَ بھی اسی موقع پر آتا ہے۔ خواجہ حافظ :

ساقی اگرت ہوائے ماہئے مجز بادہ میار درمیاں شئے

(1) ترکیب مقلوبی۔ فارسی میں عام ہے۔ جیسے علم دوست، خرد دشمن، زہراب، نوشاب۔
اسی طرح سنسکرت میں بھی عام ہے۔ جیسے پریم ساگر प्रेमसागर دھرم مورت धर्ममूरत۔
(2) ترکیب تشبیہی۔ فارسی میں عام ہے۔ آہو چشم۔ گل رخسار۔ اسی طرح سنسکرت میں کمل لوچن कमललोचन مرگ نین मृगनयन چندر مکھ चद्रमुख۔

مند۔ فارسی میں اسم کے ساتھ مل کر معنی صفتی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً ہنر مند۔ خرد مند۔
وند۔ بھی یہی فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً خداوند۔ سنسکرت میں ونت वत کا یہی پھل ہے۔ دھن ونت धनवंत بلونت बलवंत۔

بان کا فارسی میں یہی کام ہے۔ مثلاً جہانبان۔ مہربان۔ پاسبان۔ سنسکرت میں گنوان गुणवान بدھیاوان विद्यावान دھنوان धनवान۔

آن فارسی میں آخر اسم پر جمع کے لیے لگاتے ہیں۔ مثلاً مردان۔ اسپان وغیرہ۔ سنسکرت میں نر नर کی جمع بحالتِ مفعولیت نران नरान ہے۔

ہا۔ فارسی میں حرف جمع ہے۔ سنسکرت میں نر کی جمع نراہ नराः فارسی بولو گے تو نرہا اور مردہا یا مردان کہو گے۔

بر۔ فارسی میں حرف جرّ ہے۔ سنسکرت میں 'پر' اور 'اوپر' उपरि ہے۔

سان اور مان فارسی میں تشبیہ کے لیے ہے۔ مثلاً بسان شیر حملہ آورد۔ شیر ساں نعرہ زد سنسکرت میں سان समान ہے اور سم सम برابر کو کہتے ہیں اور وان वान بمعنی مشابہ بھی ہے۔ چونکہ 'س' اور 'و' کا مبادلہ آیا ہے اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ دونوں ایک ہیں۔ (دیکھو صفحہ 73)۔

سار فارسی میں کثرت مقامی کے لیے آتا ہے۔ شاخسار۔ کوہسار۔ نمکسار۔ سنسکرت ادھک سار अधिकसार ہے۔ ادھک پہاڑی کو کہتے ہیں۔

بار فارسی میں کثرت کے لیے آتا ہے۔ مثلاً رودبار۔ زنگبار۔ اصفہان میں ایک محلہ قدیم کا نام ہے گلبار۔ سنسکرت میں امبوبار अम्बुबार جہاں پانی کی کثرت ہو، پشپ بار पुष्पबार پھلواری۔

بے فارسی اور سنسکرت دونوں جگہ حرف نفی ہے۔ بے بھے बे भय نڈر۔

تر اور ترین فارسی میں تفضیل کے لیے آتے ہیں۔ سنسکرت میں بھی یہی معنی پیدا کرتے ہیں اور وہی 3 درجے پیدا کرتے ہیں۔ خوب۔ خوبتر۔ خوب ترین۔

شبھ	शुभ	شبھ تر	शुभतर	شبھ تم	शुभतम
لگھو (چھوٹا)	लघु	لگھو تر	लघुतर	لگھو تم	लघुतम
شلاگیے (ممدوح)	श्लाघ्य	شلاگیے تر	श्लाघ्यतर	شلاگیے تم	श्लाघ्यतम

نِشتر۔ فارسی کے اہل لغت کہتے ہیں کہ اس کی نیش یعنی نوک تیز ہوتی ہے۔ اس لیے نیشتر اور نشتر کہتے ہیں اور تر میں آبداری کا اشارہ ہے۔ مگر سنسکرت میں نِشِت निशित تیز کو کہتے ہیں۔ اس صورت میں نِشِت تر۔ تیز تر ہو تو بے تکلف معنی نکلتے ہیں۔

مہ۔ فارسی قدیم میں بڑائی کے معنی پیدا کرتا تھا اور اسی سے تھامہ آباد۔ شاہانِ قدیم کا سلسلہ۔ اب تک بھی زبانِ مذکور میں مہِ بمعنی بزرگ ہے اور اسی سے ہے مہتر اور مہتری۔ سنسکرت میں دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر بڑائی کے معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً :

راجہ	राजा	مہاراجہ	महाराजा
جن	जन	مہاجن	महाजन
آتما	आत्मा	مہاتما	महात्मा

کار فارسی میں فاعلی یا صفتی معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً نیکو کار۔ بدکار۔ شیریں کار۔ سنسکرت میں۔

سُنار۔ سورن کار	स्वरणाकार
کمہار۔ کمبہ کار	कुम्भकार

پس۔ فارسی میں بمعنی بعد ہے۔ ژند میں پَسا۔ سنسکرت میں پشچات पश्चात کے یہی معنی ہیں۔
ہم۔ فارسی میں بمعنی ہمدگر اور باہم آتا ہے۔ سنسکرت میں سم सम بمعنی باہم ہے۔
(دیکھو فصل ہ صفحہ 84)۔

ایدر فارسی ہے۔ سنسکرت اتّر अत्र ہے۔ یعنی یہاں (دیکھو صفحہ 56۔ باب الف متحرک)
ایں فارسی میں اشارہ قریب کے لیے ہے۔ سنسکرت میں ای ए یہی کام دیتا ہے۔

خاتمہ

شرمندہ ہوتا ہوں کہ آج کے لکچر نے طول کھینچا۔ اہلِ ذوق تنگ ہوگئے ہوں گے۔ مگر انصاف شرط ہے۔ منزل کڑی تھی اور راہ بے ڈھنگی زادراہ کھنڈے ہوئے الفاظ۔ زبان نے زور بہت لگایا۔ لطف ولذّت نے لون مرچ بھی چھڑکا۔ مگر روکھے سوکھے چنوں میں چٹخارا کہاں سے آئے۔ خیر بیزار نہ ہونا چاہیے۔ اگر دوستوں کے مزاج شگفتہ نہ ہوسکیں تو زبان میں ایک نئی تلاش کا رستہ ہی نکل آیا۔ یہ مطالب میرے عزیز طالب علموں کے کام آئیں گے۔ مجھ جیسے نکمّے سے اتنا کام ہو جائے! بہت غنیمت ہے! خدا لطفِ ادا اور حسن قبول روزی کرے اور عزیزوں کو فائدہ پہنچائے۔ اٰمِیْنَ ثُمَّ اٰمِیْن۔

سخن دانِ فارس

حصّۂ دوم

سخن دانِ فارس

حصّۂ دوم

پہلا لکچر

فارسِ قدیم کی تاریخ

عزیزانِ وطن! اگرچہ ہندوستان میں زبانِ فارسی کا آفتاب مدت سے ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ لیکن جب ہم عموماً ممالکِ ایشیا پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہی ایک زبان نظر آتی ہے جس نے ہر ایک ملک میں تاثیر برقی کی طرح اپنی حرارت دوڑائی ہوئی ہے۔ کوئی شہر ایسا نہیں جہاں کچھ نہ کچھ اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود نہ ہوں۔ تم ذرا اس کی برکت پر خیال کرو۔ اکثر گاؤں ایسے ہیں کہ مثلاً عرب یا ترک یا انگریز، یا فرنچ، یا جرمن آدمی وہاں جا پڑے تو اس کے روٹی اور پانی کی بات بھی کوئی نہ سمجھے گا۔ لیکن ایک ایرانی تازہ ولایت جہاں جا نکلے گا وہاں کوئی نہ کوئی ایسا آدمی ضرور موجود ہوگا جو اسے کھانے پینے کی ضرورتوں سے تنگ نہ ہونے دے گا اور اہل ہند کے واسطے یہ زبان اس سبب سے خصوصاً قابل توجہ ہے کہ اردو کے پُتلے کا ایک قوی عنصر ہے۔

اس کا خزانہ استعاروں، مجازوں اور کنایوں کے جواہر سے دولت مند ہے۔ سامانِ

مذکور سے ہر مطلب کو نظم خواہ نثر، سادہ خواہ رنگین، جس قالب میں چاہتی ہے ڈھال دیتی ہے۔ ادائے مطلب میں جو اسے کمال ہے اور زبانوں کو کم حاصل ہے۔ اس کی زمین انشاپردازی کی گلکاری میں جیسی نثر کے لیے موافق ہے ویسی ہی نظم کے حق میں مناسب ہے۔ ہر اقلیم کے زباں دانوں نے اسے پسند کیا ہے کیونکہ سیکھنے میں سہل ہے اور ادائے مطلب میں مختصر اور بولنے میں خوشگوار ہے۔

کسی زبان کی نکتہ فہمی کا حق نہیں ادا ہو سکتا جب تک کہ اس کے ملک کی تاریخ اور جغرافیہ اور ملکی حالات اور اہل ملک کے عادات واطوار سے بخوبی واقفیت نہ ہو۔ زبان فارسی میں زیادہ خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شیرینیِ گفتار نے اس میں بہت سے نازک اور باریک لطف پیدا کر دیے ہیں۔ اسی واسطے اس کی اصطلاحوں اور اشاروں کنایوں کا کچھ شمار نہیں۔ مختلف زبانوں کے پرکھنے والوں نے زبانِ مذکور میں یہ جوہرِ خاص پایا ہے کہ اس کے ہر فقرے میں ایک نکتہ ہے اور ہر بات میں ایک لطیفہ ہے۔ وہ جن استعاروں اور تشبیہوں سے مرصّع ہے۔ ان کی بنیاد ضرور کسی نہ کسی خصوصیتِ ملکی پر ہے، جس میں ملک کی حالت، سرزمین کی صورت، لوگوں کی ریت رسوم، رہنے سہنے کے دستور، ملاپ جُلاپ کے طریقے، طرزِ لباس، نشست برخاست کے قاعدے وغیرہ وغیرہ سب کو دخل ہے اور انھی کی بنیاد پر وہ نمکین محاورے اور رنگین استعارے، چبھتے ہوئے اشارے، کھٹکتے ہوئے کنائے قرار پائے ہیں جو اُن کی انشاپردازی کو اور زبانوں کی فصاحت سے الگ جلوہ دے کر روشن اور ممتاز دکھاتے ہیں۔

میں آج کل دیکھتا ہوں کہ مدارس تعلیمی کی رونق اور نئی تصنیفات نے جو ایران سے آتی ہیں اس کی طرف بہت لوگوں کی طبیعتیں مائل کر دی ہیں۔ لیکن شوقین طلبا اس کے خاص خاص حالات وخیالات سے واقف نہیں۔ اس لیے جب کوئی شعر سنتے ہیں تو بجائے اس کے کہ سن کر اُس کی کیفیت سے لطف اٹھائیں اور ذوق و شوق سے وجد میں آجائیں۔ وہ اس طرح سوچتے رہ جاتے ہیں جیسے کوئی علمی بات کو غور سے سنتا ہے اور کچھ شک نہیں کہ زبان کے معاملے میں یہ حالت ہونی انشاپردازی کی جان پر سخت ستم ہے۔ ہمارے محقق اس میٹھی زبان کی تحقیقات میں کوششوں کے حقوق کو پورا پورا ادا کر گئے اور شائقوں کے لیے کافی سامان دے گئے ہیں۔ لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ اس انداز پر کوئی تالیف لکھنے کی ضرورت انھیں نہیں معلوم ہوئی جو آج ہے۔ اس زمانے میں یہاں کے اکثر لوگ خود ولایت زاد تھے۔ بہت سے ان کی اولاد تھے۔ اس

طرح کہ باپ یادادا ولایت کے تربیت یافتہ تھے اور اہلِ ایران اس کثرت سے یہاں موجود تھے کہ ہر وقت ان کی صحبتوں اور گفتگوؤں سے ذخیرے خیالات کے جمع کرتے رہتے تھے۔ اس لیے وہ باتیں کتابوں میں مرتب نہ ہوئیں۔ اور یہ افسوس کا مقام ہے۔ کیونکہ وہ صاحبِ کمال لوگ تھے۔ اگر لکھتے تو شوق کی پیاس کو خوب بجھاتے اور مطالب مذکورہ کو اس جادو بیانی سے ادا کرتے کہ فقط ملک ایران کی تصویر ہی نہ کھینچتے۔ بلکہ اس کے ہرے بھرے جنگل، سرسبز پہاڑ، بہتے چشموں سے پھولے پھلے باغ لگاتے اور ان میں نسیم و صبا کے گزار، پرندوں کے چہچہے، صبح کی کیفیت، شام و شفق کی بہار سامنے دکھاتے۔ آباد شہر، چلتے بازار، سجے سجائے گھر سامنے نظر آنے لگتے اور بلبلانِ شیر ازیعنی میرزایانِ ایران ان میں پھرتے چلتے، بولتے چالتے نظر آتے۔ لیکن افسوس ہے بڑوں کے مرنے کا کہ جس نے مجھ چھوٹے کو بڑائی دی اور میرے عزیز دوستوں اور پیارے شاگردوں نے مجھ سے اس بارِ گراں اٹھانے کی درخواست کی :

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند

میں حقیقتاً اس تحریر و تقریر کے لیے نا قابل ہوں، مگر ان کے کہنے سے چارہ نہیں۔ اس لیے کچھ نہ کچھ کہے بغیر گزارہ نہیں۔ ناچار اس رستے میں قدم دھرتا ہوں۔ لیکن مناسب دیکھتا ہوں کہ مطالب مذکورہ کے بیان کرنے سے پہلے کچھ فارسیِ قدیم کا حال بیان کرلوں۔ جس کا سلسلہ اس ملک کی تاریخ باستانی سے الجھا ہوا ہے اور وہ اس زبان کا جزِ اعظم ہے۔

فارس کے حالات اور فارسی زبان کے خیالات

آدم زاد کی تصویر جو صانعِ قدرت نے اوصاف رنگارنگ سے سجائی ہے۔ اس کے جس رنگ پر عقل نظر کرتی ہے۔ دیکھتی رہ جاتی ہے، مگر سب میں زیادہ غور کے قابل اس کی زبان اور حسن بیان ہے۔ کیونکہ ہر ملک میں زبان ہی ایک ایسی شے ہے جس سے اس کے بولنے والوں کی لیاقت یا جہالت، تہذیب و بے تہذیبی کا اندھیرا اجالا معلوم ہوتا ہے۔ غور کرو تو کسی قوم کی تحقیقی حالت اور حقیقی لیاقت اور طبیعت کی اصلیت ہمیں نہیں معلوم ہوتی اور تاریخ بھی ہمارے دل پر تصدیقی اور یقینی نقش نہیں کرتی۔ ہاں جو باتیں خود ان کے منہ سے نکلی ہیں اور کتابوں میں لکھی گئی ہیں۔ اگر وہ ہاتھ آجائیں تو ان کے سارے کاروبار اور حالات و خیالات گویا

اقراری تصدیق کو پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا عجب حال ہے۔ کسی ملک کا مسافر یا سیاح وہاں کے حال کو اپنے سفر نامے میں باتوں کا افسانہ بناتا ہے، یا سادہ لوح مورخ جو کچھ سنتا ہے اپنی تاریخ میں ایسی باتیں ایک قوم سے منسوب کر دیتا ہے جو اکثر خلافِ عقل کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہاں جب خود ایک زبان کے بولنے والوں کے اصلی الفاظ اور محاورے ایسے موجود ہیں جن سے ان کی خاص خاص رسومات اور سرگزشتوں کے نشان اور ان کے خیالوں کے رستے کھلے نظر آتے ہیں تو کون سی عقل ہوگی جو اس سے انکار کرے گی؟ اس تصور کا نمونہ ملک فارس اور زبانِ فارس کی حالت ہے۔ بہت افسوس ہے کہ اس ملک کی راہِ تواریخ میں سراغ بالکل مٹے ہوئے ہیں اور جو کچھ ہیں وہ نظم میں ہیں اور افسانوں کے لباس میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہاں یورپ میں علمِ زبان کے محققوں نے اپنے علم کے ذریعے سے اب اتنا پتہ لگایا ہے کہ یونان کی تاریخ سے بھی تقریباً ہزار برس پہلے، وہی شرافت پناہ فرقہ جو اریا کہلاتا ہے۔ 'بخارا' خواہ 'تاتار'۔ غرض وسط ایشیا سے اٹھا اور چاروں طرف عالم میں پھیل گیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشخاص مذکور قدوں کے لمبے، رنگ روپ کے گورے چٹے، باپ دادا سے اولوالعزم اور ہمت والے چلے آتے تھے۔۔ خود شائستہ تھے اور جانتے تھے کہ شائستگی کے کام اور راحت و آرام کے سامان کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کی ایک شاخ نے اپنے خیالات کو مذہبی نقش و نگار دے کر 'نگار خانۂ چین' سجایا۔ دوسرے نے یونان میں جا کر فلسفہ و حکمت کا طوفان باندھا۔ تیسرے نے روما کی بنیاد ڈال کر روئے زمین پر حکومت شاہی اور حکمتِ عملی کا نقارہ بجایا۔ ایک شاخ نے اندلس میں جا کر کیسۂ خاک سے چاندی نکالی اور انگلستان سے خبر آئی کہ پانی سے مچھلیاں، بلکہ پہاڑ کے سینے کو چیر کر لوہا تک نکال لائے۔

ہندُستان میں ہمالہ اتر کر آئے اور برہمن دیوتا کہلائے۔ ایران میں شمشیر و گرز سنبھالا اور درفش کاویانی کو مرصع کر کے ہوا میں لہرایا۔ ممالکِ مذکورہ بالا میں الفاظ کا اتفاق ان کے اتحاد اصلیت پر گواہی دیتا ہے۔ ان میں بھی جو اتفاق الفاظ کا سنسکرت اور فارسی میں ہے غالباً کسی زبان میں نہ ہوگا چنانچہ گروہ در گروہ لفظوں کے انبوہ بآوازِ بلند پکار رہے ہیں کہ ان دو خاندانوں کا نسب نامہ ایک ہے اور کہتے ہیں کہ قوم ہی کے نام سے ملک مذکور نے ایران نام پایا ہے۔ اسی کو یونان کی کتب قدیمہ 'آریان' پکارتی ہیں۔

'سیامک' جسے اہلِ ایران 'نشت و خشور و خشوران'۔ برگزیدۂ یزدان۔ خدیو جہان۔ شاہنشاہ پیشداد کہتے ہیں۔ (بعضے کہتے ہیں کہ شیث پیغمبر وہی تھا) نیک نیتی اور داد و دانش کی برکت

نے اسے پارسا خطاب دیا تھا اور اسی تقدس سے اس نے ملک مذکور کا نام پارس رکھا تھا کہ پاک اور مقدس کو 'پارس' کہتے ہیں (اور اسی سے ہے پارسا)۔

بعضے کہتے ہیں کہ 'پیشداد ہوشنگ' جس کے بااقبال اور روشن زمانے میں پتھر سے آگ نکلی اس کا لقب بھی پارس تھا اور اسے ایران شاہ بھی کہتے تھے۔ اس نے ایک شہر آباد کر کے اس کا نام ایران رکھا تھا۔ وہی اَدل بَدل کر آج نشاپور کہلاتا ہے اور ایران کے معنی 'پاک' اور 'پاکیزہ' بھی آئے ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ فریدون ابن آبتن کے تین بیٹے تھے۔ جب سلطنت کی ترقی دل کے ارمان نکال چکی تو ملک کے 3 حصّے کیے :

(1) ملک مشرقی تورج کو دیا۔ ایرانی اسے 'اُن ایران' کہتے تھے۔ عرب نے 'ماوراءالنہر' اس کا نام رکھا۔

(2) ملک مغربی سلم کو۔ اہل ایران اس کو 'ایران پژ' کہتے تھے۔

(3) ملک وسطی ایرج کو دیا کہ اسی بیٹے کو بہت چاہتا تھا۔ یہ خطِ استوا سے جانب شمال اور ممالک ربع مسکون کے وسط میں واقع تھا۔ اسی واسطے مملکت کے کل شہروں میں معتدل اور خوش آب و خوش ہوا تھا۔

ہر قوم کا دستور ہے کہ اپنے ملک میں ایک مقام کو مذہبی برکت سے عظمت دیتے ہیں چنانچہ موسائیوں اور عیسائیوں نے بیت المقدس۔ اور عرب میں اکثر انبیا نے اور سب سے اخیر اسلام نے مکّہ کو معظم تسلیم کیا۔ ہندُستان میں کاشی، متھرا وغیرہ وغیرہ۔ ایران نے اس قطعۂ زمین کو متبرک سمجھا۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ فریدون نے بھی اسے مقدس مقام اور اپنے بااقبال بزرگوں کا قدم گاہ سمجھ کر یہ ملک پیارے بیٹے کو دیا تھا اور اس میں سے قطعۂ خاص کو اعلیٰ اور روح افزا دیکھ کر پارس نام رکھا تھا (یعنی ارضِ مقدس) افسوس کہ ان خوبیوں نے اور باپ کی محبت نے بھائیوں کے دلوں میں عداوت کا خنجر ڈھالا اور دونے مل کر ایک بے گناہ کو مار ڈالا۔ ایرج کی ماں کا نام ایران دخت تھا۔

کرمان شاہان کے پہاڑوں میں کوسوں تک پرانے ویرانے پڑے ہیں۔ وہ شاہانِ قدیم کے جاہ و جلال کی مٹی ہوئی تصویریں ہیں۔ انہی میں ایک مقام 'طاق بستان' مشہور ہے اور

دستکاریوں کے نقش و نگار میں ایک جگہ 'شاپور ذوالاکتاف' کی تصویر ہے۔ جو عبارت اس پر منقوش ہے ترجمہ اس کا یہ ہے :

بندۂ خدا شاپور عزیز شہنشاہ ایران و اَایران کہ بسلسلۂ آسمانی پسر بندۂ
خدا ہرمز و عزیز شہنشاہ ایران و اَایران است و آں بسلسلۂ آسمانی پسر
بزرگِ شہنشاہ 'نرسی' است۔

اس سے مراد ہے۔ شاپور عزیز شہنشاہِ ایمانیاں و غیر ایمانیاں۔ کیونکہ 'اِیر' (مومن) 'اَایر' (غیر مومن) کو کہتے تھے اور یہ معنی مُلّا فیروز پارسی نے مالکم صاحب کو بتائے تھے[1]۔

'نقش رستم' کے ایک کتابہ کا ترجمہ ہے دارا بادشاہ ایران کی زبانی۔ میں شاہ و شہنشاہ دارا۔ کل آباد ملکوں کا بادشاہ۔ فراخ دنیا کا سنبھالنے والا۔ لکھا منش[2] پارسا کا بیٹا۔ ہِشتاسپ بادشاہ اور آرج کا بیٹا آرج ہوں۔ دیکھنا! یہ وہ دارا نہیں جسے سکندر نے مارا۔ یہ سنہ عیسوی سے 485 برس پہلے پیدا ہوا تھا۔

ہندستان کے آریا بھی اپنے تئیں آرج[3] کہہ کر یہاں کے شودروں سے ارجمند کرتے تھے اور انہی کی آبادی سے یہاں کا ملک ہماچل سے بندھیاچل تک آریاورت کہلاتا تھا اور تم ابھی سن چکے کہ فارسی قدیم کی کتابوں میں ایران کے معنی شریف و دانا و ہنر مند بھی لکھے ہیں (یہی ارجمند کا ترجمہ ہے)۔

اکثر اہل یورپ انہی تحقیقاتوں کے لیے بمبئی اور خاندیس تک آئے۔ ایران بھی پہنچے۔ پارسیوں کے دستوروں اور موبدوں سے ان کی کتب قدیمہ بہم پہنچائیں۔ ساتھ ہی سنسکرت کی معلومات حاصل کی اور دونوں کو مطابق کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر دنیا کی پرانی کتابوں میں وید سب سے پرانی کتاب تسلیم کی جائے تو پارس کے گاتھا ان سے دوسرے ہی درجے میں ہوں گے۔ ہزار بلکہ پندرہ سو برس پہلے سنہ عیسوی سے ان کی انشاپردازی درجۂ تکمیل کو پہنچی ہوئی تھی۔

---

1 ملا فیروز وہی ہیں جنھوں نے 'دساتیر' با ترجمہ و فرہنگ تصحیح کر کے چھپوائی تھی اور 'جارج نامہ' 3 جلدوں میں لکھا تھا۔

2 دیکھو تمرناسک۔ بابو سیوا پرشاد کا جغرافیہ۔

3 ج سنسکرت میں حرف نسبت ہے۔ چنانچہ نیر سے نیرج (کنول کا پھول) اور آتمہ سے آتمج نکلا ہے۔

اس ملک کے جاہ و جلال، علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی طرف ہر ملک کے مورخ عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن افسوس یہی ہے کہ وہ اپنی مسلسل تاریخ اپنے پاس نہیں رکھتا۔ کچھ مختصر بیان جن کی بنیاد شاعرانہ افسانوں پر ہے۔ مثلاً شاہنامہ، سکندرنامہ، زینت التواریخ وغیرہ وغیرہ ہیں اور جب تاریخ کا یہ حال ہے تو زبان کی اصلیت اور اس کے انقلابوں کا سلسلہ کب مسلسل ہاتھ آسکتا ہے۔ باوجود اس کے یہ بالاتفاق ثابت ہے کہ ساڑھے چار ہزار برس سے کم اور چار ہزار برس سے زیادہ ملک مذکور میں اسی قوم کے بادشاہ اس دھوم دھام سے سلطنت کرتے رہے۔ جن کی تہذیب اور شمشیر اور دولت مندی نے کسی قوم کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

صحیح بخاری میں ایک جگہ اہلِ فارس کا بھی ذکر آگیا ہے۔ ابن ہمام صاحب فتح الباری نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ شہسوار اور بہادر لوگ تھے۔ پھر مجوس ہو کر آتش خانے بنالیے، لیکن ریاست، سیاست، حسنِ مملکت، تدبیرِ جنگ، ہر چیز کو برمحل برتنا، فنِ انشا، نفاستِ مزاج، لذیذ کھانوں اور خوشبوؤں کی ایجاد اور خوش لباسی میں بے مثل و بے نظیر تھے۔ رسوم ملک داری میں اَور لوگ ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔

جب یہ بات ثابت ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ ایسی باعظمت اور قدیمی سلطنت کیا علوم سے بے بہرہ ہوگی؟ یا فنون و صنائع کی دولت سے محروم ہوگی؟ اس کی زبان علمی الفاظ کے اعتبار سے ناتمام ہوگی؟ اور نظم کے گلزار سے خالی ہوگی؟ ہرگز نہیں۔ جس آریا قوم کی ایک شاخ نے ہندستان میں آکر علم کے دریا بہادیے کیا دوسری شاخ نے وہاں جاکر بزرگوں کا نام ڈبویا ہوگا؟ نہیں نہیں، اور ہرگز نہیں۔ تب کیا آفتِ آسمانی آئی جس کے سبب سے ایسے مہذب لوگ، ایسے علوم و فنون کے خزینہ دار، جاہ و جلال کے سپہ سالار اس حالت میں نظر آنے لگے جسے اَور نقصانوں کے ساتھ آج لوگ کہتے ہیں کہ "فارسی زبان علمی زبان نہیں۔" اس کا سبب یہ ہے کہ اوّل تو کیانیوں کی آخر سلطنت میں زرتشت کے نئے دین اور نئے آئین نے صدہا برس کی رسوم اور علوم اور اس کی کتابوں کو خاک سیاہ کیا۔ تم ضرور کہوگے کہ مذہب کا زبان پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ ہم کہیں گے کہ اس تغیر کو خیال کرلو جو کہ بودھ کے سبب سے سنسکرت پر ہوا۔ دیکھ لو سنسکرت کے دین آئین سب بدل گئے تھے۔ کتب خانے نیست و نابود ہوگئے تھے۔ غاصبوں کی زبان جو ایک پراکرت زبان تھی وہی بودھ قادرِ مطلق کی زبان کہلاتی تھی۔ وہی ازلی اور ابدی

قرار پائی تھی۔ پالی حروف دفتروں سے لے کر کتب مذہبی تک حرف الٰہی ہوگئے تھے۔ نئے کتب خانے سج گئے تھے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ جب زرتشت نے بادشاہ وقت (یعنی گشتاسپ) اور ولی عہد (یعنی اسفندیار روئیں تن) اور تمام خاندانِ شاہی اور امرائے دربار کے دلوں پر آگ کی روشنی سے دینِ الٰہی کا جلوہ دیا ہوگا تو قدیمی رسوم و رواج سے باقی کیا چھوڑا ہوگا؟ زرتشت نے روما سے علوم حاصل کیے تھے اور اضلاع شام سے خروج کیا تھا۔ کچھ نہ کچھ مزہ ضرور زبان پر آیا ہوگا۔

غرض دین زرتشت نے سلطنت کے بازوؤں سے ایسا زور پکڑا کہ تمام ایران و خراسان پر چھا گیا اور تخمیناً دو سو برس تک اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور کہتا ہوا اٹھا کہ :

دہ آتش ستم از دو ہر شود   آتش کدہ نہ آتش گزارم نہ

جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے ہندوؤں پر گزری تھی وہی وہاں 'ژند' و 'استا' پر آئی۔ افسوس جس آگ نے زرتشت اور جامہ سپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا۔ جس کے آگے گشتاسپ نے تاج کیانی سر سے اتارا۔ اسفندیار روئیں تن نے گرز و شمشیر نذر چڑھائے۔ وہ آگ آبِ شمشیر سے بجھائی گئی۔ ژند و پاژند کے ورق ورق برباد گئے۔ سکندر نے شراب کے نشے میں شہر استخر[1] کو آگ لگوادی۔ تاریخ کے سینے پر آج تک داغ ہے۔ اس شہر کا کہ تخت گاہ ملک جم کا تھا اور پشتوں سے مقام شاہ نشین سلاطین ایران زمین کا چلا آتا تھا۔ غضب ہوا کہ اس کا عظیم الشان کتب خانہ آگ کا نذرانہ ہوا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یونانیوں نے جب ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر کیوں نہ زور دکھایا ہوگا۔

سکندر کے تھوڑے ہی دنوں بعد پار تھیا والوں کا عمل ہوگیا۔ جس ایران کو ہزاروں برس سے فتح کے نشان سلامی اتارتے تھے اور فتح یابی دربار میں سر جھکاتی تھی 500 برس تک نئے ظفریابوں کے قبضے میں دبا رہا اور ژند کی مقدس کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کیں۔ آخر 226ء

---

1. یونانی مصنف اسے 'پرسی پولیس' لکھتے ہیں۔ پرسی = پارس + پولیس = قلعہ کو جمشید کے اقبال کے بلند پہاڑ پر بلند کیا تھا۔ اس کے کھنڈر اب تک پرانے جاہ و جلال کو عظمت دیتے ہیں۔ استخر = تلاؤ کو کہتے ہیں۔ اس میں پہلے بہت بڑا تلاؤ تھا۔ شیراز سے اصفہان کو جاتے ہوئے دوسری منزل میں رستہ سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ انشاء اللہ سفر نامہ میں مفصل لکھوں گا۔

کے بعد 500 برس کے مردے میں اقبالِ ساسانی سے سانس پڑااور دم شمشیر سے تنِ بے جان میں جان آئی۔ اردشیر بابکاں خاندانِ مذکور کا بانی تھا۔ اس نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کے نور کو بھی روشن کیا۔ آتش خانے پھر تعمیر کیے۔ مذہب مٹ گیا تھا، کتابیں ضائع ہو گئی تھیں۔ لوگوں کی زبانوں سے یا جن جن مقاموں سے پھٹے پرانے اوراقِ پریشاں ہاتھ آئے انھیں سمیٹ کر پھر مذہب کی شیرازہ بندی کی اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہوا۔ اردشیر ایسے ذوق و شوق بلکہ سخت جوش و خروش سے ملک اور قوم کے کام میں مصروف ہوا کہ مورّخ اس کو تعصّب اور سخت مزاجی کی تہمت لگاتے ہیں اور یہ جرم ممکن ہے کیونکہ پارتھیا والوں کے کئی سو برس کے جمے ہوئے رنگ کو مٹا کر اپنا نقشہ جمانا اور ان سے بھی پہلے سکندر کی اُکھیڑی ہوئی بنیادوں کو چُن کر نئی عمارت کا اٹھانا، سختی کے بغیر کیونکر ہو سکتا تھا۔ اس خاندان نے پانسو برس بادشاہی کی۔ اہل فارس کو اس سلسلے کی سلطنت کا بھی فخر ہے اور فی الحقیقت اردشیر، شاپور، نوشیرواں جیسے بادشاہ جس خاندان میں نیک نامی کے نشان بلند کریں ان کی قوم جو ناز کرے بجا ہے۔

ساڑھے چار سو برس کے بعد ریگستانِ عرب سے ایک آندھی اٹھی۔ اس کے پیچھے گرجتا بادل بجلی چمکاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ساسانی سلطنت کا اقبال شمشیرِ اسلام کی قربانی ہو گیا اور درفش کاویانی قادسیہ کی خاک پر سرنگوں ہوا۔ اللہ اللہ، یہ وہی مبارک چھرا تھا جس کے اقبال سے ضحاک کی بلا دفع ہوئی تھی اور کیانی خاندان کا حقدار اپنے حق کو پہنچا تھا۔ وہ ہر میدان میں فتح کا ستارہ ہو کر چمکا اور اس کی برکت پر پھولوں کی جگہ جواہر اور موتی چڑھائے گئے تھے۔ اس کے شگون پر جنگ کے معرکوں میں امیدوں کی آنکھیں لگی رہتی تھیں۔ آج وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا اور دیندار بہادروں میں اس کے جواہرات اور موتی مٹھی مٹھی کھجوریں تھیں کہ بٹ گئیں۔ عالی شان آتش خانے ڈھائے گئے۔ ان کی نورانی آگ خاک کے نیچے دَھم ہو کر رہ گئی۔ دینی اور دنیاوی کتابیں ورق ورق اڑیں اور جل کر خاک در خاک ہو گئیں۔ اس وقت میں میرے پارسی بھائی وہاں سے بھاگے اور جانوں کے ساتھ ایمانوں کو بھی بچا لائے۔ چنانچہ مدراس اور بمبئی کے ملکوں میں آ کر پھر آتش خانے بنائے اور اپنے بزرگوں کے نام کو روشن کیا۔

یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ جو کچھ ان کے پاس موجود ہے وہ ٹوٹا پھوٹا بقیّہ ہے جو کئی صدموں کے بعد بچا ہے (1) یونانیوں کا طوفان (2) پارتھیا والوں کی پانسو برس کی سلطنت جس

کی پریشانی کو ساسانیوں کی ہمّت نے فراہم کیا تھا (3) عرب کا حملہ جس کے بعد پھر پارسیوں کو جمعیت نصیب نہ ہوئی۔ اب پارسی بھائیوں نے اپنے گھروں میں آگاہی کے لیمپ جلائے تو روشن ہوا کہ ژند کے 25 باب تھے۔ ان میں سے ایک وندیداد انیسواں باقی ہے اور متفرق اوراق یا فصلیں ہیں کہ زبانوں یا سینوں میں امانت آئے تھے۔ انہی میں کتاب زورہ استا ہے۔ اس میں بہت سی دعائیں و ظائف کی ہیں۔ ایک ایرانی محقق کہتا ہے کہ زورہ وہی لفظ ہے جو قرآن میں سورہ ہو کر لکھا گیا ہے۔

ہماری معلومات کو پارسی بھائیوں کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے انھی کی برکت سے پہنچا ہے۔ اسی سے ہم پر دو پرانی نسلوں کی ایک اصل ثابت ہوئی۔ اسی سے دو زبانوں کے لغات کا رشتہ نکل آیا اور اس سے ان کی خاندانی رسموں کی بلکہ اتحاد مذہب کی حقیقت معلوم ہوئی اور یہ بھی خبر ہوئی کہ سنسکرت کے بعد ژند ہی زبان ہے جو قدامت کا تمغہ اپنے پاس رکھتی ہے اور وہ قوانینِ زبان اور اصولِ صرف و نحو اور طرزِ بیان اور سلاست اور فصاحت میں اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ یورپ کے محققوں نے بھی اس کے رتبے کو تسلیم کیا ہے۔

ان کے علوم و فنون پر بار بار ادبار کے طوفان آئے پھر بھی جو کچھ باقی ہے اس کے مطالب خبر دیتے ہیں کہ ہم کس دریا کے قطرے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جہاں ہم تھے وہاں سب کچھ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے پارسی بھائی خانہ برباد ہو کر ادھر آئے اور ان کی خور جینوں میں زیادہ تر فلسفۂ الٰہیات اور مذہبی کاغذات کے پُرزے تھے۔ سچ ہے ایسے وقتوں میں خدا یاد آتا ہے اور ایمان والوں کے ساتھ ایمان ہی جاتا ہے۔ ان کے مطالب بھی دیکھو تو معلوم ہوگا کہ علم مذکور کس اوجِ رفعت پر تھا۔ ان کی علمی اصطلاحیں جب عربی کی اصطلاحوں سے مطابقت کرتا ہوں تو بازارِ دنیا کے لین دین کا تماشا نظر آتا ہے۔

ابھی دیکھتا ہوں کہ دارا کی لوٹ میں سکندر علم کے صندوق بھی لیے جاتا ہے اور ان سے یونان و روم کے مدارس اور کتب خانوں کو افزائش دیتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد دیکھتا ہوں کہ عرب کے بہادر قطار در قطار اونٹ کچھ اُدھر سے لادے لیے آتے ہیں، کچھ فارس سے لیے جاتے ہیں اور اس سے بیابانِ ریگستان کو آباد کر رہے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد دیکھتا ہوں کہ انھوں نے فارس کو اپنا سرمایہ دے دیا۔ مگر امانت دار تھے، جو کچھ لیا، جوں کا توں حوالے کر دیا

ہے۔ خود اپنے ریگستانوں میں ویسے ہی رہ گئے جیسے کہ تھے۔

ایران میں طلبا کو کتب الٰہیات عربی زبان میں پڑھتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ دیکھو! خاک ایران کے فرزندوں کو اپنے بزرگوں کے مال کی خبر نہیں۔ یہ ان کے علوم، ان کے ہی مطالب، ان کے ہی دلائل ہیں۔ اور عرب کے استادوں سے عربی الفاظ میں سیکھ رہے ہیں۔ کسی کو خیال نہیں آتا کہ یہ ہمارے گھر کا مال ہے۔ ایک زمانہ ہوگا کہ یہ مطالب اسی خاک پر اپنے الفاظ میں پھیل رہے ہوں گے :

ماہیت	= ہرایند بروزن سرا	علت غائی	= کرانی
عقل اوّل	= مہین ہوش		
علت	= ایرایہ	واجب	= بایست
علت مادّی	= مائی	ممکن	= شایست
علت صوری	= پیکری	ممتنع	= نابایست
علت فاعلی	= کاری	فرض	= شمر۔ کرف
جنس	= مہ گونہ	قدیم	= باش
نوع	= گونہ	حادث	= رستہ۔ نورستہ
فصل	= باز آر	نسبت	= پربند
خاصہ	= وِیژ	ذہن	= باریُد

بسیط	= اَدَرَ۔ دہ کسی میں اور کوئی اس میں نہیں	دعویٰ	= خواست
مرکب	= دربست۔ دروبست۔ کاموس	برہان	= روشنگر
مفرد	= اُوربست۔ نادربست	دَور	= کَپرُدَہ
حد	= وَاُوار	تسلسل	= رَورَو
جوہر	= گوہر	برہان تطبیق	= برہم روشنگر
عرض	= پیان = پے + ان	برہان سلّمی	= زینہ روشنگر
اشارہ	= نماک۔ نمودن سے ہے	وغیرہ	= ونیرہ
مطلق	= آزاد = یلہ	نقطہ	= داغک
ملکہ	= راد۔ زہ	خط	= کشک

غرض کہ ان الفاظ اور ایسے ایسے دلائل سے اثبات واجب الوجود کا اور ابطال ایک سے زیادہ واجب الوجود کا۔ نفس ناطقہ کا بسیط ہونا، اس کا فانی نہ ہونا، وغیرہ وغیرہ صدہا مسئلے الٰہیات کے اور اصلاح نفس کے۔ رنگا رنگ بیانوں سے ادا کیے ہیں۔

ساسان پنجم کے فضائل و کمالات میں لکھا کہ اس کے مباحثے کے ارادے سے ایک فلسفیِ کامل مصر سے چلا اور ساسان آباد میں پہنچا۔ جس مدرسے میں ساسان پنجم درس دیتا تھا وہاں کے دربان کے گھر میں ایک لونڈی تھی۔ اتفاق یہ کہ فلسفی مصری رات کو اس لونڈی کے شوہر کے گھر میں اترا، مگر یہ نہ جانتا تھا کہ اس گھر کو میرے حریف سے کیا علاقہ ہے۔ رات کو لونڈی کی ماں نے مہمان سے پوچھا کہ میاں مسافر تم کس شہر کے رہنے والے ہو؟ اور یہاں کس ارادے سے آئے ہو؟ چھوٹا سفر (حرکتِ جسمانی) بڑے سفر (سفرِ آخرت) کے سامان کے لیے چاہیے نہ کہ دنیا کے نفع کے لیے۔ کیونکہ یہ ناپائدار ہے اور اس کا تعلق اصلی ٹھکانے تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ مصری فلسفی سن کر حیران ہو گیا۔ ناچار علم کی آڑ میں چھپا اور کہا کہ "تلاشِ علم"۔ پھر عورت سے پوچھا کہ "واجب کا فعل قدیم ہے یا حادث؟" عورت بولی۔ "حادث وہ ہے کہ زمانی ہو اور زمانہ فلک الافلاک کی گردش کو کہتے ہیں۔ چونکہ واجب اس سے برتر ہے تو چاہیے کہ واجب قدیم ہو اور اس کا فعل بھی قدیم ہو۔" حکیم مصری نے پوچھا کہ "واجب تک بھی فنا پہنچ سکتی ہے؟" عورت نے کہا۔ "نہیں! اس لیے کہ ممکنات موجود ہیں اور یہ بدون فاعل کے موجود نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ معلول بدون علت کے نہیں رہ سکتا۔" حکیم نے اعتراض کیا کہ "باپ بیٹے کی علت ہے۔ باپ مر جاتا ہے بیٹا جیتا رہتا ہے۔" عورت نے کہا "باپ بیٹے کی علت نہیں۔ وہ اس کے سبب کا ایک جو ہے نہ کہ علت! دیکھتا نہیں؟ ماں بانجھ ہوتی ہے تو باوجود باپ کے بچّہ نہیں ہوتا اور واجب الوجود تو علت تامّہ ہے۔ جب تک وہ ہے تب تک سب کچھ ہے وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔" غرض کتب مذکورہ میں سے جو رسالے فارسی میں ترجمہ ہو گئے اور میری نظروں تک پہنچے ہیں ان میں صدہا مسائل الٰہیات اور فلسفہ کے ہیں کہ کہیں فلاسفۂ یونان سے مطابق ہیں اور کہیں ان کا پہلو توڑ جاتی ہیں۔

ریاضی اور اس کی تمام شاخیں صفاً صفاً ہو گئیں۔ دساتیر میں ایک جگہ سیاروں کے دورا وغیرہ اور ان کے شمار بتائے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علم ہیئت تھا اور بہت بلند رتبے پر تھا۔ ان کے ہندسے کی مفلسی آج رحم کے قابل ہے کہ ہزار سے زیادہ مرتبہ اعداد بھی

نہیں بتا سکتا۔ مگر دساتیر میں انھی سیارات کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مراتب اعداد کا شمار معمولی حد تک ضرور تھا اور جبکہ 'نقطہ' کو 'داغک' اور 'خط' کو 'کشک' کہتے تھے تو ان کے استعمال کے مقام و محل بھی ضرور ہوں گے۔

جغرافیہ کی کوئی کتاب نہیں نظر آتی مگر تقسیم روئے زمین کے بعض مطالب جو کہیں کہیں لکھے ہیں اور ان سے اکثر اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں وہ سراغ بتاتی ہیں کہ ایک زمانے میں بھاری ذخیرہ ہوگا۔

کرہ زمین	گوے چمینی
قطب شمالی	اواختر
قطب جنوبی	دراختر
خطِ استوا	میانکش
دنیائے قدیم	رُزہ۔ روزہ۔ کیونکہ اس کا حال روشن ہے
نئی دنیا	شوہ۔ شبہ۔ اس لیے کہ اس کا حال لاعلمی کی رات میں مخفی ہے

یہ اصطلاحیں اب تک بھی بہت باقی ہیں مگر ان کے بیان کا یہ موقع نہیں پھر بھی یہ کہنا ضرور ہے کہ ان کے کاروبار اور نام و نشان جو باقی چلے آتے ہیں اپنے وجوہات بھی ساتھ دکھاتے ہیں چنانچہ اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ عہد قدیم میں سیستان کو نیمروز کہتے تھے۔ کیونکہ جب وہاں آفتاب نصف النہار پر آتا ہے تو پورا نصف کرہ زمین کا روشن ہو جاتا ہے۔ اس وقت جزیرہ مدیر (مغربی ساحل، بحر محیط) والوں کو اوّل طلوع اور جاپان (مشرقی ساحل بحر محیط) والوں کو غروب معلوم ہوتا ہے۔ کتاب 'ژند' و 'اُستا' میں حمدِ الٰہی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ کوہ سپند (سیستان) پر دوپہر ہوتی ہے تو 12 ہزار شہروں پر آفتاب کا نور پھیلاتا ہے۔ (لطیفہ) 12 ہزار شہروں کا حال تو اسی کو معلوم ہوگا۔ اتنا اب بھی کہہ سکتے ہیں کہ نصف کرہ زمین کا دَور 12 ہزار میل ہے۔

اُن کی دستکاری اُن عماراتِ قدیمہ سے نمودار ہے جو کہ کوہ بیستون، طاق بستان، نواح کرمان شاہان وغیرہ وغیرہ مقامات میں کھنڈر پڑے ہیں :

از نقش و نگارِ در و دیوارِ شکستہ آثار پدید است صنادید عجم را

یا قدیمی سکوں اور پرانے نگینوں سے معلوم ہوتی ہے جو کہ خزانۂ خاک سے کہیں کہیں نکل پڑتے

ہیں۔ ایران خراسان تک انہی کی تواریخ کا گورستان ہے۔ قصر شیریں اور خرابہ شاپور۔ خرابہ استخر کہ شیراز کے پاس ہے اور اس کے علاوہ اکثر پہاڑوں میں شاہانِ قدیم کی شکارگاہیں اور دربار منقوش ہیں۔ سواری اور سواری کے جلوس اور فوجیں چلی جاتی ہیں۔ ان سے فقط صنعت اور دستکاری کی باریکی ہی نہیں روشن ہوتی بلکہ پلٹن پلٹن اور رسالے رسالے جو یکساں وردیاں پہنے جاتے ہیں، وہ خبر دیتے ہیں کہ ہمارے ملک کی جنگی فوج باقاعدہ تھی اور ہم قواعدِ جنگ کو علمی اصول سے کام میں لاتے تھے۔

'طاق بستان' کی تصویروں میں ایک مقام پر شاپور اور اس کا باپ آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک حلقے کو دونوں پکڑے ہیں۔ اس سے کرہ زمین کا اشارہ ہوگا۔ ایک طرف زرتشت کی تصویر ہے۔ اس کے چہرے سے پُر نور آفتاب کا تاج شعاعیں پھیلاتا ہے۔

کنارۂ خراسان سے لے کر ادھر غزنی اور کابل تک۔ اُدھر بلخ اور اس سے آگے کنارِ جیحوں تک عجیب و غریب یادگاریں عہدِ قدیم کی نظر آتی ہیں۔ شاہانِ کیانی کی بزم گاہوں کے نقشے اور رزم گاہوں کے معرکے خاک پر مٹے پڑے ہیں۔ کابل سے چل کر بامیان اور بلخ کے درمیان میں دونوں طرف بلند پہاڑ دیواروں کی طرح چلے جاتے ہیں۔ بیچ میں فراخ اور سیدھا شاہراہ ہے۔ کہیں دو طرفہ کہیں دائیں، کہیں بائیں، دو منزلہ سہ منزلہ مکانوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ پہاڑوں کو اس طرح تراشا ہے جیسے کوئی صابون یا چربی کی ڈلی کو تراشتا ہے۔ استحکام و استواری کا تو کیا کہنا ہے۔ طرزِ تعمیر اور نقش و نگار دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے اور وہاں کے ہزاروں اور افغانوں کے کلام کو تصدیق کرنا پڑتا ہے کہ کہتے ہیں۔ یہ دیوزادوں کا کام ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے حکم سے بنائے ہیں۔ شمار میں 14-15 سو سے کم نہ ہوں گے۔ انھیں 'سمچ' کہتے ہیں۔

اسی سلسلے کی ایک عمودی پہاڑ کی سل میں ایک بت تراشا ہوا ہے۔ جس کا 40 گز کا قد ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا نام سلسال ہے۔

ایک عورت کی تصویر ہے اس کا قد 25 گز بلند ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اس کی بی بی ہے اس کا نام شمامہ۔

ایک بچہ ہے اس کا ساڑھے سات گز کا قد ہے۔ نام معلوم نہیں ہوا۔ ان مورتوں کے تناسب اعضا، خط و خال، زیور اور خوشنمائی آج تک سیاحوں سے اپنے دستکاروں کے لیے تعریفیں لیتے ہیں۔

رستے سے کچھ فاصلے پر بائیں ہاتھ کو قلعہ ضحاک ویران پڑا ہے۔ اسے شہر غلغلہ کہتے ہیں۔ اس کی فرسودہ فصیلیں اور بے شمار برج و کنگرے دور سے اداسی اور مایوسی کی تصویریں دکھاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں خرابے اور ویرانے گمنام پڑے ہیں اور شہر کے شہر ہیں کہ زیر زمین مدفون ہیں۔ جابجا پرانے زمانے کے پیسے، روپے، اشرفیاں اور نگینے نکلتے ہیں۔ ان پر ایرانی، یونانی اور ہندوانی سکّے اور تصویریں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ معمولی اور غیر معمولی سیکڑوں چیزیں اگلے وقتوں کی ایسی نکلتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتیں۔ رباعی

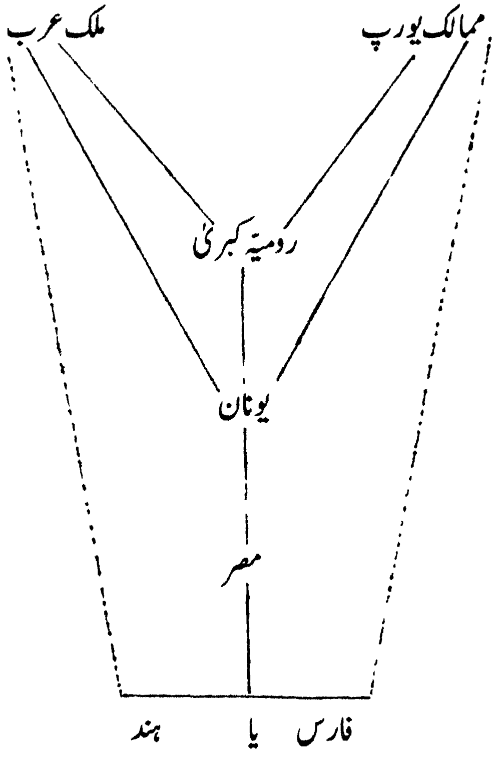
دُنیا خوابیست کش عدم تعبیر است
صیدِ اجل است گر جواں در پیر است
ہم روے زمیں پر است و ہم زیرِ زمیں
ایں صفحۂ خاک ہر دو رو تصویر است

بلخ خاص دار السلطنت ان بادشاہوں کا تھا۔ یہ باختر زمین اور ادھر مقابل میں خراسان زمین۔ 'باختر' کو یونانیوں نے 'بیکٹریا' بنادیا۔

قندھار اور غزنی کا علاقہ زابلستان کہلاتا تھا۔ رستم حامی ایران کا وطن یعنی سیستان انھی علاقوں میں ہے۔ بلخ کے رستے میں بائیں ہاتھ چند کوس کے فاصلے پر ایک مقام 'تخت رستم' کہلاتا ہے۔ وہ اس دشت میں آکر شکار کھیلا کرتا تھا۔ ایک سنگِ سیاہ کی چٹان ہے۔ اُسی کو تخت رستم کہتے ہیں۔ مالکم صاحب کہتے ہیں :

> سیستان خاندانِ رستم کا ملک موروثی ہے۔ اگرچہ تمام بیابان ہے اور اکثر نیستان ہوگیا ہے۔ لیکن کھنڈر اور خرابے اور ویرانوں کے نشان گواہی دیتے ہیں کہ دریائے ہیر مند کے کنارے کنارے دور تک آبادی کو رونق دیتا چلا جاتا تھا۔ اور مقاموں اور قبیلوں کے نام وہاں کے تاریخی حالات کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایک افسر انگریزی نے 1810ء میں علاقہ مذکور میں سیاحت کی ہے۔ اس نے سیستان کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ شہر مذکور اپنے ویرانوں اور خرابوں کے بموجب چاہیے کہ کسی زمانے میں اصفہان کے برابر پھیلا ہوا ہو اور یہ شعر مشہور کی طرف اشارہ ہے :
>
> اصفہاں نیمۂ جہاں گفتند نیمۂ وصف اصفہاں گفتند

ان کی مہمان نوازی، ان کے آدابِ محفل، ان کی تعظیم و تکریم کے طریقے، ان کے گھروں کی آرائش آج تک علم 'تدبیر المنزل' کے لیے نمونہ ہیں کہ کسی آئندہ لکچر میں ان کی تصویر کھینچ کر دکھاؤں گا۔ اور اس سے خیال کر سکتے ہیں کہ جب ایسی ایسی بربادیاں اٹھا کر آج یہ حال ہے تو اس وقت کیا عالم ہو گا۔ یہی سبب ہے جو یورپ کے اہلِ نظر نے پیرس دارالخلافہ فرانس کی زیبائی اور خود آرائی دیکھ کر اسے 'خاتونِ دُنیا' خطاب دیا اور مورّخوں نے کہا کہ جس طرح وہ یورپ میں خاتون ہے، ملک ایران ایشیا میں خاتون ہے۔



اہل تحقیق نے ایجادِ علوم کی تحقیقات کی کہ یہ درخت اوّل کہاں سے پھوٹا اور اس کی پَود کہاں سے کہاں کہاں پہنچی اور اس کا شجرہ اس طرح سرسبز ہوا۔ دیکھو ہند نے یا فارس نے اپنے علم کا سرمایہ مصر کو دیا۔ مصر نے دونوں سے لے کر یونان کو دیا۔ یونان نے رومیّہ کو دیا۔ رومیّہ اور یونان و فارس نے عرب کو دیا اور عرب سے پھر تمام یورپ اور ایشیا میں پھیلا۔

اب خیال کرنا چاہیے کہ جس قوم نے ساڑھے چار ہزار برس اس شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کی ہو اور علوم و فنون کی ترقی اس مرتبہ پر پہنچائی ہو۔ کیا اس کی زبان ایسی مفلس، بے سکّے اور بے ٹکسال ہو گی کہ جب تک اس میں آدھوں آدھ عربی لفظ نہ ملائیں تب تک زبان

نہ ہلا سکیں۔

عرب کا ملک جس میں قبل اسلام نہ کبھی سلطنت کا گزر ہوا، نہ علوم و فنون کی ہوا لگی وہاں ایک شیر کے لیے سو سے زیادہ نام تھے اور اسی طرح شراب کے لیے۔ پھر زین اور لگام کے ایک ایک جز[1] کے الگ الگ نام تھے۔ غرض اب تک ذرا ذرا سے فرق پر ہر شے کے لیے جدا جدا لفظ موجود ہیں۔ کیا ایسی عالی نژاد قوم اور قدیمی سلطنت کے پاس بات کرنے کو بھی الفاظ نہ ہوں گے؟ عرب کے صحرا نشین ہر دانت کے جوڑے کے لیے جدا جدا نام رکھیں اور ہر انگلی کا الگ الگ نام۔ کیا فارس جیسے شائستہ لوگوں کو سوا 'دندان' اور 'انگشت' کے کچھ نہ آتا ہوگا؟ کیا ان امتیازوں کی ضرورت انھیں کبھی نہ پڑتی ہوگی؟ آخر وہ بھی علمی ضروریات رکھتے تھے۔ طب رکھتے تھے۔ تشریح رکھتے تھے۔ ملکی کاروبار رکھتے تھے۔ آپس کے معاملات و مقدمات رکھتے تھے۔ ان کے کام کیونکر چلتے ہوں گے؟

سنسکرت میں انگشٹ vaxq"V انگوٹھے کو کہتے ہیں۔ اب اسے فارسی میں 'نر انگشت' کہتے ہیں اور اس کے پاس والی انگلی کو 'انگشت شہادت' کہتے ہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ نماز میں ایک موقع پر اس سے اشارہ کرتے ہیں کہ وحدانیت الٰہی کا اقرار پایا جائے۔ تو اسلامی اصطلاح ہوئی اور چھنگلی یعنی سب سے چھوٹی انگلی کو اب فارس میں 'کالچ' کہتے ہیں۔ یہ لفظ ترکی ہے، باقی گمنام۔

ملائی کو فارسی میں 'سر شیر' اور ترکی میں 'قیمانی' کہتے ہیں۔ پہلا مرکب ہے غالباً حالی جعلی ہے۔ دوسرا ترکی ہے۔ کیا ایسی عام کار آمد چیز کے لیے ان کے پاس ایک لفظ نہ ہوگا؟

شہد کے مہال میں جو بادشاہ ہوتا ہے اسے عربی میں 'یعسوب' کہتے ہیں۔ فارس کے مصنف 'شاہِ زنبوران' لکھتے ہیں۔ ایران کا ملک جس کے پہاڑوں میں شہد موجیں مارتا ہے۔ کیا وہاں اس کے لیے ایک لفظ نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا۔

سمجھنے کو یہی کافی ہے کہ ہم 'درہم' کو عرب کا مال جانتے ہیں۔ مگر عرب میں سکہ کہاں تھا۔ تجارت کی وکالت سے 'دینار' روم سے آیا۔ 'درہم' فارس سے گیا اور فارس میں آج کسی کو خبر نہیں کہ وہ ہمارا مال ہے۔ آج سے صدہا سال تک عہد بہ عہد کے سکے پرکھ لو۔ بیسیوں نام نکلیں گے۔ مگر کوئی عربی کوئی ترکی اور اب یورپی۔

---

1. دیکھو کتاب السرج واللجام

اس طرح آج فارس کے ملک سخن میں ہزاروں غیر ملک کے پردیسی زبانوں پر چلتے پھرتے ہیں۔ خاکِ ایران کی آفرینش گم ہے۔ بعض الفاظ فارسی ہیں۔ مگر مرکب ہیں یا مشتق ہیں اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ نوزائیدہ ہیں۔

تم ضرور کہو گے کہ اس کا سبب کیا ہوا؟ میں کہتا ہوں۔ گواہان بے زبان سے سنو کہ کیا کہتے ہیں۔ وہ کون؟ تاریخی کتابیں۔ اگرچہ اس عہد کے مصنف ایسی باتوں پر اٹکتے نہ تھے تو بھی قرینے کا پہلو کہیں نہ کہیں سے نکل آتا ہے۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ جب اسلام کا سایہ اس ملک پر آیا تو کُل دفتر و دربار کی زبان عربی ہو گئی۔ بادشاہی فرمانوں سے لے کر دفتروں کے احکام تک اسی زبان میں جاری ہونے لگے۔ اسی میں عرائض اور کُل مقدمے کے فرائض طے ہوتے تھے۔ اسی میں عام خط کتابت ہوتی تھی۔ آخر 442ھ میں الپ ارسلاں کا دور تھا کہ ملک کی خاک نے پھر زور کیا اور عمید الملوک اس کے وزیر کی تجویز سے ملکی دفتر زبانِ فارسی میں ہو گئے۔ اگرچہ ملک کو بہت آسائش ہوئی مگر علمانے وزیر کو بڑا مطعون کیا بلکہ کم علمی اور بے لیاقتی کے داغ لگائے۔

خیال کرو! جہاں 3 سو برس تک کُل دفتر اور تحریریں عربی زبان میں جاری رہی ہوں اور بادشاہِ وقت اور اس کے اہلِ دربار اسی کا جامہ پہنے ہوں۔ اس کی تاثیر ملکی زبان پر کس قدر چھائی ہو گی اور عربیت نے کس قدر فارسیت کو مٹایا ہو گا۔

اُسی کتاب میں پھر لکھتا ہے کہ نوشیرواں کے زمانے میں حکمائے فارس نے اس کے نام پر وامق و عذرا کی داستان بہت دلچسپ طور سے لکھی تھی۔ جب ایران میں اسلام آیا تو خلفائے عباسی کے زمانے میں عبداللہ ابن طاہر حاکم خراسان تھا۔ ایک شخص نے وہ کتاب امیر کے سامنے لا کر رکھی اور اس کی فصاحت و بلاغت اور طرزِ بیان کی تعریف کی۔ امیر نے کہا کہ ہم تو قرآن پڑھا کرتے ہیں، ہمیں قرآن و حدیث کے سوا کوئی کتاب درکار نہیں۔ یہ مغان آتش پرست کی کتاب ہے۔ حسب الحکم، کتاب پانی میں فنا کی گئی اور تمام فارسی کتابیں جس جس شہر میں پائیں جلادیں۔

فارسی قدیم کی کتابیں کم و بیش جو کچھ ہیں۔ وہ سمجھنے کے لحاظ سے ہمارے حق میں قریب سنسکرت کے ہیں۔ بعض کے ترجمے انگریزی میں، بعض کے فارسی میں، دیکھے تو ان میں

مدِ الٰہی کے زمزمے ہیں۔ بعض کتابیں الٰہیات یا تصوّف کی ہیں۔ ان کی مقدّس عبارتوں کی طرف انشاپردازی کا مبصّر ادب کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور کچھ نہیں کہتا۔ کیونکہ ہر چمن کی آب وہوا جدا ہوتی ہے۔ مذہبی تحریر کا عالم کچھ اور ہے اور انشاپردازی کا رنگ کچھ اور۔ تحقیق کی آنکھیں روتی ہیں، اُس گئے وقت پر جو کسی طرح نہیں آسکتا۔ ان خانہ بربادوں کے ہاں بھی تاریخ، اخلاق، افسانے، نظم، نثر سب کچھ ہوں گے۔ کیا ان کی عبارتوں کا بھی یہی سیدھا سادہ بے تکلف رنگ تھا۔ افسوس، افسوس آج اس عہد کو کہاں سے لائیں اور جو کچھ فنا ہو گیا کیونکر پائیں کہ دوستوں کو دکھائیں اور کچھ فائدہ اٹھائیں۔ خیر جس بات کا پورا مزہ نہ لے سکیں، ادھورے کو چھوڑنا بھی دانائی سے بعید ہے۔ اس لیے جو سامان میری معلومات کی الماری میں مدّت سے جمع ہو رہا ہے اسے نکالوں گا۔ اول قبلِ اسلام کی تصنیفات کے نمونے دکھاؤں گا، پھر بعد اسلام کی عبارتیں عہد بہ عہد اور صدی بہ صدی سجاؤں گا کہ تغیر کے رنگ خوشنما نظر آئیں۔

عزیزانِ وطن سے امید ہے کہ اس کے سرانجام کے لیے جلسۂ آئندہ تک مہلت عنایت فرمائیں۔

دوسرا لکچر

19 فروری 1872

ملک فارس کی پرانی زبانوں کے حالات

جلسۂ گزشتہ مبارک جلسہ تھا جس نے زبانوں کے سلسلے میں دلوں کو مسلسل کیا۔ مبارک شوق ہیں کہ اکیلے نہیں آئے۔ دیکھتا ہوں کہ نئے شوقینوں کو ساتھ لائے ہیں۔ بندۂ آزاد اوّل سب صاحبوں کو خیر مقدم کہتا ہے اور جلسۂ گزشتہ کا بیان یاد دلاتا ہے کہ جس سرزمین کو آج ایران یا فارس کہتے ہیں اس کی خاک کے اصلی فرزند اور لوگ تھے۔ جس طرح آریا کے پاک ذات فرقہ نے ہندوستان کے اصلی گھر والوں کو جنگل اور پہاڑوں میں دھکیل کر ملکش نام رکھ دیا اور آپ گھر والے بن بیٹھے اسی طرح جب دوسری شاخ وہاں پہنچی ہو گی تو اصلی مخلوق کو شہر چھوڑ کر پہاڑوں کی بغل اور جنگلوں کے دامن میں چھپنا پڑا ہو گا۔

جس طرح یہاں کے اصلی باشندوں کی مختلف پراکرتیں تامل، اوڑیا، تلنگو وغیرہ چلی آتی ہیں، اسی طرح وہاں کے فرقوں کی زبانیں ہوں گی۔ غالباً وہی نسلیں کرد، لگ، لر، لزکی، زند وغیرہ ہیں۔ فارس کے سبز جنگلوں اور سیراب پہاڑوں کی سیر کرو۔ خدا کی خدائی نظر آتی ہے۔ قبائل مذکور ہزاروں بلکہ لاکھوں کے انبوہ گروہ در گروہ پھیلے پڑے ہیں۔ فقط نام کو بادشاہ کی رعایا

ہیں، ورنہ خانہ بدوشی کے عالم میں خوش باش زندگی کرتے ہیں۔ یہ جنگلوں کے چرند اور پہاڑوں کے پرند ایسی بولیاں بولتے ہیں کہ آپ سمجھتے ہیں یا خدا۔ ان کے رسم و رواج، عادات و اطوار بالکل اہلِ ایران سے جدا ہیں۔ ان کے الفاظ ژند، پہلوی اور فارسی اور اس کی کسی شاخ سے ذرا لگاؤ نہیں رکھتے۔ اقوام مذکور میں نہ کبھی سلطنت آئی نہ علم و شائستگی نے راہ پائی، اس لیے تصنیفات کا قلم ان کی زبان کو بھی تمغائے اعتبار نہیں دے سکا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ سرزمینِ مذکور نے ایرین لوگوں کی برکت سے ایران نام پایا اور وہاں اور یہاں کے ایرین ایک خاندان کے دو بھائی ہیں۔ اس رشتے سے وہاں اور یہاں کی زبانیں بھی حقیقی بہنیں ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو چکا کہ جو زبان اس وقت وہ پاک نسل بولتی تھی اس کا نمونہ آج ملنا ناممکن ہے۔ اگرچہ ان کی گھر کی سلطنت تھی مگر ان میں ہندی آریا کی طرح رسوم و رواج کے بند کسے ہوئے نہ تھے اس لیے ہر ایک زمانے میں مذہبوں کے اختلاط اور ملکوں کی آمد و رفت زبان پر معمولی اثر کرتی رہی ہوگی، یونانیوں کا طوفان گزرا۔ پارتھیا والوں کی زبان نے اسے برباد کیا۔ سیکڑوں برس کے بعد ساسانی خاندان کی برکت سے پھر بوسیدہ ہڈیوں میں جان پڑی۔ انھوں نے غاصبوں کو دفع کیا اور برباد دفتروں کو پھر سمیٹا۔ اس کے ساتھ آئینِ زرتشت بھی پھر تازہ ہوا اور کچھ تحریروں، کچھ تقریروں سے دین کے آئین منضبط ہوئے۔ اس عالم میں وہ اپنی ملکی زبان اسی زبان کو سمجھے ہوں گے جو زمانے کے کل انقلابوں کا دست مال رہ چکی تھی۔ اور شک نہیں کہ اس وقت اس میں اور ژند کی زبان میں بھی بہت فرق ہو گیا ہوگا۔

ژند۔ پاژند۔ استا

لغاتِ فارسی کی فرہنگیں اور ایشیائی تاریخیں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتیں کہ گشتاسپ کے عہد میں ابر، ہیم زرتشت نے کسی علمی اور درباری زبان میں ایک کتاب لکھی اور اس کا نام ژند رکھا۔ ژند چقماق کے اس جز کو کہتے ہیں جو آگ نکالتا ہے۔ کتاب مذکور بھی نورِ الٰہی کا جلوہ دکھاتی ہے اس لیے یہ برجستہ نام بہت مناسب ہوا۔ ژند سخت مشکل تھی۔ اس لیے شرح لکھنی پڑی اور اس کا نام پاژند رکھا۔ پاژند چقماق کے دوسرے حصے کو کہتے ہیں۔ جب ژند پاژند سے ٹکرائے تو جلوۂ حق روشن نظر آئے۔ یہ شرح متن سے مشکل ہو گئی اس لیے اس کی بھی شرح لکھنی پڑی۔

اس کا نام استار کھا۔ افسوس کہ ان میں سے کوئی کتاب پوری نہیں رہی۔ ژند کے 25 بابوں میں سے 'وندیداد' انیسواں باب پورا ہے۔ باقی اوراق پریشاں رہ گئے۔

تقریباً 20 برس سے یورپ میں علم کے طلبگاروں نے بے دریغ روپیہ اور عرق ریز محنتیں صرف کی ہیں اور نو بہ نو تصنیفات سے وہ زور پھیلایا ہے کہ نئی نسل پارسیوں کی ان کے لکھے کو سند سمجھتی ہے۔ انھوں نے اکثر پرانی تحقیقوں کو رڈ کر دیا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ جو کتابیں چھپ کر آتی ہیں وہ 10 بلکہ 5 5 برس بعد کی تصنیفوں سے آپ ہی رڈ ہوتی جاتی ہیں۔

میں کتب مذکورہ کی زبانوں اور ان کے عہد بہ عہد کے تغیرات کے باب میں ہندیا فارس کی معلومات سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ کوئی سند ہاتھ میں نہیں۔ البتہ ہماری کتب لغت میں بہت لفظ ہیں، جن کے آگے اتنا لکھا ہے۔ ایں لغت ژند وپاژند است۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو لفظ استعمال میں نہیں آئے اور تراش ان کی ایسی کُڈھب پائی کہ اشتقاق یا لگاؤ اس کا کسی اصل سے نہ ملا۔ اسے کہیں "ژند"۔ کہیں "پہلوی"۔ کہیں "دری"۔ کہیں "فرس قدیم" لکھ دیا ہے۔

اب میں ایک فقرہ "استا" کا پڑھ کر اس کی زبان کا نمونہ دکھاتا ہوں :

استا کا فقرہ : اشم و ہو ویستم ہستی اُستا ہستی اُستا ہمائے یدِ اشائے ویستائے اشم

راستی نعمتِ کبریائی ہے۔ رحمت ہے اور فراواں ہے اور تقدس سے خیر ترین اشیا ہے۔ چاہتی ہے۔ کرتی ہے۔ ہوگی۔

واتو ہو رو سپنتو مزداو ادھ ہوئے نو ہوئے نے پیاد

اے آفریدگار مالک۔ خوبیوں کے بڑھانے والے۔ داتائے اعظم۔ دو عالم میں خوب بچائے رکھیو۔

زبان مذکور کے لیے کوئی صرف نحو یا لغت کی کتاب عہد قدیم کی تصنیف نہیں ملی۔ اہل یورپ نے کتبِ موجودہ کو پڑھ کر اپنی طبیعت کے بموجب قواعد باندھے اور ڈکشنیریاں بنائیں۔ ہندستانی یا پارسی شوقین انھی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ ان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ زبان مذکور میں سنسکرت کی طرح حروف اعراب کا کام دیتے ہیں۔ فعلوں میں مذکر و مونث کے علاوہ کئی صیغے زیادہ ہیں اور گردانیں بھی بہت ہیں۔ فعل کا مآخذ "دَن" اور "تن" والا اسم نہیں۔ ایسا کچھ ہے جیسے فارسیِ موجودہ میں تم امر سمجھتے ہو۔ فارسی حال میں سب امتیاز جاتے رہے۔ تعجب یہ ہے کہ "ژند" "پاژند" وغیرہ زبانہائے مذکورہ میں تحریر کی رفتار دائیں سے بائیں طرف چلتی ہے

اور یہ سب جانتے ہیں کہ کل ایرین زبانوں کی تحریر بائیں سے دائیں طرف ہے۔ اکثر کتابوں اور سکّوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ساسانیوں کے عہد میں یا اس سے پہلے زبان مذکور کی باریکیاں مٹ گئیں۔ کیونکہ گردانوں اور صیغوں کے شمار اس وقت اسی حالت میں تھے جس میں کہ اب ہیں۔ آپ چند منٹ توقف فرمائیں۔ اس کا نمونہ بھی سناتا ہوں۔

پاژند

اس کا نمونہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسٹ صاحب نے مینوے خرد اور اس کا ترجمہ 1871ء میں چھاپا ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ "پاژند" کی زبان ہے اور خسرو کے زمانے کی تصنیف ہے (یہ ساسانی عہد کا خاتمہ سمجھو)۔ آزاد اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی پرانی اور عہدِ اسلام کی قریبی فارسی زبان ہے۔ دیکھو! ہر صفحے میں کئی کئی لفظ فارسی متعارف کے اور بہت سے متغیر موجود ہیں۔ ہاں تصنیف عمدہ اور برکت والی ہے۔ معرفتِ الٰہی، اصلاحِ نفس اور حکمتِ اخلاق کے مضامین ہیں۔ صاف سلیس اور بے تکلف عبارت میں ادا کیے ہیں اور یہ زرتشتیوں کے کسی ایسے فرقے کی کتاب ہے جو دیوتاؤں اور موثر و توانا روحوں کو بھی یزدان کہتا تھا۔ چند فقرے اس کے بھی سناتا ہوں :

پنام و شنایشن و سپاسول دادار ہورمزد۔ ہر دست مینو و گیتی
بنام و عظمت آگاہندۂ مطلق دادار ہورمزد۔ ہر ہمہ ایزدان آخرت و دُنیا
وہشنایزدا۔ فرہنگا فرہنگ دین مہ است۔ کیش ایدم بن خان دانائے
آفریدۂ او ہستند۔ ہمہ فرہنگہا فرہنگ ایں دین مہ است ذکر و بحث دراں بنیاد خانہ
فرازہ جیدار۔"
ہمہ دانائی ست

خوردہ استا

یہ کتاب عہدِ مذکور سے بھی کسی پہلے زمانے کی کتاب ہے۔ اس میں نمازیں یادعائیں

ہیں۔ سورج، چاند، بعض سیارے، آگ، آبِ رواں وغیرہ کی حمدیں ہیں اور مثلاً صبح کو اٹھیں تو کیا پڑھیں۔ شام کو چراغ جلے تو کیا پڑھیں۔ کھانا کھانے سے پہلے کیا پڑھیں۔ گناہوں سے ندامت کے لیے کیا پڑھیں۔ یہ کتاب باترجمہ ہے اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ ساسان پنجم نے کلام الٰہی سے دری میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں سے بھی چند سطریں سناتا ہوں :

خورشید نیائش بُن (صفحہ 22)

مس دوہ و فیروزگر باد مینوئی خورشید امرگ رایومند خرد ہمند

بزرگ و فیروز مند باد مینوئی خورشید بے مرگ خالص نورمند خردمند

اروند اسپ ہمت و ہبخت و ہورشت

قوی اسپ بہ نیک نیت۔ نیک گفتار۔ نیک کردار نماز بردن

نمو ہور خشتیامہ اروو اسپامہ (سہ بار) بطور نیت

نماز بہ جشمہ خورشید قوی اسپ

خوشنوترہ اہُور ہرمزد۔ ائماستی اہورہ مزدا (سہ بار) بطور نیت

ستائش بہ تو اے داوار ارحرد۔ نماز بتو اے خدائے مہ دانا

سریشچد فردا نیائش دامان (سہ بار۔ بہ سہ آئین۔ نیت۔ گفتار۔ کردار)

نیک و بیش از تمام پیدائش نماز بہ تو

نمود و امشا سپنتا و یسفی ہورہ ہزوشا

نماز بہ شما اے فرشتگان کہ باخورشید ہم کام ہستید

مجھے اس کے الفاظ میں بحث کرنے کی طاقت ولیاقت نہیں لیکن پہلے ہی فقرے میں جو 'اروند اسپ' اور ترجمہ میں قوی اسپ ہے اس کے معنوں پر خیال کرو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ استعارہ کے رنگ میں سورج کی تیز رفتاری دکھائی ہے۔ لیکن سنسکرت کی طرف دیکھو! اس کی انشاپردازی نے بھی سورج دیوتا کی رتھ میں گھوڑے ہی لگائے ہیں اور ہر فقرے میں دو تین لفظ بھی ایسے ہیں کہ ہم تم عام فارسی کے جاننے والے سمجھتے ہیں۔

دساتیر

تقریباً 590ء میں خسرو پرویز کا زمانہ تھا۔ صولتِ عرب دولتِ فارس کو آنکھیں

دکھا رہی تھی کہ ساسان پنجم نے وہ نامے اپنی سلیس اور فصیح زبان میں ترجمہ کر کے ترتیب دیے جو عہدِ قدیم میں سلاطین مہ آباد وغیرہ پر نازل ہوئے تھے۔ مجموعہ مذکور کا نام "دساتیر" ہے۔ یہ "خورداستا" سے بھی پہلے کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ مملکت کے کسی علاقے کی پراکرت ہے۔ اس طرح زور پکڑ گئی ہوگی جس طرح یہاں ایک زمانے میں "پالی" ہو گزری۔ 1816ء میں ملا فیروز پارسی نے اصل مع ترجمہ مذکور کے چھاپی اور فرہنگ آپ لکھ کر ساتھ لگائی۔ اس کے بھی چند فقرے سنیے : نامہ شت وخشور فریدوں (نمبر10 صفحہ 156)

ہوزا میم فہ مزوان ہزہزماس وزماس ہر شیور ہر دیور

پناہم بہ یزدان از منش و خوے بد درشت گمراہ کنندہ براہ بد برندہ

فہ شید شمتاے ہر شندہ ہر ششگر زمریان فرو ہیدرد۔

بنام ایزد بخشائندہ بخشائشگر مہربان دادگر

ہَے پریسہ دم فرپوداہتریم منہو شام ویزدشام ہر شیدم وارجم کاچہ ہونیرا ہیمی فہ فرجیشوری بچاریدم

اے فریدوں پور آبتین بر مردمان و جانوران بے آزار بخشیدم و از گناہ ایشاں گزشتم و تراکہ دوست منی وجہاخ کاسمرندہ تمور دردم۔

بہ پیغمبری گزیدم۔ وجہان راپرستندہ تو کردم

مازاد فروز آباد کاجیوزکم۔

آئین بزرگ آباد را زندہ کن

عزیزانِ وطن! عبارت مذکور کے باب میں کیا کہوں؟ فریدوں اور اس کے باپ آبتین کو تو سب جانتے ہیں۔ دیکھو! یہاں کیسی صورت بدلے بیٹھے ہیں اور الفاظ اور افعال کو کوئی کیا پہچان سکے۔

اور پہلے ہی دو جملوں کے معنی پر خیال کیا؟ **اَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** اور ہر نامہ کا عنوان انھی دونوں سے تاجدار ہے۔ اللہ اللہ۔ جہاں دیکھو اسی کے نام میں پناہ ہے اور اسی کا نام ہر جگہ کام سنوارتا ہے۔

اس کی عبارت اور طرزِ ادا کی تعریف نہیں ہو سکتی کہ حکمتِ الٰہی، حکمتِ اخلاق، معرفت کے مطالب اور اَور مضامین ہیں اور چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں۔ باوجود اس کے ہر فقرہ اپنا حق آپ ادا کرتا ہے۔ پہلے کا کام دوسرے پر ملتوی نہیں۔ استعارہ و تشبیہ یا مبالغہ کے

رنگ نے اصلیتِ مضمون پر پردہ نہیں ڈالا اور لفظی صنعتوں نے معنوں پر اندھیرا نہیں کیا۔

پیارے دوستو! مفلس معلومات کے کیسہ میں اور سرمایہ نہیں کہ ان ہزاروں برس کی پرانی زبانوں پر کوئی سندی تحقیق پیش کرے اور یورپ کی ہر سالہ تحقیقیں رہی سہی عقل گم کرتی ہیں۔ سال گزشتہ کی ایک تصنیف سے منکشف ہوا کہ زرتشت ساسانیوں کے عہد میں سنہ عیسوی سے تقریباً 5 سو برس پہلے ہوا ہے اور اس کی تصنیف "اَوَستا" تھی۔ ہم استا کہتے تھے اور جو کچھ اسے سمجھتے تھے وہ غلط فہمی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے 20 باب تھے۔ 19 گم ہو گئے۔ ایک "وندیداد" باقی ہے۔ جن لوگوں نے اکیسواں باب بھی کہا ہے وہ غلطی ہے۔ پیغمبر اسلام کے فضائل و معجزات سن کر اس قسم کے مضامین پیچھے لکھے گئے اور 'اَوَستا' کا اکیسواں باب کہلائے۔ (یہ بھی کہتے ہیں کہ)

زرتشت کے شاگردوں اور بعد کے موبدوں نے بہت کتابیں لکھیں۔ وہ اور زبان میں ہیں۔ اس زبان کا نام "ژند" ہے۔ غلط فہمی تھی جو سمجھتے تھے کہ "ژند" زرتشت کی پہلی کتاب کا نام ہے اور وہی دین کی بنیاد ہے (کہتے ہیں) کچھ عرصے کے بعد جو کتابیں تصنیف ہوئیں، پہلوی زبان میں تھیں۔ پہلوی خط کا پڑھنا بہت مشکل تھا۔ ادنیٰ بات یہ تھی کہ 4 5 حرفوں کے ایک مجموعہ سے کئی لفظ پڑھے جاتے تھے اس لیے قریبی زمانہ آمد اسلام کا تھا کہ زبان اور خط کو بدل دیا۔ اس زبان کا نام "پاژند" ہے۔ اسی میں "مینوئ خرد" وغیرہ کتابیں ہیں اور وہ فارسیِ حال سے بہت ملتی جلتی ہیں (کہتے ہیں کہ) "اَوَستا" کے معنی معلوم نہیں۔ وہ بھی غلط سمجھے تھے جو لکھ گئے استا بمعنی حمد ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان وہمیاتِ پریشاں سے گھبرا کر کہتا ہوں کہ پرانی ہڈیوں کے اکھیڑنے سے کچھ حاصل نہیں۔ ہزاروں برس گزر گئے۔ ان کے بولنے والے خاک در خاک ہو گئے۔ رہنما ملتا نہیں۔ اٹکل پچّو باتوں سے کیا فائدہ۔ البتہ فائدہ ہے تو زندہ زبان کی جستجو میں ہے کہ کیسی ہڈیاں تھیں جن پر گوشت پوست چڑھ کر یہ پتلا بن گیا جس کو سب فارسی کہتے ہیں۔ اور وہ کیسی فارسی تھی جس سے عرب کی زبان نے کچھ رنگ اتار دیا، کچھ چڑھا دیا اور اس صورت کی یہ مورت بنا دی جو آج زبانوں پر چلتی اور کاغذ پر دوڑتی ہے۔

ہماری درسی کتابیں زبانِ فارسی کے باب میں کیا کہتی ہیں؟

فارس کی زندہ زبان اپنی تاریخ کے بتانے میں مردہ زبان سے کم نہیں۔ بڑے بڑے محقق گزرے مگر جو ہیں یہی لکھتے ہیں کہ فارسی زبانیں 7 قسم کی ہیں۔ فارسی، دری، پہلوی، ہردی، سکوی، زاولی، سغدی۔ مدت تک اس معمّے میں عقل حیران تھی کہ 7 قسم کی فارسی کے کیا معنی؟ اور کیسی زبانیں ہوں گی جن کی نظم نثر۔ کسی تصنیف یا لفظ کا پتہ نہیں ملتا۔ جب مختلف زبانیں دیکھیں اور ان کے تاریخی حالات معلوم ہوئے تو آنکھیں کھلیں اور یہ عقدہ حل ہوا کہ اسلام کے قریبی عہد میں یہ پراکرت زبانیں ہوں گی۔ پاس پاس کے وقتوں میں سلطنت اور تصنف کے زور سے جم گئیں۔ ان کے الفاظ بھی ملتے جلتے ہوں گے۔ متقدمین کے پاس کچھ کچھ نوشتے بھی ہوں گے۔ ان کے متاخرین نے بڈّھوں سے ذکر سن کر قسمیں باندھ دیں اور بے شک! نہ لکھتے تو اپنے عہد میں بے خبر کہلاتے۔ ہاں یہ کوتاہی ہوئی کہ نمونے نہ دے گئے۔ انھیں ان وقتوں کی کیا خبر تھی۔ خیر اب یوں سمجھو کہ :

''فارسی'' زندہ ہے اور اپنے زور سے اپنا کام کر رہی ہے۔ دری اور پہلوی مر گئیں۔ اس کی بدولت برائے نام زندہ ہیں۔

''4 ہروی'' ہرات اور اس کے علاقے کی زبان ہو گی۔ عہد قدیم میں وسیع مملکت تھی۔ اب بھی صدہا کوس تک جنگل ویران پڑا ہے۔

''5 سکری'' سیستان کو عہد قدیم میں سکری کہتے تھے۔ ع چوں تاختن رستم سکری بہ پسر بر (رستم و سہراب کا اشارہ ہے)۔ رستم حامی ایران کا وطن تھا۔ خدا جانے اس وقت کہاں تک آباد ہوگا۔ اب بھی سیکڑوں کوس ویرانے پڑے ہیں۔

''6 زاولی'' قندھار۔ غزنی وغیرہ شہرہائے خراسان کی زبان ہوگی۔ اسی واسطے شعرا نے محمود غزنوی کو محمود زابلی بھی لکھا ہے۔

''7 سغدی'' سمرقند کے قرب و جوار میں سرسبز و شاداب قطعہ پر ایک آباد اور نامور شہر تھا۔ اس علاقہ کو دنیا کی 4 بہشتوں میں سے ایک بہشت جانتے تھے۔ اس کی زبان سغدی کہلاتی ہوگی۔

بہر حال زبان ہائے مذکورہ جب ہوں گی تب ہوں گی۔ ہم پرانی لکیروں کے فقیر اب

تک وہی صدا کہے جاتے ہیں کہ فارسی کی 7 قسمیں ہیں۔ اچھا اب جہاں تک کہ معلوم ہوئے۔ پہلی 3 زبانوں کے حالات بیان کرتا ہوں اور ان میں فارسی کو اخیر پر ملتوی رکھتا ہوں کہ اس کا دامن بہت پھیلا ہوا ہے۔

دری

ہماری لغت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کسی زمانے میں یہ دربار کی زبان تھی اس لیے اسے دری کہتے تھے اور وہ یہی فارسی تھی۔ مگر فارسی میں بعض حروف کم زیادہ کیے ہوئے ہیں۔ دری میں الفاظ اپنی اصلیت پر ہوتے تھے۔

بعضے کہتے ہیں کہ درہ کوہ کے لوگوں کی زبان تھی اور اس کی اصلیت میں فصاحت شہر کی ترمیم نے عمل نہیں کیا تھا۔ جس طرح کبک دری کہتے ہو اسی طرح زبان دری کو سمجھو۔ بندہ آزاد کہتا ہے۔ شیخ بوعلی سینا نے "حکمۃ فارسیہ" کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں اس کتاب کو دری فارسی میں لکھتا ہوں۔ پس اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ جس فارسی کو دربار نے شستہ ورفتہ کر کے محاورے کا سکہ لگایا ہو وہی دری زبان ہے اور نظامی کے اشعار جابجا اس کی تائید کرتے ہیں :

الفاظ حاشیہ)

دری	عام زبان
ابریشم	بریشم
اسپند	سپند
اشکم	شکم
اشتر	شتر
برو	رَو۔ یعنی جا
بدَوْ	دَوْ۔ یعنی دوڑ
بشنو	شنو۔ یعنی سُن
ابر	بر۔ یعنی اوپر
ابے	بے۔ یعنی بے

نظامی کہ نظمِ دری کار اوست
دری نظم کردن سزاوار اوست

پہلوی

ہمارے لغت کے مفلس خزانچی ہر کتاب میں یہی لکھتے ہیں۔ بدانکہ زبانِ پہلوی منسوب ست بہ پہلو۔ ابن سام۔ ابن نوح۔ بعض کہتے ہیں کہ پہلو شہر کو کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ

چھاؤنی لشکر کو کہتے ہیں اور سند میں فردوسی کا شعر پڑھتے ہیں :

ز پہلو بروں رفت کاؤس شاہ ز ہر سو بہے گشت گردِ سپاہ

بعضے کہتے ہیں کہ پہلوانانِ فارس یہ بولی بولتے تھے۔ اس لیے پہلوی اور پہلوانی بھی کہتے تھے۔ فردوسی :

اگر پہلوانی نہ دانی زباں بہ تازی تواردند را دجلہ خواں

پہلو۔ ایک راگ کا نام بھی ہے۔ یار میگوید بہ بانگ پہلوی۔ نظامی

بہرامے گنجش چو پدرام کرد بہ پہلو زبانش بَہرے نام کرد

ملاّ خیر اللہ مہندس اس کی شرح میں لکھتے ہیں: ایں زبان اہلِ شہر نیست بلکہ زبان اطراف دیار است و اختیار کردن۔ زبان اطراف باوجود زبان شہر بنا بر آنست کہ چوں تختگاہ سلاطین مجمع اصناف خلائق می باشد۔ زبان مردم آنجا بر صرافت خود نمی ماند۔ لہٰذا فارسی را تعریف می کنند بہ فارسی ٹھہ کہ معرّب کہ و مخفف کوہ است۔ و فارسی 'دری' ہم ازیں قبیل۔ و فضلائے متقدسم در حلِ معانی لغات سند ہا از بدویان و اعراب گرفتہ اند۔

میرے نزدیک یہ رائے اصلیت کے مخالف ہے۔ بات یہ ہے کہ فصحائے فارس نے کسی موقع پر اہلِ کوہ کی زبان کو کہ خالص اصلیت پر ہوتی تھی۔ "دری" کے لفظ سے سراہا ہے۔ کسی موقع پر اہلِ شہر کی زبان کو کہ تراش پا کر شُستہ و رفتہ اور بامحاورہ ہو جاتی ہے۔ "پہلوی" کہہ کر تعریف کی ہے۔ عالمِ سیاحت میں محققانِ ایران کے بیان سے اس کی تائید ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ بزرگانِ سلف اصفہان۔ رے (اب یہیں تہران آباد ہے) اور "نہاوند" کے علاقہ کو "پہلو" کہتے تھے کہ آباد، شاداب، مہذب اور دربار دار شہر تھے اور ان کی زبان کو "پہلوی" یعنی شہری کہتے تھے۔ باقی کو "دری" اور "تبری" کہ تبرہ۔ پشتہ اور پہاڑی کو کہتے ہیں۔ اسی سے تبرستان بمعنی کوہستان ہے۔

نیا نکتہ یہ ہے کہ "پہلوی" کا مٹا ہوا سرغ ہندستان میں آنکلا۔ کھتری فرقوں کی تفریق میں منوجی اپنے باب 10 اشلوک 43 میں کہتے ہیں: ان کھتری ذاتوں کے اعمال رفتہ رفتہ شاستر سے نامطابق ہوتے گئے اور برہمنوں سے روگرداں ہوگئے، اس لیے حیوانیت کو پہنچ گئے۔ 1 بونڈر۔ 2 اوڈر۔ 3 دراوڑ۔ 4 کامبوج۔ 5 یون۔ 6 شک۔ 7 پارد۔ 8 پلہوَ 9 چین 10 کرات۔ 11 درد۔ 12 کہش۔ (شارح ہر فرقہ کی توضیح کرتا ہے اور ان میں

سے نمبر 8 'پَلہَو' کے باب میں کہتا ہے۔ یہ ایران میں آباد تھے۔ جن کی "پہلوی" زبان میں ان کا نام باقی ہے۔

کولڈ اسکر صاحب نے اپنی گریمر میں لکھا ہے کہ پَلہَو पल्लव ایک کم رتبہ فرقہ کھتریوں کا ہے۔ یہ راجہ سگر کی رعایا تھے۔ اپنے ولی نعمت کو بہت ستایا۔ اس کی بددعا سے یہ پھل پایا۔ اس فرقہ کے اکثر لوگ ہندوستان کے جنوب میں آباد ہیں۔ کسی زمانے میں فارس کے کسی علاقے سے آئے تھے اور جنوب مغرب کے رستے گزرے تھے۔ ان کے ملک کا نام پہلو تھا اور زبان پہلوی تھی۔ نہیں معلوم کہ وہ علاقہ کہاں تھا۔ ہماری کتابوں میں کوئی تصنیف نظم نثر یا فرہنگ ایسی نہیں ملتی جس سے ان تینوں کی طرزِ عبارت اور ترکیبِ الفاظ کی کیفیت معلوم ہوتی ہو۔ فردوسی نے "شاہنامہ" میں ایک جگہ لکھا ہے :

بداں آبداری و آں نیکوئی　　　زباں تیز بکشاد بر پہلوی

کہ شاہا ہژ بر اسپہبد تنا　　　خجستہ گوا گردِ شیر اوژنا

آگے پھر متعارف فارسی کے شعر ہیں۔ ہمارے قیاس آج تک شکوک واوہام کے اندھیرے میں ٹٹولتے پھرتے تھے اور حیران تھے کہ پہلوی کیا ہوگی۔ چند سال ہوئے "اردائے دیراف" کی اصل کتاب نے آکر روشنی کردی۔ اس کی کیفیت سنیے :

اردائے دیراف۔ اردشیر بابکاں خاندان ساسانیہ کا بانی تھا۔ سکندر نے جس سلطنت کو بنیاد سے اکھیڑ کر پھینک دیا تھا۔ اس ہمت والے بادشاہ نے پھر اس کا قلعہ باندھ کر بلند کیا اور دین زرتشت کو بھی دوبارہ روشن کیا۔ تمام علمائے مذہب اور شرفائے قوم کو شہر شہر سے بلایا اور چاہا کہ مذہب کی پریشانی کو جمعیت کے سلسلے میں لائے۔ 40 ہزار دانائے دیندار جمع ہوئے۔ بادشاہ کی فرمائش سن کر سب نے کہا کہ "اردائے دیراف" کے سوا کوئی اس مہم کو سرانجام نہ کر سکے گا۔ اسے بلایا اور آتشکدۂ خاص میں تختِ زرّیں پر بٹھایا۔ اس پیر مردِ کہن سال نے بموجب آئینِ زرتشت کے 3 جام شراب ہیربد کے ہاتھ سے پیے اور وہیں چادر تان کر لیٹ رہا۔ 6 دن تک دنیا سے بے خبر سوتا رہا۔ سب اس کے گرد بیٹھے تھے اور معرفتِ الٰہی کے زمزمے گا رہے تھے۔ ساتویں دن ہوش میں آکر اٹھا اور دو کاتبوں کو پاس بٹھا کر لکھوانا شروع کیا۔ جو کچھ اس خواب کا بیان لکھا گیا۔ وہی کتاب "اردائے دیراف" ہے۔ بندہ آزاد نے اس تمام کتاب کو دیکھا۔ لکھا ہے کہ مجھے فرشتے لے گئے۔ پُلِ صراط پر گزرا۔ دوزخ کو دیکھا۔ اہلِ دوزخ کو دیکھا۔ قسم قسم کے

گنہگاروں کا حال لکھا ہے اور ان کے عذاب بھی ایسے لکھے ہیں کہ حرفوں کو دیکھ کر روح کانپتی ہے:

زاہد! خوفِ خدا چاہیے دوزخ سے نہ ڈر
یہ بھی اک تجھ کو ڈر گاسا دیا تاکہ ڈرے

اسی طرح اور بہت سے حالات ہیں۔ اسی میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی زبان پہلوی ہے۔ چند فقرے اس کے سنیے :

اردائے دیراف۔ صفحہ 13

(1) رویا نوے دِلمن دیراف مِن تنو دل چکات دَاینک چنیوت پہل وزلوند
روح دیراف از جانبِ تن جدائی گزید و از چنیوت پل گزشت

(2) و ہفتون یوم شپانو لکھوار (لخوار) یا توند ومین تنو وزلوند
و ہفتم روز شب باز آمد و درمیان تن رفت

(3) دیراف مدم خاست چیگون اَمتِ مِن زک خلموے بسیم اخیزید
دیراف ہماں دم برخاست چنانکہ گویا از یک خوب خوش برخاستہ

(4) و ہو من ے نشن و خورم۔ و الہام نیک خیال کرد و خورم

اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ پہلوی زبان ایران میں ایسی ہے جیسے ہندستان میں کوئی مہذب پراکرت اور ایک پہلو اس کا عرب سے بھی ملا ہوا ہے۔" اس فقرہ کی یہاں پوری تصدیق ہوتی ہے۔ دیکھیے 4 سطر کی عبارت ہے اور پہلے ہی فقرہ میں دیکھو۔ "مِن" عربی ہے۔ "تن" فارسی کا لفظ ہے کہ اب بھی عام ہو رہا ہے۔ "چنوت پھل" وہی "چنیود پل" ہے کہ فارسی فرہنگوں میں لکھا ہے۔

دوسرے فقرہ میں "ہفت" فارسی بھی۔ سنسکرت بھی۔ "یوم" عربی۔ "شپا" کو فارسی بھی کہو۔ سنسکرت بھی۔ "یاتوند" کو دیکھو۔ شاید "اَتے"۔ "یاتی" عربی کے فعل ہیں۔ زبان مذکور کی طاقت نے "یاتی" سے فارسی کا فعل مشتق کر لیا ہے۔ "ومین" (بین) عربی ہے۔ "زک" (زاک) عربی ہے۔ "بسیم" عربی ہے۔ "خیز" فارسی ہے۔ "خورم" فارسی ہے۔

فارسی

یہی اقبال مند زبان ہے جس کے لیے زمانہ نے سب زبانوں کے چراغ گل کر دیے اور آج تک کل ملک و مملکت پر اس کا سکہ چل رہا ہے۔ عہدِ قدیم میں فارس کا علاقہ کنارۂ جیحون سے فرات تک اور باب الابواب سے کنارہ امان تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر صوبے صوبے کا نام جدا ہو گیا۔ اب فارس بھی ایک صوبہ ہے۔ شیراز، بہبہان، کازرون، تبریز، جہرم، لار۔ وغیرہ اس کے مشہور شہر ہیں۔ پہلے اصطخر اس کا دار السلطنت تھا۔ کئی سو برس سے شیراز دار الملک ہے اور زبان آج تک فصاحت کے دودھ میں شیرہ گھولتی ہے۔ سعدی شیرازی فرماتے ہیں :

یارب زبادِ فتنہ نگہدار خاکِ پارس　　　چندانکہ خاک را بود و باد را بقا

یہی فارس اور یہی فارسی تھی جس کے حق میں خواجہ حافظ نے فرمایا ہے :

خوبانِ پارسی کو بخشندگانِ عمراند　　　ساقی بدہ بشارت پیرانِ پارسا را[1]

اب مجھے چاہیے اس فارسی کا نمونہ دکھاؤں جو ورودِ اسلام کے وقت فارس میں بولی جاتی تھی۔ پھر معلوم ہو جائے گا کہ زبانِ عرب نے وقت بوقت اس پر کیا کیا اثر کیے اور آج کیا حال ہے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ 590ء میں جبکہ اسلام کا طلوع اور خسرو پرویز کا زمانہ تھا۔ ساسان پنجم نے "دساتیر" کو ترتیب دیا۔ فقرہ بہ فقرہ فارسی میں ترجمہ کیا اور ضرورت کی جگہ تفسیر بھی لکھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس زمانے میں ترجمہ ہوا اور اہلِ تحقیق نے اسے زبانِ فارسی تعبیر کیا، وہی فارسی اس وقت ملک کی زبان ہو گی۔ "دساتیر" کے چند فقرے ابھی بیان ہوئے مگر اب ایک مسلسل عبارت ساسان پنجم کی تحریر کی سناتا ہوں جو نامہ کہ زرتشت پر نازل ہوا تھا یہ اس کے ایک فقرہ کی تفسیر ہے (دساتیر کے فقرہ کا ترجمہ) صفحہ 191

اے پیغمبر دوست! زرتشت! 'پوراسفتمان' چوں 'چنگر نگاچہ'[2] آمد از یک نسک

---

1 یہاں 'پارسا' باشندۂ پارس ہے۔ پرہیزگار نہیں۔

2 اصل دساتیر کی عبارت میں 'سنگر نگاس' لکھا ہے۔ ساسان پنجم نے فارسی ترجمہ میں 'چنگر نگارچہ' بنا دیا ہے۔ اگر وہ شخص ہندو ہو گا تو شاید پہلا لفظ 'شنکر' ہو کہ 'شوجی' کا نام ہے۔ شاید 'شنکر اچارج' ہوں۔ اُن کے وقت میں 'بیاس جی' کہاں؟ اور ممکن ہے کہ بودھ مذہب کا کوئی عالم ہو۔ اس نام میں میری عقل کام نہیں کر سکتی۔

اوستا براہ راست گرائید و بہند بازگشت (تفسیر از ساسان پنجم)

چنگر نگاچہ دانائے بود بہ فرزانگی و زیرکی شناختہ شدہ۔ و موبدانِ جہان بشاگردی او مے نائید ند۔ چوں سخن از فرّہ و خشور یزدان زرتشتِ اسفنتمان بشنید بآہنگِ برانداختنِ آئین بایران آمد۔ چوں بہ بلخ رسید۔ بے آنکہ از زبان سخنے بیروں دہد و پرسشہا کند۔ پیغمبر یزدان زرتشت باو گفت۔ ہرچہ در دل داری بزبان مسپار! و راز دار! پس بفرزانہ شاگرد خود گفت۔ یک نسک اُوستا بروخواں۔ دریں فجستہ نسک سراسر پژوہشہاے چنگر نگاچہ بود۔ باپاسخہا کہ باپیغبر خود میگوید کہ چنیں کسے آید بدیں نام۔ و نخستیں پرسش او اینست۔ و پاسخ آں چنیں۔ چوں چنگر نگاچہ چنیں فرجودے دید۔ بآئین شد۔ و بہند بوم بازگشت۔ دریں فرخندہ کیش استوار ماند۔ بخشندہ یزدان ما راو دوستان ما را دین بہین می بخشاد۔

میرے دوستو! تم دیکھتے ہو! یہ اچھوتی فارسی ہے اور اس عالم میں ہے کہ عربی نے اسے آواز تک نہیں چھوائی۔ بڑی خوشی ہوئی تھی جس دن یہ صاف سطح میرے ہاتھ آئی تھی اور معلوم ہوا تھا کہ عربی نے اس پر کس کس عہد میں کیا کیا دستکاری کی۔ تم بھی غور کرو، اور اسی سے یہ بھی سمجھ لو کہ کس طرح الفاظ محاورے سے گر کر مردار ہو جاتے ہیں اور نئے الفاظ ولادت پاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھ لو کہ زبان کی طولِ عمر میں تغیرات مذکورہ فقط الفاظ ہی پر عمل نہیں کرتے، لفظوں کے جوڑ بند میں بھی بڑے فرق آجاتے ہیں۔ مختصر یہ سمجھ لو کہ یہاں برج بھاشا کا یہ حال ہوا جو آج تم بول رہے ہو۔ ایران میں اس کا یہ حال ہوا جو آج پڑھ رہے ہو۔

اسی سلسلہ میں ترقیِ طبع کے لیے ایک اَور میدان دکھاتا ہوں۔ خیال کرو! ہماری پراکرت زبانوں میں اکثر سنسکرت کے لفظ رنگ بدلے ہوئے موجود ہیں۔ دیکھ لو اسی طرح وہاں کی پہلوی، دری اور فارس میں 'ژند' کے الفاظ ایسے نظر آتے ہیں جیسے راکھ میں چنگاریاں اور ان میں جس زبان کو علم اور دربار سے جتنی زیادہ قربت رہی اتنا ہی اس میں 'ژند' کا اثر زیادہ ہے۔ چند الفاظ تمثیلاً کہتا ہوں۔ انھیں دیکھو۔ بلکہ تمھاری آج کی فارسی میں بھی بہت کچھ الفاظ زبانہاے مذکورہ کے موجود ہیں اور لطف یہ ہے کہ اب تک سنسکرت میں آواز ملاتے ہیں :

فارسی	پہلوی	ژند	پاژند	سنسکرت
اگر	اگر	•	اگر	•
اکنوں	اکنی۔اکنیں	•	اکنیں	•
گمان	کمان	•	گمان	•
بے کنارہ	اکنارک	•	اکنارہ	•
پاداش۔باداش	پاداہشن	•	•	•
خان۔خانہ	خوانو۔اخوان	•	اخان	•
اختر	اختر	اختر	اختر	•
ناسپاس	اسفاس	•	ان سپاس	•
آشتی	آست	استکیا	آشتی	آسکتی आसक्ति
انبار	انبار	ہان۔ہان بار	انبار	•
اند۔اندک	اند	•	اندک	•
اندر	اندر	انترہ	•	انتر अन्तर
برنا	پُرناک	اپرنا	اپُرنا	•
استخوان۔ہستہ	است۔استک	•	است	اَستھی अस्थि
پیمانہ	پاتمانہ۔پتیمانہ	•	پیمان	پرمان प्रमाण
آگاہی	آگاسی	•	•	•
درون	درون	درونا	درون	•
دور	دور	دورا	دور	دور दूर
نیرد	نیرک۔نیرکن	•	•	نرو नीरू تندر
نو	نوک	نوا	نوا	نوا नवा
کنارہ	کنار۔کنارک	کرانہ	کنارہ	•
کالبد	کارپوت۔کارپو	•	•	کلیور कलेवर
دُش	دُش	دُش	دُش	دُشٹ दुष्ट
بادافراہ	پاتفراہ	پاے تفرار سا	پادافراہ	•
شرم	شرم	فشارما	شرم	•

اب پھر اس میدان میں آنا چاہیے جہاں سے فارسیِ قدیم پر نظر ڈال کر فارسیِ موجودہ پر نظر کر سکیں اور عہد بہ عہد دیکھیں کہ کیونکر زمانہ اسے وقت کی زبان بنا کر اہلِ زبان کے منہ میں دیتا رہا۔

عزیزانِ وطن! جن لوگوں کو مختلف قوموں اور مختلف زبانوں کے لوگوں میں گزارے کرنے پڑے ہوں گے، وہ خوب جانتے ہیں کہ جب ایک قوم دوسری قوم سے ملتی ہے تو جس طرح ان کے کاروبار خلط ملط ہوتے ہیں اسی طرح ان کی زبانیں بھی مل جل جاتی ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہیں :

(1) اکثر نئی چیزیں، نئے کام کاج ایک دوسرے سے حاصل ہوتے ہیں اور وہ اپنے نام اور افعال اور استعمال کے خیالات بھی ساتھ لاتے ہیں۔

(2) جب دونوں کو ایک جگہ گزارا کرنا پڑتا ہے تو اس غرض سے کہ ایک شخص دوسرے کو اپنا مطلب جلدی سمجھادے اور کام چلتا کرے۔ 4 لفظ اپنے بولتا ہے۔ 2 اس کے کہہ جاتا ہے۔

(3) اس میں گلہ اور زبان و دہان کی مغائرت لفظوں کے تلفظ کو بدلتی ہے۔ جس سے عرب نے 'معرّب' الفاظ بنائے اور فارسی نے 'مفرّس' وغیرہ وغیرہ اور حقیقت میں اس کا کوئی قاعدہ نہیں۔ جو زبانوں پر چڑھ گئے وہ چڑھ گئے۔ اکثر لفظ وقتوں کے انقلابوں سے بدلتے بدلتے ایسے ہوگئے کہ بالکل پہچانے نہیں جاتے۔ عبارت ہائے مذکورہ بالا میں ناموں ہی کو دیکھو۔ بھلا ان تبدیلیوں کا قاعدہ کوئی کیا باندھ سکے اور لفظوں کو کیا پہچان سکے۔

(4) آٹھ پہر ایک جگہ رہنے سہنے سے بے ارادہ بھی ایک کی زبان سے دوسرے کے لفظ نکل جاتے ہیں اور آپس کی محبت سے ایک کو دوسرے کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ کے علاوہ گیت، کہاوتیں، شعر زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر وہی بات ہے کہ حضرت اقبال جس طرح فتح یابوں کی تلوار میں چمک دیتے ہیں۔ اسی طرح گفتار، رفتار، وضع، لباس، کل کاروبار کو ایسا چمکیلا اور خوشنما دکھاتے ہیں کہ وہی خاص و عام کو بھاتے ہیں۔ خود بخود وہی باتیں مطابقِ عقل، وہی باتیں اصول تہذیب، وہی آرام کا سامان، وہی زیبا اور خوشنما، وہی شان و شکوہ بن کر مصلحتِ وقت نظر آتی ہیں۔ اور وہ اس وقت غیر الفاظ کو فقط ادائے مطلب کا اوزار ہی نہیں سمجھتے بلکہ انھیں بول کر فخر کے چہرے چمکاتے ہیں۔

عزیزانِ وطن! تقریر کا سلسلہ طول کھینچ گیا اور بات کہیں سے کہیں جا پڑی۔ نقطہ مطلب پر پھر خیال جمانا چاہیے۔ جس کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ موجودہ فارسی کی اصل کیا تھی۔ دوسرے یہ کہ عرب اور ترک کے اختلاط سے اس میں کیا کیا تغیر ہوئے۔ پہلا پہلو دیکھ لیا، دوسرے کے لیے کمر باندھنی چاہیے کہ جلسۂ آئندہ میں صدی بہ صدی کے رنگ دکھاؤں اور تغیر کے سبب بتاؤں۔ خدا کرے کہ وقت وفا کرے اور فکر یاری دے۔

عرفی دمِ پیر یست قدمِ دیدہ بنہ — ہر گام کہ مے نہی پسندیدہ بنہ
از عینکِ شیشہ ہیچ نکشاید ہیچ — لختے ز جگر تراش و بردیدہ بنہ

تیسرا لکچر

19 فروری 1872ء

زبانِ فارسی نے اسلام کے بعد کیا کیا رنگ بدلے

عزیزانِ وطن! گزشتہ لکچر میں آپ نے سن لیا کہ جب اسلام کا قدم زمینِ فارس پر آیا تو فارس کی زبان کیا تھی۔ اس سے پہلے لکچر میں یہ بھی سن لیا کہ جب اقبال نے ملک تسخیر کیا تو زبان نے تقریر و تحریر دونوں پر قبضہ کر لیا۔ تقریباً 3 سو برس تک زبان مذکور موت کی نیند سوتی رہی۔ لیکن دوسری صدی ہجری سے عباسیہ کا دور تھا کہ عیاشی نے خلافت کو سلطنت بنایا اور غفلت نے سلطنت کو ضعیف کرنا شروع کیا۔ دربار میں رنگ رنگ کے مصاحب، محلوں میں قوم قوم کی عورتیں بھر گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مملکت میں ایک ایک ہمت والا خودسری کی تلوار باندھ کر بادشاہ بن بیٹھا۔ خلفا فقط دارالسلام بغداد میں تبرک بن کر رہ گئے۔ لیکن قرابت نبوی کا نام درمیان تھا اس لیے حالتِ مذکورہ نے طول کھینچا۔

زبانِ فارس کے لیے قدرتی سامان یہ ہوا کہ سامانیوں نے ماوراء النہر میں قومی سلطنت کا نشان قائم کیا۔ امیر اسماعیل سامانی نے ترکستان، خراسان، اصفہان وغیرہ پر حکومت پھیلا دی۔ جب تک خاص عرب حاکم تھے تب تک عربی زبان ملکی زبان کو دبائے رہی۔ اب حاکم وقت خود اسی خاک کا پتلا ہوا۔ وہ بہرام چوبیں کی اولاد تھا۔ جس طرح عرب کو اپنی عربی کی

محبت تھی۔ اسے اپنے باپ دادا کی زبان کی محبت ضرور ہو گی۔ غرض خواہ اس محبت سے خواہ ملکی مصلحت سے اس نے عربی زبان کی وہ پابندی نہ رکھی ہو گی جواب تک تھی۔

342ھ میں تمام دفتر فارسی ہو گئے۔ 350ھ کے قریب یہاں تک نوبت پہنچی کہ منصور سامانی کے وزیر نے **تاریخ طبری** کا ترجمہ فارسی میں کیا اور رودکی شاعر جسے نظم فارسی کا آدم اوّل کہنا چاہیے درباروں اور جلسوں میں غزلیں اور قصیدے گانے لگا۔ تھوڑے عرصے کے بعد محمود کا دور آیا۔ اس کے عہد میں بہت تصنیفیں نظم و نثر میں ہوئیں۔ ایک اور تاریخ فارسی میں لکھی گئی۔ پھر **تاریخ بیھقی** تصنیف ہوئی۔ اس میں محمود اور آلِ محمود کا دن دن کا حال ہے۔ محمود کے عہد میں عنصری۔ عسجدی۔ فرخی وغیرہ فارسی کے بڑے بڑے نامی شاعر تھے۔ فردوسی کا **شاھنامہ** درفش کاویانی کی طرح اس کی ناموری کا نشان اڑاتا ہے۔ میں اس موقع پر نظم کو قلم نہ چھواؤں گا۔ نظم کی تاریخ کو ایک الگ لکچر پر منحصر رکھ کر اس وقت نثر کے باب میں گفتگو کرتا ہوں۔

تم نے پڑھے طوطے اور بولتی مینا کو دیکھا ہو گا۔ جب تک پنجرے میں ہوتے ہیں سیکھی ہوئی بولیاں بولتے ہیں۔ جب پنجرے سے چھٹ جاتے ہیں تو درختوں پر جاتے ہی اپنا جنگلا بولنے لگتے ہیں۔ اس وقت کے تعلیم یافتہ کچھ ایرانی نسلوں سے تھے، کچھ عرب کی نسلوں سے خلط ملط تھے۔ کئی سو برس کے بعد جو سیکھی سکھائی زبان چھوڑ کر اپنے عزیز بزرگوں کی بولی بولنے اور لکھنے کا موقع پایا تو طبعی آوازیں پھر نکلنے لگیں۔ ان کا قدیمی انداز تم ابھی سن چکے ہو۔ اب اگرچہ 3 سو برس کی مدّت نے محاورہ کو بہت توڑا ہے پھر بھی تازہ تصنیفوں میں دیکھو وہی چھوٹے چھوٹے فقرے اصلی مطلب کو ادا کرتے ہیں۔ سادی عبارتیں، استعارہ، تشبیہ اور مبالغہ کی رنگ آمیزی سے پاک ہیں۔ مرادف فقرہ یا مرادف لفظ کا نام نہیں۔ جو ہیں مطلب کی باتیں ہیں۔

میں اس عہد کی عبارتیں بیان کرتا ہوں اور جہاں جہاں انقلابِ زمانی نے اصلاح کی ہے ان کے امتیاز واضح کرتا ہوں۔

ترجمہ تاریخ طبری

ایں تاریخ نامہ بزرگست کہ گرد آوردہ ابو جعفر محمد ابن جریر یزید الطبری رحمۃ اللہ کہ شہریار خراسان۔ ابو صالح بن منصور بن نوح۔ فرماں داد دستور خود را ابو علی محمد بن محمد البلعمی را کہ ایں تاریخ پسر جریر است۔ پارسی گرداں ہر چہ نیکو تر۔ چنانکہ اندر روے نقصانے نیفتد۔

ایں تاریخیست معتبر کہ ابو جعفر محمد ابن جریر یزید طبری فراہم نمود۔ و ابو صالح بن منصور ابن نوح ابو محمد ابن بلعمی وزیر خود را فرماں داد کہ در زبان پارسی بکمال سلاست ترجمہ سازد۔ بنوعے کہ در اصل مطالب نقصانے راہ نیابد۔

پس گوید۔ چوں اندر روے نگاہ کردم و بدیدم علمہا دیدم۔ اندر روے فائدہ بسیار دیدم۔ پس رنج بردم۔ و جہد و ستم برخویش نہادم و پارسی گردانیدم بہ نیروے ایزد عزّ و جل۔

میگوید کہ چوں در روے نگاہ کردم و غور نمودم۔ علمہا دیدم۔ و فوائد بسیار۔ چنانچہ رنجہا بردم۔ و محنتہا کشیدم۔ و بہ نیروے ایزد عزّ و جل آنرا در پیکر پارسی آوردم۔ و بہ توفیق اللہ تعالیٰ۔

و ما خواستیم کہ تاریخ روز عالم اندر روے یاد کنیم۔ انچہ ہر کسے گفتہ است۔ از اہلِ نجوم۔ و از اہل ہر گروہے گفتہ اند۔ از گبر و ترسا و جہود و مسلمان۔ ہر گروہے انچہ گفتہ یاد کنیم اندریں کتاب۔ بہ توفیق ایزد عزّ و جلّ و باللہ التوفیق کہ از روزگار آدم علیہ السّلام تا گاہ رستخیز۔

و خواستم کہ تاریخ آغاز عالم انچہ گروہے از اہلِ نجوم۔ و گبر۔ و ترسا۔ و یہود۔ و مسلمان گفتہ اند۔ دراں ذکر کنم، کہ مدّت روزگار از آدم تا انجام عالم چہ قدر بود۔

و اندریں کتاب محمد ابن جریر ایں حدیث و ما نیز نمودیم تا ہر کہ اندر روے نگرد۔ زود اندر یابد و آسان بود۔

و دریں کتاب مطلب مذکور را مصنّف مؤرّخ و من مؤلّف ذکر کردم۔ تاہر کہ در آں نظر کند زود تر یابد۔ و کارِ دشوار آسان شود۔

حال افریدوں

پس جہاں بافریدوں درست شد کاوہ' بر مال و خزینہ کہ حاصل کردہ بود تمام بروے سپرد۔ و لشکر برداشت و گرد جہاں برآمد۔ و ہمہ جہان از مخالف واز ظالم پاک کرد۔ و ہر کجا حرب کردے آں علم پیش داشتے و فیروز یافتے۔ مدّت بست سال کاوہ' گردِ جہاں میگشت۔ پس افریدوں اصفہاں و آں ناحیت تمام بکاوہ داد۔ واو باصفہان شد۔ ودہ سال بر ولایت بماند۔ پس بمُرد۔

پس سلطنت بر افریدوں مسلم شد۔ و کاوہ بر مال و خزینہ کہ حاصل کردہ بود ہمہ را بوے سپرد۔ پس لشکر برداشت و عالمے را تسخیر نمود۔ و جہان را از دشمن و ظالم پاک کرد۔ و بہر جا کہ جنگ میکرد۔ ہماں علم خود را پیش خود میداشت۔ و فیروزی مییافت۔ مدّت بست سال کاوہ گرد جہاں میگشت۔ پس افریدوں اصفہان و مضافات آنرا بہ کاوہ بخشید۔ واو بہ صفہان رفت ودہ سال فرماں داد و فوت کرد۔

واو را فرزندان بماندند و افریدون ہمہ خواستۂ او بفرزندانش داد۔ مگر آں علم کہ بفال مبارک بود در خزینہ نہاد۔ و بہر حربے کہ رفتے آنرا پیش داشتے۔ ظفر یافتے۔ وبعد از و پادشاہ بپادشاہ مے آمد۔ و عزیزش مے داشتند و ہر یکے پیرایہ و جواہرے چند برآں مے بستند۔ تا وقت یزدگرد شاہ۔

واو را فرزنداں بماندند۔ افریدون تمام اموال بفرزندانش داد۔ مگر آں علم کہ بفالِ مبارک بود در خزینہ نگہداشت۔ و بہر حربے کہ میرفت پیش میداشت۔ و ظفرے یافت۔ وبعد از وے بادشاہ بہ بادشاہ مے آمد۔ و او را محترم میداشتند۔ تا عہد یزدگرد شاہ ہر یکے پیرایہ و جواہرے چند برآں مے افزود۔

چوں مسلمانان خزینہ او غارت کردند۔ او را پیش امیر المومنین عمر خطاب رضی اللہ عنہ آوردند و امیر المومنین بفرمودند تا آں گوہر ہا برداشتند و آں پوست را بسوختند۔

چوں مسلمانان خزینہ او را غارت کردند۔ علم را پیش امیر المومنین عمر خطاب رضی اللہ عنہ آوردند۔ و امیر المومنین فرمود تا جواہر آنرا برداشتند و چرم را سوختند۔

وچنیں گویند کہ افریدون از پس
کاوہ دویست سال بزیست وجہان پر عدل و
داد کرد۔ مغان گویند آتش پرست بود۔ و
ہندواں گویند بت پرست بود۔ ولیکن ایں
دو قول درست نیست۔ درست آنست
کہ بردین نوحؑ بود۔ و دادگر بود۔ و علما و حکما
رادوست داشتے۔ و نخست پادشاہے کہ در
نجوم نگریست او بود۔ و در علمِ طب نیز رنج
برد۔ و تریاق او ساخت۔ و اوّل پادشاہے کہ
بر پیل نشست او بود۔ و پیل را حرب
فرمود۔

واو راسہ پسر۔ مہترین
'تور' نام و میانین 'سلم' و کہترین 'ایرج'۔
پس افریدون ہم بزرگانی خود جہان بر
فرزندان قسمت کردہ تاحیت ترک۔ حرز
و چین و ماچین۔ و مشرق 'تور' راداد۔
و او را 'فغفور' نام کرد۔ و زمین روم و
روس و آلان و مغرب 'سلم' راداد و
او را 'قیصر' نام کرد۔ و اقلیم میان را کہ
آں را ایران زمین خوانند عراقین و
آذربایجان و پارس و خراسان و حجاز
تا حدِّ یمن 'بایرج' داد۔

افریدون او رادوست داشتے و
ولایت شہر ایران بنام او خواند

گویند فریدون بعد از کاوہ دویست
سال بادشاہی کرد۔ و کار جہاں را بر عدل و
داد آورد۔ مغاں گویند آتش پرست بود۔
و ہندواں گویند بت پرست بود۔ و ہر دو
قول درست نیست۔ حق آنست کہ بر
دین نوح بود۔ و داد گر بود۔ علما و حکما را
بزرگ داشتے۔ و نخست بادشاہے کہ بر
نجوم نظر آورد او بود۔ و در گرد آوردن علم
طب زحمت کشید۔ و تریاق او ساخت۔ و
اول بادشاہ او بود کہ بر فیل نشست و فیلاں
را بہ جنگ انداخت۔

او را سہ پسر بود۔ مہترین
تور۔ و میانین سلم۔ و کہترین ایرج۔
پس افریدون، ہم بزندگانی خود مملکت را بر
فرزندان قسمت کرد۔ ناحیت ترک و حرز
و چین و ماچین و مشرق 'تور' را
داد۔ و او را 'فغفور' نام کرد۔ و زمین روم و
روس و آلان و مغرب۔ 'سلم' را
داد۔ و آنرا 'قیصر' نام کرد۔ و میانۂ اقلیم را
کہ ایران زمین خوانند۔ یعنی عراقین
و آذربایجان۔ و پارس و خراسان و
حجاز تاحدِ یمن بہ 'ایرج' داد۔

افریدون او را بغایت دوست
میداشت چنانچہ ایران را باسم او مسمّٰی کرد۔

بلاغت

اس صدی میں انشا پرداز طبیعتیں ترقی کی سیڑھیاں ڈھونڈنے لگیں۔ اصولِ فصاحت کہ اپنی بہار میں اس خاک سے اُگے تھے، سب خاک میں مل گئے تھے۔ اب جو اہل استعداد کہ تصنیف کی لیاقت رکھتے تھے، فصاحت عرب کے شاگرد تھے۔ اسی کے اصول و قواعد کے چربے فارسی میں اتارنے لگے۔ چنانچہ استاد فرخی محمود کے شاعر دربار نے ترجمان البلاغت صنائع شعری میں لکھی۔ دیکھو عربیت کا کس قدر فخر تھا۔ نام تک بھی اپنی زبان کے لفظوں میں نہ اختیار کیا۔ مجھے اس کا مطالعہ نصیب نہیں ہوا۔ افسوس ہے۔

فلسفہ و حکمت

400 ہجری کے بعد شیخ ابو علی ابن سینا نے حکمت فارسیّہ علاء الدولہ ابو جعفر محمد ابن دشمگیر کی فرمائش سے لکھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

فرمود تا کتابے تصنیف کنم بہ پارسی دری کہ اندروے اصلہا و نکتہ ہائے پنج علم از علمہائے حکمت پیشینگان گرد آورم بہ غایت مختصر۔ یکے علم منطق کہ او علم ترازوست دوم علم طبعیات کہ آں علم چیزہاست بہ حس تعلق دارد۔ واندر جنبش و گردش اند سوم علم ہیئت و نہاد عالم۔ و حال و صورت جنبش آسمانہا و ستارگان۔ چنانکہ باز نمودہ اند کہ چوں شائست حقیقت آں دانستن چہارم علم موسیقی و باز نمودن سبب ساز و ناساز آوازہا و نہاد لحنہا پنجم علم انچہ بیروں از

فرمود تا کتابے در پارسی دری تحریر کنم دوراں اصول و نکات پنج علم از حکمت قدیمہ درغایت اختصار فراہم آرم۔ یکے علم منطق کہ علم میزانست۔ دوم علم طبعیات و آں علم اشیاست کہ بہ حسّ تعلق دارند۔ و تغیر و حرکت اند سوم علمِ ہیئت و وضع عالم۔ وحال صور و حرکتِ افلاک و انجم۔ چنانچہ شرح دادہ اند کہ چگونہ بدید دانست آنرا۔ چہارم علم موسیقی و سببِ ساز و ناساز آوازہا۔ و وضع لحنہا۔ پنجم علمِ آنچہ مابعد الطبیعۃ است۔ و مناسب چناں نمود کہ چوں از

طبیعت است۔ وچناں اختیار افتاد کہ چوں پرداختہ شدہ آید۔ از علم منطق حیلت کردہ آید کہ آغاز 'علمِ بریں' کردہ شود۔ و بتدریج بہ 'علمہاے زیریں' شدہ آید۔ بہ خلاف آنکہ رسم است وعادت است

مجرّبات آں مقدمات بوند کہ نہ بہ تنہاے خرد بشاید دانستن۔ و نہ بہ تنہاے حسّ و لیکن بہر دو شاید دانستن۔

چنانکہ چوں حس از چیزے ہر بارے فعلے بیند۔ یا اور احالے بیند۔ و ہمہ بارہا چناں بیند۔ داند خود کہ نہ از سببِ اتفاق است۔ و الّا ہمیشہ نبودے۔ و بیشتر ایں حال نہ بودے۔

مثال وے چنانکہ سوختنِ آتش۔ و اسہال کردن سقمونیا صفرا را۔ و ہرچہ بداں ماند۔

متواترات اما متواترات آں مقدماتے بود کہ بہ گفتِ بسیار کس درست شدہ بوُد خرد را۔ چنانکہ دانستہ ایم کہ اندر جہاں مصر است و بغداد۔ ہر چند ندیدہ ایم۔

و شرائط تواتر آنست کہ اندر وے شک نیوفتد۔ و ہر چیزے کہ باوے شک تواند او فتاد کس را۔ آنکس را ہنوز تواتر نبود۔

'علم منطق' فراغ دست دہد۔ از علویات آغاز کردہ بتدریج بر بیان سفلیات آئیم کہ خلاف رسم و عادت مصنفین است۔

مجربات مقدماتے بود کہ نہ تنہا بہ عقل۔ و نہ تنہا بہ حسّ تواں دانست بلکہ بہ ہر دو۔

و طریق علمش چنانست کہ ہر گاہ حس ہر بار صدور فعلے از چیزے بیند۔ یا او را حالے بیند۔ و ہر بار ہمچناں بیند۔ داند کہ از اتفاق نیست۔ چہ اگر از اتفاق میبود چناں نمیبود۔ و بیشتر ہمیں حال نمیبود۔

مثالش چنانکہ سوختن آتش۔ و اسہال کردن سقمونیا صفرا را و امثال آں

متواترات مقدماتے بود کہ بسبب گفتنِ بسیار کس نزد عقل مسلّم شدہ باشد۔ چناں بہ یقین دانیم کہ در جہاں مصر ہست۔ و بغداد ہست۔ ہر چند ندیدہ ایم۔

و شرائطِ تواتر آنست کہ در و شک راہ نیابد و ہرچہ دراں شخصے را شک تواں افتاد۔ براے او ہنوز تواتر نہ باشد۔

پس کسے رانرسد کہ گوید کہ باید	بس کسے رانرسد کہ گوید بدیں
کہ بدیں چیز بگرودی کہ حکم وے چوں حکمِ	امر یقین آر۔ بدلیلِ اینکہ حکمِ وے چوں
دیگر چیز است۔ازاں کہ بوے گرویدہِ	حکمِ امر دیگراست کہ براں یقین داری۔
کہ اگر آنچناں بودے کہ حکم	زیراکہ اگر حکمِ ایں چوں حکمِ
وے چوں حکم آں بودے۔ نتوانستے شک	آں میبود۔ خود امکان نداشت کہ دراں
کردن چناں کہ اندراں نتوانستم۔	شک کنیم۔ چناں کہ دریں شک کردن
	نمتوانیم۔
و تواتر بحقیقت خود یقین افگند	و تواتر بحقیقت خود چناں بہ
چناں کہ مر شنوندہ را حاجت نیاید کہ اندر	یقین آرد کہ سامع را حاجت نیاید کہ در
گویندگاں تامل کند۔	گویندگاں تامل کند۔

سببِ خواب دیدن۔ اما گوشاشپ دیدن ازاں بود کہ قوتِ متخیلہ تنہا بماند۔ واز مشغول کردن حس سراورا برہد۔ و نفس روے از حس بگرداند۔ واز شغل حس فارغ بود۔ و طبع متخیلہ حکایت کردن است۔ ودراسکون کم افتد۔ پس گاہے مزاج تن را حکایت کند۔ چوں صفرا بود رنگہازرد نماید۔ وچوں سودا بود رنگہا سیاہ۔ چوں حرارت غالب، بود آتش نماید۔ وچوں سردی غالب بود یخ نماید۔ وگاہے اندیشہ گزشتہ را حکایت کند۔ وچوں شود وتباہ شود بہ تباہی آلت۔

عزیزانِ وطن! یہ موقع وہ نہیں کہ خشک چند سطریں پڑھ دوں اور چپ چاپ نکل جاؤں۔ واجب ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، حرف حرف میں اُس وقت کااور آج کافرق دکھاؤں۔

(1) خیال کرو! اس وقت فعلوں اور اسموں پر "ب" اس طرح لگاتے تھے کہ اب نہیں لگاتے۔

(2) "در" کی جگہ پہلے اکثر "اندر" بولتے تھے۔

(3) پہلے جہاں "مصدر" بولتے تھے اب "ماضی" بولتے ہیں اور جہاں ماضی بولتے تھے۔ اب مصدر بولتے ہیں (مجرّبات میں دیکھو) شاید دانستن۔ اب کہتے ہیں۔ شاید دانست۔ یا تواں دانست (متواترات میں دیکھو) بہ گفتِ بسیار کس۔ اب۔ بہ گفتن بسیار کس۔ بولتے ہیں۔

(4) "مر" کا استعمال جتنا پہلے تھا، اب نہیں۔ چند سطر کی عبارت میں دیکھو کئے جگہ آیا ہے۔

(5) جن لفظوں کے آخر میں "الف" ہو۔ پہلے اس کے بعد ایک "ے" بڑھا دیتے تھے۔ مثلاً جاے۔ پاے۔ اب فقط صفۃ اور اضافت کی حالت میں بڑھا دیتے ہیں۔

(6) ماضی شرطی میں پہلے اکثر "ے" مجہول لگاتے تھے اور اسی طرح ماضی استمراری میں۔ لیکن اب اس کا کم استعمال کرتے ہیں۔ اب اس کی جگہ اول میں "ے" لگاتے ہیں۔

(7) پہلے یاے وحدۃ بہت لگاتے تھے۔ اب اَور طرح لفظوں کو ترکیب دیتے ہیں۔ (عبارت شیخ) چوں حس از چیزے۔ ہر بارے فعلے بیند وغیرہ وغیرہ۔

(8) پہلے جہاں ضمیر منفصل بولتے تھے اب متصل لگا کر اختصار پیدا کرتے ہیں۔

(9) اب اکثر لفظوں میں تخفیف کرتے ہیں (متواترات میں دیکھو) اندر روے شک نیوفتد (اب کہتے ہیں) دراں شک نیفتد۔ (پہلے کہتے تھے) ہر چہ باوے شک تواند او فتاد (اب کہتے ہیں) ہر چہ در روے شک تواں افتاد۔

(10) اب عربی کے لفظ بہت گھل مل کر زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ دیکھو عبارت مذکورہ بالا کے مقابلے میں۔

(11) اکثر محاورہ والفاظ کے پس و پیش میں بھی فرق آگیا ہے۔ دیکھو ایضاً۔

(12) پہلے اکثر فارسی کے لفظ کام میں لاتے تھے۔ اب عربی کے لفظ یا مصادر جعلی استعمال کرتے ہیں۔ دیکھو کتاب مذکور میں۔ باب منطق میں۔ جہاں انھوں نے علم کی تقسیم اور تصور اور تصدیق کی توضیح کی ہے وہاں کہتے ہیں :

"دانستن" بر دو گونہ است۔ یکے اندر رسیدن۔ کہ بہ تازی آنرا تصور خوانند۔ چنانکہ اگر کسے گوید۔ مردم۔ یا پری۔ یا فرشتہ۔ و ہر چہ بدیں ماند تو فہم کنی۔ و تصور کنی۔ و اندر یابی۔ دوم گرویدن۔ چنانکہ بگروی کہ پری ہست۔ و مردم زیر فرمانے ہست۔ و ہر چہ بدیں ماند۔

اب گرویدن کی جگہ یقین اور اذعان استعمال کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ "خواب کا بیان" دیکھو۔ اسے گوشلسپ لکھا ہے کہ اصلی لفظ زبان فارسی کا ہے۔ "خواب" پیچھے محاورہ میں آیا ہوگا اور دیکھو یہ مشتق ہے "خوابیدن" سے (خیال کرو بیان صفحہ 44)۔ اس کے علاوہ "ہمانا"۔ "ایدوں"۔ "ہمیدوں ایدر"۔ وغیرہ وغیرہ اکثر الفاظ عہد مذکور میں تھے۔ سب رفتہ رفتہ متروک اور محاورے سے معزول ہوگئے۔

شاہ ناصر خسرو

450ھ کے پس و پیش میں اپنا سفر نامہ "کنزالحقائق" نثر میں۔ "روشنائی نامہ" نظم میں۔ "اکسیر اعظم" علم منطق میں اور چند رسالے اَور لکھے۔ یہ فلسفی تھے اور ساتھ اس کے فصیح شاعر۔ سفر نامہ کی عبارت بہ نسبت حکمت فارسیۂ اور اس عہد کی اَور کتابوں کے بہت صاف اور رواں ہے۔ پھر بھی بعض خصوصیتیں اس عہد کی موجود ہیں جن کا جتانا واجب ہے۔

سمنان کے مقام میں ایک مُلا کے درسگاہ میں گئے ہیں۔ اس کا حال لکھتے لکھتے کہتے ہیں :

در اثنائے سخن میگفت کہ من بہ استاد ابو علی سینا رحمۃ اللہ علیہ چنیں خواندم۔ و ازوے چنیں شنیدم۔ ہمانا غرض وے آں بود تا من بدانم کہ او شاگرد ابو علی سینا است۔

دیکھو! ہمانا۔ 700ھ کے بعد کم رواج ہو گیا اور بے تکلفی دیکھو! اس وقت صاف کہہ دیتے تھے۔ "بہ استاد شیخ ابو علی خواندم" اب اس پر لفافے چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں مثلاً خدمتِ وے چنیں استفادہ کردم۔ بر حضرت وے عرض کردم۔ واو چنیں افادہ فرمود۔ یا ارشاد نمود۔ وغیرہ "کوہ دماوند" کے حال میں لکھتے ہیں :

بر سر آں چاہے ست کہ نوشادر ازاں حاصل میشود۔ و گویند کبریت نیز۔ مردم پوستِ گاؤ ببرند۔ و پُر نوشادر کنند و از سر کوہ بغلطانند کہ براہ نتواں فرود آوردن۔

دیکھو اب کہتے ہیں۔ بر سر آں چاہیست کہ نوشادر۔ و گویند کبریت ہم از آنجا حاصل شود۔ شاہ فرماتے ہیں کہ براہ نتواں فرود آوردن (اب کہتے ہیں) زیرا کہ براہ نتواں فرود آورد (اور اگر مصدر ہی استعمال کرنا ہے تو یوں کہو) زیرا کہ فرود آوردنِ آں براہ۔ از حیّز امکان بیرون است۔ یا۔ براہ فرود آوردن امکان ندارد۔

(24 صفحہ میں فرماتے ہیں) بست و سوم شعبان بہ عزم نیشاپور بیروں آمدم۔ و از مرو بہ سرخس شدم۔ دیکھو! متاخرین۔ شدم۔ بمعنی رفتم۔ نثر میں نہیں لکھتے۔ بلکہ نظم میں بھی کہیں خاص ہی موقع پر کہہ جاتے ہیں۔

(34 صفحہ میں فرماتے ہیں) حاکم زمان طغرل بیگ محمد بود۔ برادر چغری بیگ۔ و مدرسۂ فرمودہ بود نزدیک بازار سراجان۔ و آنرا عمارت میکردند۔ و او بولایت گیری باصفہان رفتہ بود۔

(اب کہتے ہیں) حاکم آں طغرل بیگ محمد۔ برادر چغری بیگ بود کہ بہ فرمانِ او نزدیک بہ بازار سراجان مدرسۂ عمارت میکردند۔ و خودش بر اصفہان لشکر کشیدہ بود۔ (آذربایجان میں پہنچ کر فرماتے ہیں) مرا حکایت کردند کہ دریں شہر زلزلہ افتاد (اب کہتے ہیں) گفتند۔ یا۔ مردم بمن نقل کردند کہ ہمیں نزدیکی دریں شہر زلزلہ اتفاق افتاد (یا زلزلہ رو داد)۔

تاریخ بیہقی

500ھ کے پس و پیش میں بیہقی نے بہت سے جزوی جزوی حالات سبکتگین اور اس کی اولاد کے لکھے ہیں۔ عنوان اور اکثر سرخیاں عربی عبارت میں ہیں اور عربی لفظ بھی بہت ہیں۔ یہ کتاب عہدِ مذکور کی زبان کا نمونہ ہے۔ سبکتگین کے آغاز امارت کے حالات میں سے ایک ماجرا لکھا ہے۔ دلچسپ حکایت ہے۔ اُس سے بیان کو دلچسپ کرتا ہوں اور دیکھو گزشتہ صدی کی عبارت میں اور اس میں کتنا فرق ہو گیا ہے۔ اُدھر سے اُٹھتی ہے اور اِدھر کو ڈھلکتی آتی ہے۔

جدم گفت چوں از جنگ ہرات فارغ شدیم۔ وسوے نشاپور کشیدم۔ ہر روز رسم ہماں بود کہ امیر کزکاں و ہمہ سالاران محتشم۔ از آں سامانی و خراسانی بہ در خیمۂ امیر عادل سبکتگین آمدندے۔ و سوار بایستادندے۔ چوں وے بیروں آمدے۔ تا بر نشیند ایں ہمہ بزرگان پیادہ شدندے۔ چوں شدے۔ ہمگناں سوار

جدم گفت چوں از جنگ ہرات فارغ شدیم بسوے نشاپور رو آوردیم۔ ہر روز رسم ہمیں بود کہ امیر کزکاں و ہمہ سالاران محتشم از قبیل سامانی و خراسانی در خیمۂ امیر عادل سبکتگین مے آمدند۔ و سوارہ مے ایستادند۔ چوں بیروں مے آمد تا سوار شود۔ ہمہ بزرگان پیادہ میشدند۔ چوں پشت اسپ مے نشست

شد ندے و سوے منزل کشید ندے۔
چوں بمنزلے رسید کہ آنرا خاکستر گویند۔
یک روز آنجا بار افگند۔ و بسیار صدقہ
فرمود درویشاں را و پس نماز دیگر بہ
نشست۔ و دراں صحراہا میگشت۔ و ہمہ
اعیان بادے۔ و جاے جاے در آں
صحراہا۔ و کوہ پایہ ہا بود۔ و پارۂ کوہ دیدیم۔
امیر سبکتگین گفت یافتم۔ و اسپ بداشت۔ و
غلامے پنج شش را پیادہ کرد۔ و گفت فلاں
جاے را بکاوید۔ کاویدن گرفتند و لختے
فرو رفتند۔ میخے آہنیں پیدا آمد سطبر،
چنانکہ ستورگاہ را باشد حلقہ ازاو جدا شدہ۔
برکشید ند۔ امیر سبکتگین آنرا بدید۔ از اسپ
فرود آمد بزمین۔ و خداے را عزّ و جل
شکر کرد و سجدہ کرد۔ و بسیار بگریست و
مصلاے نماز خواست۔ و دو رکعت نماز
گزارد۔ و فرمود تا ایں میخ را برداشتند۔ و
برنشست و بایستاد و بزرگاں گفتند ایں حال
چہ حال است؟ کہ تازہ گشتہ گفت قصۂ نادر
است بشنوید۔

ہمگناں سوار میشدند و سر بمنزل میکشید ند۔
چوں بمنزلے رسید کہ آنرا خاکستر گویند
یک روز آنجا مقام کرد۔ درویشاں را بسیار
صدقہ فرمود۔ و بعد از نماز دیگر اسپ
خواست۔ و دراں صحراہا ہمہ اعیان لشکر در
نشیب و فراز صحرا میگشت۔ زمین ہمہ کوہ
پایہ ہا بود۔ تا پشتہ دیدیم۔ امیر سبکتگین
گفت یافتم! و عنانِ اسپ را نگہداشت۔ پس
پنج شش غلام را پیادہ کرد و گفت۔ فلاں
جاے را بکاوید۔ ایشاں فرماں بردند
و لختے خاک بر آوردند۔ میخے آہنیں پیدا شد
سطبر۔ بنوعیکہ در اصطبل ہا بکار آید۔ حلقہ
اش جدا شدہ بود۔ امیر آنرا بدید۔ از اسپ
بزمین فرود آمد۔ و شکر بدرگاہِ الٰہی بجا
آورد۔ و بسیار گریہ کرد۔ پس مصلا
خواست و دو رکعت نماز گزارد۔ و فرمود تا
آں میخ را برداشتند۔ من بعد سوار شد۔ و
باز ایستاد۔ بزرگاں گفتند ایں چہ حال است
کہ گاہے ندیدیم۔
گفت قصۂ نادر است گوش نہید۔

قصہ کی صورتِ حال کو بشرحِ مذکورۂ بالا لکھوں تو داستان بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے صرف بجنسہٖ نقل کرتا ہوں :

پیش ازانکہ من بسراے الپتگین افتادم۔ خواجہ کہ ازانِ او بودم مرا و سیزدہ یارم را از جیحون بگزرانید۔ و بشبرقان آورد۔ و ازانجا بہ گزکاناں۔ و پدرِ ایں امیر آں وقت بادشاہ گزکاناں بود۔ مارا نزدیک او ببردند۔ ہفت تن را جز از من بخرید۔ و مرا و پنج تن را اختیار نہ کرد۔ و خواجہ ازاں

سو بہ نیشاپور کشید۔ و بہ مرو الرود و سرخس چہار کس دیگر بفروخت۔ من ماندم ویارے دو مرا سبکتگین دراز گفتندے۔ و بقضاے سہ اسپ خداوندم در زیر من ریش شدہ بود۔ چوں بہ خاکستر رسیدیم۔ اسپے دیگر در زیر من ریش شدہ بود۔ خداوندم مرا بسیار بزدہ بود۔ وزین بر گردن من نہادہ۔ من سخت غمناک بودم از حال و روزگار خویش و بیدولتی، کہ کس مرا نمی خرید۔ و خداوندم سوگند خوردہ بود کہ مرا بہ نشاپور پیادہ برد۔ و ہمچناں بُرد۔ آں شب باغمے سخت بزرگ بخفتم۔ در خواب دیدم خضر را علیہ السلام۔ در نزد آمد۔ مرا پرسید و گفت کہ چندیں غم چرا میخوری۔ گفتم از بخت بد خویش۔ گفت غم مدار۔ و بشارت دہم ترا کہ مردے بزرگ و بانام خواہی شد۔ چنانکہ وقتے صحرا ابگوری بابسیار مردم محتشم۔ و تو مہتر ایشاں باشی۔ دل شاد دار۔ وچوں ایں پائگاہ بیافتی باخلق خداے نیکوئی کن۔ و داد بدہ تا عمرت دراز گردد۔ و دولت بر فرزندان تو بماند۔ گفتم سپاس دارم۔ گفت دست مرا دہ۔ و عہد کن۔ دست بدو دادم۔ پیمان کردم۔ دستم نیک بیفشرد۔ و از خواب بیدار شدم۔ وچناں می نمود کہ اثر آں افشردن بر دست من است۔ برخاستم۔ نیم شب غسل کردم۔ و در نماز ایستادم۔ تارکعتے پنجاہ کردہ آمد۔ و بسیار دعا کردم و بگریستم۔ و در خود قوتے بیشتر میدیدم۔ پس ایں میخ برداشتم و بصحرا بیروں آمدم۔ و نشان فرد بردم۔ چوں روز شد۔ خداوندم بارہا بنہاد و میخ طلب کرد۔ و نیافت۔ مرا بسیار بہ تازیانہ بزد۔ و سوگند گراں خورد کہ بہ ہر بہا کہ تراخواہند خرید بفروشم۔ و دو منزل تا نشاپور پیادہ رفتم۔ والپتگیں بہ نشاپور بود۔ بر سپہ سالاری سامانیاں باحشمتے بزرگ۔ و مرا با دویارم بدو بفروخت۔ و قصۂ پس ازاں دراز است۔ تابدیں درجہ رسیدم کہ مے بینند۔

چہار مقالہ

560ھ کے پس و پیش میں نظامی عروضی نے "مجموع النوادر" اور کتاب "چار مقالہ" حکمت عملی اور آدابِ خدمت ملوک میں لکھی۔ اس کی زبان کا لطف بھی دیکھ لو :

دیباچہ بندۂ مخلص احمد بن علی العروضی چہل و پنج سالہ است کہ در خدمت ایں خاندان بہ بندگی موسوم است۔ و خداوند ملک الجبال علاء الدین ابو علی بن الحسین بن الحسین کہ زندگانیش دراز باد در حق من بندۂ اعتقاد تمام داشت۔ مگر از مہتر زادہاے امیر عمید صفی الدین

ابو بکر روز عید فطر بداں حضرت پیوست۔ واو جوانے فاضل بود و پیرے نیک دانشے۔ دراں حال من حاضر نبودم۔ در مجلس بر لفظ پادشاہ رفت کہ نظامی را بخوانید۔ امیر عمید گفت نظامی اینجاست گفتند آرے و او چناں گماں برد کہ نظامی منیری ست۔ چوں فرازش رسیدم مرا بخواند رفتم و خدمت کردم۔ چوں دور چند در گزشت امیر عمید گفت کہ نظامی نیامد۔ ملک گفت آمد او در مجلس نشستہ است۔ امیر گفت کہ من نہ ایں نظامی را می گویم و آں نظامی دیگر است۔ من ایں را نشناسم۔ پادشاہ را دیدم کہ متغیر شد۔ وروے بمن کرد و گفت غیر تو نظامی دیگر ہست؟ گفتم بلے۔ دو نظامی دیگر ہستند یکے سمرقندی و او را منیری خوانند۔ و یکے نیشاپوری و او را اثیری گویند۔ و من بندہ را نظامی عروضی گویند۔ گفت تو بہی یا ایشاں۔ امیر عمید گفت کہ من آں ہر دو را دیدہ ام و بحق المعرفۃ می شناسم۔ وایں را ندیدہ ام و شعر ہم نشنیدہ ام۔ اگر دریں معنی کہ رفت دو بیت میگوید طبع او معلوم شود و بگویم کہ کدام بہتر است۔ ملک سوے من نگاہ کرد و گفت ہاں نظامی! مارا خجل نہ کنی بگو چنانکہ امیر عمید میخواہد۔ قلم بر گرفتم ہنوز دَور۔ دَور بپایاں نرسیدہ بود کہ ایں پنج بیت گفتم۔ قطعہ

در جہاں سہ نظامیم اے شاہ	کہ جہان و زمانہ افغانند
من یکے بندہ پیشِ تختِ شہم	واں دو در مرو پیش ساطانند
بحقیقت کہ در سخن امروز	ہر یکے مفخر خراسانند
گرچہ ہم چوں رواں سخن گویند	من شرابم کہ شاں چو در مانند
ایں یکے چوں ز ہر سہ دور افتد	ہر دو از کار خود فرومانند

چوں من ایں بیتہا عرض کردم امیر عمید حرمت کرد و گفت۔ اے پادشاہ نظامیاں را بگزار کہ از شعراے حال از ماوراالنہر وغیرہ کس را ندانم کہ بدیہہ چنیں ابیات تواند گفت۔ شاد باش اے نظامی کہ ترا در بسیط زمین نظیر نیست۔ و بادشاہ از سخن او عظیم برافروخت۔ و بشاشتے در طبع او پدید آمد۔ و مرا تحسین کرد و گفت۔ کان سرب ازیں عید تا عید گوسفند کشاں بتو دادم۔ عاملے بفرست۔ چناں کردم و در مدت ہفتاد روز دوازدہ من سُرب بدیں دعا گوے رسید۔ و اعتقاد آں پادشاہ در حق من از یکے ہزار شد۔

500ہجری کے بعد حمید الدین نصر اللہ نے بہرام شاہ کے عہد میں "کلیلہ دمنہ" فارسی میں ترجمہ کی۔

مقاماتِ حمیدی

بعض اشخاص کو شوق ہوا کہ عرب کی انشاپردازیوں کے انداز سے فارسی میں ایجاد دکھائیں۔ چنانچہ 550ہجری میں قاضی حمید ابو بکر نے "مقاماتِ حریری" پر "مقاماتِ حمیدی" لکھی۔ اُس میں عربی عبارتیں بھی ویسی ہی مقفیٰ ہیں اور فارسی زمزموں کو عرب کے الحان میں ادا کیا ہے۔ عبارت کو دیکھو تو لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ متواتر مترادف الفاظ۔ مشکل لغات۔ اس پر اضافتوں کے الٹ پھیر۔ محاورہ مفقود ہو گیا۔ زبان کو فارسیت سے واسطہ نہیں رہا۔ عربی لفظوں کی یہ بہتات ہے گویا ریگستان عرب سے آندھی اٹھی۔ چند سطریں اس کی بھی پڑھو کہ ذائقہ تو معلوم ہو۔ تازہ ایجاد ہے۔

المقامة الخامسة عشرة فی المعزم الکشمیری۔ حکایت کرد مرا دوستے کہ حق مُراضعتِ مہد صغر داشت۔ ونسبت مصاحبتِ عہد کبر کہ وقتے از اوقات کہ سیمائے عالم غض و تازہ و طری بود و بساط ہامون استبرق و عبقری۔ ردائے دمنہا کحلی و عبہری۔ و وطائے چمنہا خیری و معصفری۔ رباعی

از برگِ گل بسیطِ زمیں را بساط بود در صبح باد صبح چو بادِ نشاط بود
در کوزہ مے جو دلبرے اندر نقاب بود در غنچہ گل چو کودکے اندر قماط بود

در و قتیکہ عالم چنیں رنگ و بوے داشت و قدم ہمت عزم جستجوے۔ اتفاق رااجتیاز و طاری گزر کردم نہ بروجہ سکون و اقامت و نہ بعزم اطالت و ادامت۔ گفتم آب ایں خاک راچشیدن و ایں طرف بزرگوار را دیدن بہ طرف اعتبار و اختیار کارے عظیم و دولتے جسیم باشد۔ چوں روزے چند مقام کردم۔ ناگاہ خلق در حلقہ دام افتاد۔

رشید و طواط جس نے "حدائق السحر" وغیرہ کئی رسالے بلاغت اور فن شعر میں لکھے اور مدت تک لاجواب شمار ہوتے رہے 578 ہجری میں مر گیا۔ وہ اسی صدی کی کارگزاری ہے۔

600ھ سے 700ھ تک

تاریخ جہانکشا

علاء الدین علاء الملک نے 600ھ کے بعد لکھی۔ اندازِ عبارت سب کے یکساں ہیں۔ زبانیں گفتار میں اور قلم رفتار میں چھوٹے چھوٹے فقروں سے مسافتِ بیان کو ماپ رہی ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تصنیفوں میں عربی نے ملاوٹ بہت کی ہے، مگر گھلاوٹ نہیں پائی۔ عبارتوں کو پڑھو۔ الفاظ بہت آگئے ہیں مگر یہ حالت ہے گویا پلاؤ میں نمک کوٹ کر ڈالا ہے۔ کسی نوالہ میں ٹھیک ہے۔ کسی میں کنکر سامنہ میں آگیا اور کوئی بالکل پھیکا۔ فقروں کی استخوان بندی دیکھی؟ جیسے کوئی گنڈیریاں کترتا ہے۔ مسلسل نہیں۔

یہ سب باتیں درست مگر انشاپردازی کے حق میں یہ اندازِ بے تکلفانہ، خوش نصیبی کا زمانہ تھا۔ اس میں بہت الفاظ عربی کے بھی نہ آتے تھے جن کے سمجھنے میں دقّت ہو۔ بناوٹ اور دکھاوٹ ایسی رنگ آمیزی نہ کرتی تھی کہ تشبیہ اور استعاروں کی شدّت، مطلب کی اصلیت کو گم کردے۔ غرض یہی تھی کہ مطلب خاص و عام کی سمجھ میں آجائے۔ وہ پوری ہو جاتی تھی۔

گلستان

عجائب اتفاقات سے یہ ہے کہ اسی صدی کے 656ھ میں شیخ سعدی کی زبان پر جوش طبیعت نے ایک چشمہ کھول دیا۔ اس میں فصاحت نے شربت اور سلاست نے دودھ بہایا اور "گلستان" ایک ایسی کتاب سرسبز ہوئی جس کا آج تک جواب نہیں۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک کوئی پڑھا لکھا نہ ہوگا جس نے اس سے سبق نہ پڑھا ہو۔ مگر اُس عالم میں پڑھا ہے کہ گویا نہیں پڑھا۔ اچھا۔ اب خیال کر کے دیکھو! وہی چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں اور کُتری کُتری عبارت ہے۔ مگر خدا نے اس کے بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں ایسا لوچ دیا ہے کہ ریشم کے لچھے مسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ صنائع بدائع کی دستکاری نے اسے قلم نہیں لگایا مگر سادگی کے منہ سے پھول پڑے جھڑتے ہیں۔ اُس کے ننھے ننھے فقرے آیت اور حدیث کی طرح اب تک تقریروں اور

تحریروں کو قوت دیتے ہیں۔ مزا یہ ہے کہ جو چٹخارا زبان کو نظم کے پڑھنے میں آتا ہے۔ وہ اس کی نثر میں آتا ہے کیونکہ اس کی قدرتی فصاحت نظم و نثر کو ایک قالب میں ڈھالتی ہے۔ اس کے لب و دہان کو خدا نے ایسی برکت دی ہے کہ اگر کسی کی عبارت کو اُس کی عبارت میں پیوند کر دیں تو صاف ایسا نظر آتا ہے جیسے مخمل کا پردہ پڑا ہے اور اس میں بانات کا پیوند لگا ہے۔

عجیب تر یہ کہ عالم سے عارف اور پارسا سے رندِ بے حیا تک سب پڑھتے ہیں اور اپنے اپنے مزے لیتے ہیں۔ پھر کیسی طبیعت اور کیسا مزاج لے کر آیا تھا کہ شاہانہ، فقیرانہ، واعظانہ، نصیحت بزرگانہ جس مضمون کی حکایت کو چاہو پڑھ لو۔ اس کی شوخی اپنے انداز سے کہیں بھی نہیں چوکتی۔ یہ بھی قدرتی اتفاق ہے کہ حسنِ قبول نے اسے محبت کے ہاتھوں پر لیا اور شہرت نے ایسا ہر دل عزیز کیا کہ بے عزّت ہو گئی۔ بچّوں نے دست مال بنادیا ہے، پھر بھی اہل نظر اور اہلِ فضل کے دلوں میں وہی عزّت و عظمت ہے جو کہ تھی۔ خوبی یہ ہے کہ طبائع مختلف اور مذاق جدا جدا ہیں پھر بھی سب ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے علما، فُضلا، شعرا فضیلت کے زوروں سے اٹھے اور طبیعت کے شعلوں سے چمکے۔ اس کتاب پر کتابیں لکھیں مگر ایک تصویر بھی پوری نہ اتری۔ ملا سعد الدین تفتازانی کہا کرتے تھے کہ ساری "مطول" مجھ سے لے لیتے اور یہ فقرہ دیدیتے۔ از بستر نرمش بہ خاکستر گرمش نشاندند۔

بہت سے فقرے نثر ہیں اور نظم کی طرح زبانوں پر رواں ہیں۔ گفت اے درویش! دامن بدار۔ گفت۔ دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔

محمود غزنوی کے باب میں کہتے ہیں۔ ہنوز چشمش نگران است کہ ملکش باد گران است۔

ہونہار شہزادہ میدانِ جنگ میں بہادروں کی طرح دل بڑھاتا ہے۔ اے مرداں بکوشید تا جامۂ زناں نپوشید۔

جاڑے کی اندھیری رات میں چور کہتے ہیں۔ چہ حرامزدہ مردمانند کہ سنگہارا بستہ اند و سگہارا گشادہ۔

بعض پرانے محاورے بہ نسبت اور فصحائے وقت کے ان کی زبان پر زیادہ چڑھے تھے۔ مثلاً خواجہ ـــ خویش۔ خویشتن (بجائے خود)۔ ہمے (تواتر فعل کے لیے)۔ مر (زائد)۔ در۔ اندر اور 'ب' اور 'بر' کا جمع کرنا۔ ع آبے حکم شرع آب خوردن خطاست

علوم و فنون

بھی اس صدی میں فارسی بولنے لگے۔ اکثر علما نے مختلف علموں میں رسالے لکھے۔ محقق طوسی نے علاوہ عربی تصانیف کے مجسطی اور کئی کتابیں ہیئت میں لکھیں۔ اساس الاقتباس منطق و فلسفہ میں۔ اوصاف الاشراف اصلاحِ نفس میں۔ اخلاق ناصری حکمت اخلاق میں۔ معیار الاشعار عروض و قافیہ میں زبانِ فارسی میں لکھی۔ باوجود اس کے جو علما اپنے رتبہ کی حفاظت ضروری سمجھتے تھے وہ اپنی کتاب کو عربی زبان میں شان و شکوہ دیتے تھے۔ اخلاق ناصری کے دیباچہ کا ایک فقرہ میرے خیال کی سند ہے۔ محقق موصوف کہتے ہیں کہ ایسے عمدہ مطالب کو ایسے ہلکے اور بودے کپڑے پہنانے مناسب نہ تھے مگر بادشاہِ وقت کی فرمائش تھی اس لیے تعمیل کی گئی کہ فائدۂ عام ہو۔

اخلاقِ ناصری کی عبارت کا انداز دیکھو۔ وہی چھوٹے چھوٹے فقرے برجستہ، متین اور سنگین عبارت ہے۔ عربی الفاظ نے زبان پر قبضہ کر رکھا ہے اور یہ حالت خبر دیتی ہے کہ جو اس وقت فارسی بولتا یا لکھتا ہوگا، عربی الفاظ کو عزّت کا سامان سمجھ کر کرسیِ کلام پر بٹھاتا ہوگا۔ ان کی تصنیف میں یہ خصوصیت تھی کہ اکثر حرفِ ربط اور بعض فعل آخر جملہ سے محذوف ہوتے تھے۔ ایک خصوصیت اور بھی تھی اور وہ اس چند سطر عبارت میں نہیں ظاہر ہو سکتی۔ یعنی ان کی قدرتِ کلام اکثر عربی محاوروں کو فارسی میں لفظی ترجمہ کر دیتی تھی۔

عبارت اخلاق ناصری

چوں از تہذیبِ ایں دو قوّت فراعت یابد۔ بہ تکمیل قوتِ نظری مشغول باید شد۔ و ترتیب دراں رعایت باید کرد و اوّل کہ در تعلم شروع نماید خوض در فنے باید کرد کہ ذہن را از ضلالت صیانت کند۔ و بطریقِ اقتباس معارف ہدایت کند۔ 'پس' در فنے کہ وہم را با عقل در قوانین آں مساعدت باشد۔ و تحیر و خبط را دراں مجال نہ باشد۔ تا ذہن را ذوقِ یقین حاصل شود۔ و ملازمت حق ملکہ کند۔ و بعد ازاں بحث بر معرفت اعیان موجودات و کشف حقائق و احوال آں مقصور باید گردانید و ابتدا از مبادی محسوسات باید کرد۔ و بمعرفت مبادی موجودات ایں بحث باتمہا

باید رسانید۔ وچوں بدیں مرتبہ رسد۔ از تہذیب ایں سہ قوت فارغ شدہ باشد۔ بعد ازاں بر حفظ قواعد عدالت توفر باید نمود۔ واعمال و معاملات بر حسب آں طبیعت مقدر باید گردانید۔ و 'چوں' ایں دقیقہ نیز رعایت کند۔ انسانی بالفعل شدہ باشد۔ واسم حکمت وسمتِ فضیلت اورا حاصل آمدہ باشد۔ پس اگر خواہد در سعادات خارجی و سعادات بدنی اہتمام نماید۔ نورٌ علیٰ نور بود والا باری مہمات را معطل نہ گزاشتہ باشد وبفضول مشغول نبودہ باشد۔

جب کسی مسئلے کے یاد رکھنے کو تاکید کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ بر تو باد۔ یہ بعینہٖ ترجمہ ہے عربی محاورہ کا مثلاً علیکم بحسن الخط۔ وعلیک بحفظ القرآن۔

کبھی ایک حکیم کا قول لکھ کر توضیح کرتے ہیں، یا کسی اور عالم کا اختلاف رائے لکھتے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں۔ و معنی ہمین است کہ یاد کردیم۔ یہ عربی کا محاورہ ہے۔ والمعنی ما ذکرنا۔ و معنی ہمین است کہ بیان کردیم یا گفتیم۔

کبھی کہتے ہیں۔ چنانکہ یاد کردیم قبل ازیں۔ عربی کا محاورہ ہے، کما ذکرنا قبل ذلك (اب کہتے ہیں) چنانچہ پیش ازیں گفتیم یا بیان کردیم۔

عزیزانِ وطن! اقلیم سخن کا سیاح صدی بصدی تغیرات زبان کے عالم دیکھتا چلا آتا تھا۔ جب 700ھ کی حد پر پہنچا تو ملکِ سخن کی ہوا بدلی اور انشاپردازی کے فلک پر انقلاب عظیم کے آثار نظر آنے لگے۔ سلسلۂ کلام بھی طول پکڑ گیا ہے۔ اگر آئندہ کی تبدیلیاں آج ہی دکھائی جائیں تو کلاموں کے خلط ملط میں طبیعتیں الجھیں گی۔ مسافر آج یہیں مقام کرتا ہے اور مطالب آئندہ کو جلسہ آئندہ پر ملتوی رکھتا ہے۔ یار باقی و صحبت باقی۔

چوتھا لکچر

یکم مارچ 1877ء

فارس کی زبانِ مروّجہ میں دوسرا انقلاب

700ھ فارس کی زبان اپنے فرزندوں کے لیے سلیس اور فصیح قالب ڈھال رہی تھی۔ ایجادی قوّتیں خیالات کی ہوا میں پاک روحوں کی طرح اڑتی پھرتی تھیں اور ظہور کے مواقع ڈھونڈتی تھیں۔ اس عالم میں ترکانِ چنگیزی کا قبضہ ملک پر ہو گیا تھا۔ زبان کے لیے بڑا خطرہ تھا۔ خوش نصیبی تھی کہ سر لاکھوں کٹ گئے مگر زبان بچ گئی۔ وہ خونریز جاہل تھے۔ زبان تاتاری تھی اور چینیوں سے ملتی جلتی۔ لکیریں حرفوں کی بھی کھینچتے تھے۔ آج ان کی تحریروں کے نمونے چاہو تو معدوم ہیں۔ چنگیز کی طبیعت میں قواعد و قانون کے ایجاد کی قوی طاقت تھی۔ طورۂ چنگیز خانی کے کچھ کچھ ترجمے ہیں۔ فتحیاب لڑکے صاحب ملک اور صاحب زبان تھے۔ ان کی حب الوطنی اور بلند نظری فارس کی زبان کو مخالف کے کانوں سے سنتی تو عجب نہ تھا۔ لیکن ان کی زبان کے لیے نہ مذہبی رعایت تھی نہ علمی طاقت تھی۔ اس لیے ملک کی زبان کو روک نہ سکی۔

چنگیز خود ایک ملک گیر بادشاہ تھا۔ اولاد کو ملک داری بھی کرنی پڑی۔ بلند ہمتیں ایران میں اپنی ناموری کے ایوان سجا رہی تھیں۔ نہیں! بلکہ سلطنت کی بنیاد کو مضبوط کرتی تھیں۔ وہ اس وقت ایران کے علوم و فنون کو سلطنت کا مویّد سمجھ کر ایرانی عالموں اور کاروانوں کی پرورش

کرنے لگے۔ چنگیز کا پوتا ہلاکو خاں تھا۔ اس کی علمیت نصیر الدین محقق طوسی کے دامن میں پلی تھی اس لیے علوم و فنون کا تربیت اور پرورش کرنے والا تھا۔ اس کے عہد میں ہر فن کے فاضل اور ماہر مصنف جمع ہوئے۔ مراغہ میں رصد خانہ تعمیر ہوا۔ "زیچ" لکھی گئی۔ منطق، فلسفہ اور اس کی تمام شاخیں عرب سے آکر فارس کی خاک میں سرسبز ہوئیں اور اکثر چنگیزیؒ نسل کے دماغ انھی خیالات سے روشن رہے۔

اقبال مندوں کے دربار میں علوم و فنون کے ساتھ **انشا پردازی** بھی امیدوار آئی۔ انھوں نے فقط امید کا پیٹ نہ بھرا بلکہ ذوق و شوق کو چمکا کر تصنیفات کے میدان کھلوا دیے۔ اس سے اقلیم سخن میں انقلابِ عظیم نمودار ہوا۔ زمین آسمان اور آسمان زمین ہو گیا۔ عالم صورت کے تماش بین اسے زبان فارسی کا نوروز کہیں گے۔ کیونکہ استعارہ اور تشبیہ کی گلکاری اور خیالات بہاری۔ گل۔ بلبل۔ نغمہ۔ چمن۔ گلشن۔ سبزہ۔ شبنم۔ مَے۔ جام۔ صراحی وغیرہ وغیرہ سے کاغذی تختے گلزار نظر آتے ہیں۔ مگر آزاد تم سے کہتا ہے کہ اندر کچھ نہیں۔ وہ حقیقت میں لفظوں کی بہار تھی اور معنوں کی خزاں۔

700ھ-800ھ

699ھ میں عبداللہ وصاف ابن فضل اللہ نے غازان خاں شاہزادہ چنگیزی کے لیے تاریخ وصّاف لکھنی شروع کی۔ حقیقت میں بڑا زور مارا ہے اور فارسی اور عربی زبان دانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر فقط لفاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی فارسی ترکی لفظوں کا حشر برپا ہے۔ استعارہ اور تشبیہ نظم میں سو برس پہلے رنگ دینے لگے تھے۔ نثر میں بہت کم تھے۔ انھوں نے اس قدر بہتات کی کہ مطلب گم ہو گیا۔ عبارت کو مقفّیٰ کیا اور ہر فقرے پر اس کا ہم معنی فقرہ اور سوار کیا۔ ہر صفحہ میں دو دو تین تین عربی شعر اور عربی عبارتیں۔ کہیں کہیں کئی سطریں۔ آدھا صفحہ اور زیادہ بھی لکھ جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غازان خاں کی حکومت کنارہ ایران سے سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ خاکِ عرب کا اثر ضرور ظاہر ہونا تھا۔ ترکی الفاظ کیوں نہ آتے۔ ترک بچّوں میں بیٹھ کر لکھتے تھے اور ترک بادشاہ کے دربار میں کھڑے ہو کر سناتے تھے اور چونکہ فاضل تھے، صاحبِ زبان تھے۔ آمدِ طبع کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے کہیں چھوٹے کہیں بڑے بڑے

فقرے لکھ کر لمبے لمبے ہاتھ مارتے تھے۔

یہ افسوس بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ فقرے طولانی ہوگئے۔ مطالب صنائع و بدائع۔ تشبیہ واستعارہ میں الجھ کر پیچ در پیچ ہوگئے۔ لغات کی بہتات، لفظوں کے مبالغے، اصلیتِ حال پر پردہ ہوگئے۔ زبان، بیان واقعیت میں اپاہج ہوگئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقرے، کلام کا اختصار، بے تکلفی، سادگی اور حقیقت نگاری کا وصف ایسا گیا کہ آج تک ملک کی زبان اس قصور سے ملکوں میں بدنام ہے۔

تغیرِ مذکور کا 6 سو برس تک دَور رہا۔ تیرھویں صدی ہجری کے اخیر میں ناصرالدین شاہ بادشاہ ایران نے ملک کی تعلیم و تہذیب کو بدلا اور تصنیفات کو نئے قالب میں ڈھالا۔ اب زبانِ فارس کے دامن سے یہ دھبا دھویا جائے گا کہ اس میں اصلیت کے ظاہر کرنے کی طاقت و لیاقت نہیں۔

تاریخ وصّاف (از صفحہ 281)

ذکر جلوس بایدو خان۔ چوں اُمرا کیخاتو خاں راہلاک کردند۔ و دامنِ امانی اورا بدست فنا چاک۔ طغاچار نوئین و دیگر امرا بحضرت بایدو پیوستند۔ و نجابیّت او مچلکاه داده سلسلہ مطاوعت درہم بستند۔ و از اطراف پادشاہ زادہ گان و خواتین و لشکریان بصوب حضرۃ از مقام خود توجہ نمودند۔ پس آقبوقا و تماچی و سرتاق را باجمعے کہ ایناقان کیخاتو خان بودند۔ از حکم یرلیغ بیاسا[1] رسانیدند۔ و طایجو را دربندگی حضرۃ احضار کردند۔ و سخن پرسیدہ۔ پادشاہ فرمود کہ کیخاتو تراچنداں قربت و مکنت بخشید۔ و نہال تربیت تو بآب اصطناع بالا کشید۔ و ثمرۂ عنایت او جہانیاں را ظاہر گشت۔ تا او را روزے بکار آئی۔ در زمان شدت از روے مردی و مروّت یک لحظہ با او ثبات نمودی۔ از تو دیگرے چہ توقع دارد۔ او را نیز از عقب دیگراں بموضعے کہ مراجعت ممکن نیست روانہ کرد۔ و حسن را ہمیں گناہ مواخذت فرمود۔ بلے جان او را بہ بخشید۔ آیت طفلی 'دارالاطاق' ہنگام عربدۂ کیخاتو خان بحکم فرمان بے ادبی نمودہ بود دریارغو[2] حاضر گشت۔ جوابے

---

1 نون سیاست 2 مواخذہ تحقیقات

درست درشت بے دہشت وَ کَانَّ مِنْهُ الْعُقُوْلُ بِالْجِدِّ دَهْشَت عرضہ داشت کہ آنروز کیخاتو خان بر تخت خانیت متمکن بود اگر بر قتل اقدام فرمودے امتثال واجب بودے۔ اجمام[1] ناممکن۔ امروز نیز بندۂ بادشاہم۔ اگر سیور غامیشی[2] فرماید۔ و بر بندۂ خود بہ نیم جانی منّت نہد۔ باہر کہ اشارہ رود ہماں انقیاد واجب دانم۔ پادشاہ جواب معقول اور اپسندیدہ فرمود۔ و آنجا قضیۂ ان كان الكذب ينجي فالصدق انجیٰ صادق آمد و معنی فكاك المرء في الصدق محقق و قال الواثقي۔ العفو الى المُقِرّ اسرع منه الى المُصِرِّ سیور غامیشی فرمودہ بخدمتے کہ تا غایت مباشر آں بود مشغول گشت۔ و وحشتے کہ صادر شدہ بود۔ و وجہ خلاص ازاں معذر میمود وسلیتِ قربت و موجب مزید اعتماد شد۔ پادشاہ در ماہ جمادی الاولیٰ من السنہ در حدود ہمدان فراز سریر خانیت را بجلوس مبارک بیار است در وقتے کہ از تاثیر اعتدالِ زمان ایں بیت چوں ورد مضاعف ور دزبان، پیر و جواں بود وسیلت شعر

رأيت ازهارها بالطل ممتزجا   كانها خد خود حف بالعَرَقِ
نسيم روضتها مسك و تربتها   كانها مزجت بالعنبر العتق

وبا ہے جواں گلرنگ۔ لمولفہ

پیراں چنگ پشت و جواناں چنگ زلف   در چنگ جام بادہ و در گوش بانگ چنگ

زہاب چشمساران۔ چوں اشک دیدۂ عشاق بر روے خاک بکشاد۔ شگوفہ در شگفت از سر سبزی بہار۔ دندان تبسم سفید کرد۔ و قمریان آہنگ شاخسار چنار و بید۔ شعر

و حَمَّاء العِلاط يضيق فومها   بما في الصدر من صفةِ الغرام

ہم بہ صبح و ہم بشام ع بشمن غَضاً فَمِلْنَ الىٰ بِشَامِ زمین مینارنگ۔ و زبان مینوو ش گشتہ۔

پھر ایک پورے ورق میں بہار کا سماں اسی قسم کے فقروں سے دکھا کر کہتا ہے۔

بدیں منوال چوں روزہا از مجلس بزم اُنس۔ تمتع یافتند۔ شائر لیغہا را در صحبتِ ایلچیان بتمامت بلاد و ممالک فرستادند کہ چوں کیخاتو از ترتیبِ اسبابِ ملک داری اعراض نمود۔ و یاساء چنگیز خانی دگر کرد۔ باتفاق آقا (برادرِ بزرگ) و اَینی (برادر کوچک) و خواتین و امرا اور ابرداشتیم۔ وغیرہ وغیرہ۔

تاریخ بناکتی۔ اس صدی میں بھی جو مصنف اپنی معلومات سے خاص و عام کو فائدہ

---

1 آرام نمودن 2 نوازش

پہنچانا مدّ نظر رکھتے تھے، وہ سلیس عبارت سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ فخر الدین بناکتی نے 730ھ کے قریب ایک تاریخ لکھی۔ وہ آج تک اپنے تمکین و اعتبار سے قابلِ تعریف ہے۔ اس میں سلاطین خطا، اقصائے ہند، یہود اور قیاصرۂ روم کے حالات ایسی تفصیل سے بیان کیے ہیں کہ کسی نے نہیں لکھے۔

ہندُستان میں بھی تصنیفات کا سلسلہ جاری تھا۔ ضیاء برنی اور سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی۔ منہاج السراج نے طبقاتِ ناصری لکھی۔ یہاں کے مصنف یا خراسانی تھے یا ترک۔ ان سے ہندُستانی نسلیں بھی نکلی تھیں۔ وہ اب بھی باپ دادا کی مقلد تھیں اور یہی ان کے لیے بڑا کمال تھا۔ چنانچہ ساتویں صدی تک جو تصنیفات ہیں ان کا قدیمی انداز ہے۔ پھر ہندُستان کی خاک نے اپنے جوش نئے انداز سے نکالے۔ امیر خسرو کے والد ترکستان سے آئے تھے۔ انھوں نے ہندُستان میں ولادت اور تربیت پائی تھی مگر دماغ وہ لائے تھے کہ ایجاد مضامین کا طلسم خانہ تھا، انھوں نے صنائع لفظی و معنوی کا عجائب خانہ کھول دیا۔ فارس کے اجناس میں ہندُستان کی میناکاری خرچ کی۔ نظم سے درگزر اور نثر پر نظر کر کے کہتا ہوں کہ صفحے کے صفحے دیکھو۔ فقط لفظوں کی چناں و چنیں ہے۔ اسے سر کا دو تو کچھ بھی نہیں ہے۔

اعجازِ خسروی

688 صفحہ کی موٹی کتاب ہے مگر اوّل سے آخر تک ابہام، مراعات النظیر، طباق، تضاد وغیرہ وغیرہ صنائع و بدائع میں لغت بازی اور جگت بازی کا مینہ برس رہا ہے۔ اس دھواں دھار میں تاریخی آگاہی، اخلاقی تاثیر، علمی مسائل، مذہبی ہدایت کچھ نظر نہیں آتی۔ لفظوں ہی لفظوں میں ساری دنیا تمام ہے۔ مثلاً اوّل ایک سرخی لکھیں گے۔

نسبتش ہم زد بیری بنگر۔ بدانکہ الفاظ بسیار است۔ اما لفظے چند کہ بدیوان انشاو اصحاب شغل اختصاص بیشتر دارد بازمی نمایم کہ ازیں بیش نگنجد۔ اینجا طغرائے پادشاہ قطار علمہائے سپاہ را ماند کہ برائے فتح نصب شوند۔ الفہائے طغرائے سلطان را در عمارتِ عالم ایستادیست کہ اگر سقف آسمان خلل آرد ستونہا آں توانند شد۔ بادشاہ عہد ہنگام جلوس برائے نشاندن سکۂ توقیع از خدایاری میخواست۔ از فتح باب آسمانی آواز آمد کہ نصرٌ من اللہ۔ بادشاہ متوکل باقوت۔ توکلت

علی اللہ را در قالب ملک افگندہ است۔ و توقیع نام نہادہ۔ و توقیع سلطان جان بادشاہی ست کہ در کالبدش توقیع کردہ اند۔ توقیع شاہنشاہی بے علت توقیع بقاے ابدی میکند۔ ملک باربک کہ لسان السلاطین است کامرانی او بفرمانِ کامگاری آنست۔ فلاں خانزادہ درسن سی و دو۔ لسان السلاطین شد۔ مومنان راازآتش خلاص نیست مگر بہ پروانہ رسالہ محمد وکیل در خداے بادشاہ ملک وکیلدر رابر سالت کافراں رواں میکند تاایشاں رابرسالت رسول دعوت کند۔ امید است کہ ہمہ مسلمان شوند۔ زیراکہ دراداگوئی وحی می گزارد۔

غرض یہ کتاب اپنے لغات والفاظ اور غیر مشہور اصطلاحوں سے عام لوگوں کے بس کی نہیں اور خاص اشخاص کو ان کے کاروبار اجازت نہیں دیتے کہ گراں بہاوقت کو کوہ کنی اور کاہ برآری میں صرف کریں۔

خزائن الفتوح تاریخ ہے مگر اس میں بھی وہی ہتھکنڈے چلے جاتے ہیں۔ صفحہ صفحہ دو دو صفحے جگت بازی کر کے آدھی سطر کام کی آتی ہے۔ مجھے چند پھولوں کے لالچ نے اُس ریگستان میں اس سرے سے اُس سرے تک گھسیٹا اور اس لیے کہ پھر کسی تاریخی نکتہ کے لیے خاک نہ چھاننی پڑے دوبارہ اس کا خلاصہ لیا۔ پھر بھی حق سے نہ گزروں گا۔ اُن مبالغوں اور فضولیوں میں بھی بعض بعض فقرے ایسے ٹپک گئے ہیں کہ ہزار خونِ جگر اُن پر قربان ہیں۔ اس قسم کی تصنیفیں وہ انشا پرداز لکھتے تھے جنھیں شہرت کی خوشی آگے ہرے باغ دکھاتی تھی۔ یا قدردانی درباروں کی طرف بلاتی تھی۔ اداے مطلب اور عام ضرورت کے پورا کرنے والے اب بھی اپنی کتابیں بے تکلف اور عام زبان میں لکھ رہے تھے۔ چنانچہ نظام الدین بیضاوی نے نظام التواریخ۔ حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزید، خواجہ رشید الدین نے جامع التواریخ رشدی، اسی طرح لکھی جس طرح باتیں کرتے تھے۔

771ھ کے پس و پیش میں امیر تیمور اٹھے۔ علماو فضلا کی خوب قدردانیاں کیں۔ اگرچہ دربار سے لے کر لشکر تک ترکی ہی ترکی تھی لیکن ایک توزک اپنی فارسی زبان میں مفصل لکھوائی اور خود اپنے ملفوظات ترکی زبان میں لکھے۔ اکثر فرمان اور مراسلے ترکی میں جاری ہونے لگے۔ ان کی زبان بھی فقط قومی زبان تھی۔ وہ مذہبی برکت یا علمی دولت سے مفلس تھی۔ زبان فارسی ایسے قلاش سے کچھ لینا نہ چاہتی تھی۔ ترکی بھی فارسی پر اتنا ہی زور کر سکی کہ اس میں اکثر لفظ ترکی ملادیے اور اس کی ملنسار طبیعت نے بے تکلف انھیں جگہ دی۔ تیمور کی دوسری توزک

بڑی مبسوط کتاب ہے۔ دونوں میں لفظوں سے بڑھ کر جابجا چھوٹے چھوٹے فقرے ترکی آتے ہیں اور چونکہ بے تکلف عبارت میں ہیں اس لیے وہ مزہ دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے ایک جلسۂ مشورت کی گفتگو نقل کرتا ہوں :

کنگج در تسخیر دار الملک ہندستان۔ در اوّل حال بر سبیل مزاجدانی از فرزندان عظام و امرائے ذوی الاحترام کنگج در ملک ہندستان خواستم۔ امیر زادہ سلطان محمود گفت کہ ہند را میگیریم لیکن چہار حصار است۔ اوّل دریا و شہرہا، و دوم جنگلہا و بیشہ ہا، سوم سپاہ سلاح دار، چہارم فیلان آدمی شکار۔ امیر زادہ رستم گفت کہ در قوانین ترک خواندہ ام کہ چہار بادشاہ عظیم الشانند کہ از بزرگی ایشاں رابنام نمیخوانند۔ بادشاہ ہند را 'راو' میخوانند۔ و بادشاہ روم را 'قیصر' و بادشاہ چین و ماچین و خطا را 'فغفور' می نامند۔ و بادشاہ ترک را 'خاقان' میگویند۔ و بادشاہ ایران و توران را 'شہنشاہ' می نامند۔ و شہنشاہ را ہمیشہ حکم بر ہندستان جاری بود۔ و چوں ایران و توران در تصرف ماست لازم دُر کیم ہندستان بِذہ مسخر اُونسون۔ و امیر قراچار۔ و امیر جہان شاہ۔ و امیر خداداد گفتند کہ ہند را میگیریم لیکن اگر اقامت نمائیم نسل ما گم شود و اولاد و احفادِ ما از تُرکیّت بر آیند۔ و ہندی زبان شوند۔ ور فتہ رفتہ باہلِ ہند مخلوط شوند۔ و نام مُغلی از ما منقطع شود۔ و اسلام و شریعت را فراموش کنند۔ چوں ایں سخن را شنیدم بسیار ایر، سخن در من اثر کرد و او را تحسین کردم۔ درویش بو سیدم اما چوں در تسخیر و گرفتن ہند عزیمت بستہ بودم نخواستم کہ ترک عزیمت خود کنم۔ در جواب ایشاں گفتم کہ بہ تنگری تعالیٰ متوجہ میشوم۔ و از قرآن فال میکشایم تا بہ ہر چہ حکم تنگری تعالیٰ باشد بداں عمل نمایم۔ ایشاں ہمہ قبول کردند۔

سلاطین چنگیزی و تیموری کی بدولت ترکی کا اتنا اثر ہوا کہ بادشاہی عہدے، مہینوں اور برسوں کے نام۔ مشہور معرکوں کے اشارے۔ ان کے رسوم و رواج کے حوالے فن انشا میں آئے۔ یغما۔ تغما۔ سنگ یدَہ۔ ترکوں کی ترکتاز۔ ان کی زد و برد اور تیر اندازی آئی۔ مغان و مغبچگان کی جگہ ترکوں اور ترک بچوں کا حسن آیا۔ ترکان یغمائی، ترکان بخارائی، بتان فرخاری وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح استعاروں میں ترک چشم اور ترک نگاہ وغیرہ وغیرہ استعارے اور تشبیہیں فن انشا کے لیے باعث زیبائی ہوئے۔ ایران میں اگرچہ گانو کے گانو اور شہر میں محلے کے محلے ترکوں سے آباد ہو گئے مگر آپس میں ترکیاں اڑاتے رہے۔ ملک کی زبان فارسی رہی۔ البتہ ماورا النہر میں سمرقند و بخارا، خیوہ کوکان وغیرہ کل ملکوں کی زبانیں ترکی ہو گئیں۔

آل تیمور کی سلطنت میں تصنیفات کو بہت ترقی ہوئی کیونکہ انھیں عربی زبان کا سمجھنا بہت دشوار تھا۔ اس لیے فارسی کی تصنیفوں اور ترجموں پر زیادہ متوجہ ہوئے جس طرح انعام و اکرام نے امیدوں کے دامن بھرے۔ اسی طرح مصنفوں نے کتب خانے بھرے۔

800 اور 900ھ

اس صدی کے شروع میں میر شرف الدین علی یزدی ایک فاضل متبحر تھے۔ باوجود اس کے موزوں طبع، رنگین خیال تھے۔ زمانہ کی ہوا سے ان کی طبیعت مطابق اور قسمت موافق تھی۔ شاہزادہ ابراہیم ابن شاہرخ مرزا نے بڑی فرمائش اور نہایت التجا سے دادا کے کارنامے ان سے قلم بند کروائے۔ بادشاہی دفتروں سے روزنامچے نکالے گئے۔ تیموری کہن سال ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلائے گئے۔ چنانچہ میر موصوف نے 4 برس کاغذ پر خون جگر ٹپکایا۔ اس نے ظفر نامہ تیموری نام پایا۔ انشاپردازی کے دیندار آج تک اُن کا نام ادب سے لیتے ہیں اور ان کی کتاب پر تعظیم و تعریف کے چڑھاوے چڑھا۔تے ہیں۔

انھوں نے وصاف کی لغت بازی کو ہلکا کیا۔ عربی شعر موقوف کیے۔ عربی عبارتیں کم کیں۔ پھر بھی ہر مقدمہ کی ابتدا میں ایک تمہید ہے۔ مترادف الفاظ، فقروں کا پھیلاؤ، استعارات اور عربی لغات سے مطلب میں مبالغہ اور عبارت میں شور و غل پیدا کرتے ہیں۔ جُملے مقفّی اور ایک پر دوسرا ہم معنی فقرہ سوار ہے۔ مگر اس خوبی کو بھولنا بھی نہ چاہیے کہ زبان محاورہ سے دست و گریبان ہے، گویا وصاف نے جس طرز کی بنیاد ڈالی تھی انھوں نے اسے ایسا خوشنما دکھایا کہ رواج عام ہو گیا۔ لفظوں کی بہتات اور طولانی فقروں کو طبیعت کی آمد کہنے لگے اور استعارہ و تشبیہ کے ساتھ بہاریہ اور عاشقانہ خیالات کا رنگین کلامی اور معنی آفرینی نام ہوا۔

عبارت کا نمونہ

گفتار در رزم حضرتِ صاحبقران باسلطان محمود نبیرۂ فیروز شاہ والی ہندستان و ظفر یافتن بر ایشاں۔

چوں صاحبقران دیں پرور بروفقِ مضمونِ
بگیر قبضۂ شمشیرِ عدل و جنبش کن
بر آب گرد ہمہ ہند پادشا آسا

روے ہمت بلند بہ نیت جہاد بصوبِ ممالکِ ہندوستاں نہاد و بہر دیار کہ رسید جنود و فتح و ظفر باستقبال موکبِ ہمایونش استعجال نمود و بسے قلاع مسخر فرمود۔ در ہفتم ربیع الثانی روز سہ شنبہ کہ بہ ترکِ فلکِ فیروزہ فام بہرام خوں آشام منسوبست علی الصّباح کے خاقانِ مشرقی انتسابِ آفتاب در معرکۂ سپہر رایت طلوع برافراخت و سپاہ شاہِ سیاہ چہر شب راہزیمت دادہ جہاں پناہ گردوں و کہنہ دہلیِ دہر بوقلموں راز وحشت ہندو نژادانِ ظلمات سپرداخت۔ خورشید رائے کشور کشائے حضرتِ صاحبقرانی از مطلع تائیدات آسمانی برآمدہ پرتو التفات بر قہر دشمن و ترتیب سپاہ انداخت۔ بسعادت و اقبال سوار شد و صفوف عساکر ظفر قرین بعون خیر النّاصرین بر حسبِ اشارتِ اِصابت شعار از بُرنغار و جُوَنغار و قول واُلتمش وہراول بفر شکوہِ شاہزادۂ کامگار پیر محمد جہانگیر و سائر امرائے نامدار انتظام گرفت و ماہچہ رایتِ نصرت آیتِ حضرت صاحبقران از اوج قلب بطالع فرخندہ برآمدہ انوار فتح و فیروزی بر مفارق ہمگناں گسترد۔ لشکرے آراستہ گشت کہ تا جمشیدِ خورشید شہسوار مضمار چہارم است و میدانِ آسمان جولان گاہِ شاہِ ماہ و سپاہِ انجم۔ چشم زمانہ بر چناں انبوہے نیفتادہ و سپاہے باآں کثرت روئے جلادت بر زمگاہے نہادہ :

فراواں سپہ جمع شد پیش ازیں ندیدہ کسے لشکرے بیش ازیں

و بدیں نسق و ترتیب پیش راندند و از جانب سپاہِ مخالف سلطان محمود نبیرۂ سلطان فیروز شاہ باجماعتے از سروران ہند و سایر سپہ سالاران آں سرزمین صف ہا آراستہ بادہ ہزار سوار و چہل ہزار پیادۂ جنگی بااسباب و آلات حرب و پیکار روے مقابلہ و مقاتلہ بہ کارزار آوردند و عمدۂ استظہارِ شانِ پیلانِ کوہ پیکر بود کہ بر دنداں ہائے ستوں کردار شاں دشنہ ہاے زہر دار استوار کردہ و بر پُشتِ پشتہ مثال از چوب تخت ہائے محوط محکم ساختہ و بر ہر تختے چند ناوک افگن قادر انداز برائے جدال و قتال آمادہ و باایں ہمہ در نظر جلادتِ فوجے از عساکر گردوں مآثر وقعے چنداں نداشت اما پیلان را دیگر ندیدہ بودند و از افواہ و السنہ شنیدہ کہ ہیکل شاں از صلابت بجیستے ست کہ تیر و شمشیر براں کارگر نیست و قوت شاں بمرتبہ کہ مزیدے برآں متصور نے۔ درختان قوی را ببادِ حملہ از بیخ برآرند و بناہاے عالی را باشارت پہلوے ویراں سازند و ہنگام کارزار بخرطوم ثعباں کردار اسپ را باسوار از زمین در ربایند و بہوا بر اندازند و از کثرتِ استماع ایں مبالغہ ہا کہ در بیشتر طباع مرکوز است دغدغہ بخاطر لشکریان راہ یافتہ۔ چنانچہ در وقتِ تعین مواضع سروران و اعیان۔ مرحمتِ صاحبقران کہ در ہمہ حال شاملِ احوالِ اہلِ علم و کمال بودے از جمعے علماے رفیع مقدار کہ

ظفر کردار مُلازم رکابِ ہمایوں آثار بودند مثل خواجہ افضل پسر مولانا شیخ الاسلام جلال الحق و الدین و مولانا عبدالجبار پسر قاضی القضاۃ مولانا نعمان الدین خوارزمی بزبان اشفاق سوال فرمود کہ جائے شما کجاخواہد بود۔ ایشاں از غایت دہشت واندیشہ آں سخنان کہ شنیدہ بودند بجواب مبادرت نمودند کہ جاے بندگان دراں محل باید کہ خواتین و عورات باشند۔ ونہ عجب۔ شعر

دراں زماں کہ بود بیم جان شگفت مدار بزیرِ چادرِ ناہید اگر خزد بہرام

900ھ سے 1000ھ تک

اس صدی میں طرز ندکور کارواج عام ہو گیا۔ ملا حسین واعظ نے اسی انداز میں انوار سہیلی لکھی اور بعض اور تصنیفات پر بھی یہی رنگ چڑھایا۔

روضۃ الشہدا مذہبی کتاب ہے اس میں شہدائے کربلا کے مصائب کا بیان ہے جن پر آج تک زمانہ روتا ہے اور کچھ شک نہیں کہ مُلائے موصوف نے بھی اس غم نامہ کو بڑے صدق اعتقاد سے لکھا ہے۔ باوجود اس کے خونِ شُہدا سے گلزار کھلاتے ہیں۔ نالہ وزاری کے نغمے بناتے ہیں۔ سیہ قلم۔ مشکیں رقم اور حروف و عبارت سب سیہ پوش ہوتے ہیں۔ غرض کہاں تک بیاں کروں کہ کسی حال میں اس انداز کو بھولتے نہیں۔

زمانے کی ہوا دیکھ کر ہر مصنف نے اپنی تحریر کو اسی قالب میں ڈھالنا شروع کیا اور رنگینی کا رنگ عام ہو گیا۔

روضۃ الصفا میر آخوند شاہ نے 930ھ کے اندر لکھی۔ ابتدائے عالم سے عہد مصنف تک ایک جمہوری تاریخ ہے۔ چونکہ مختلف تاریخوں سے کہیں خلاصہ اور کہیں نقل لی ہے۔ اس لیے کسی سلطنت کا کچھ رنگ ہے اور کسی حکومت کی عبارت کا کچھ۔ لیکن زمانے کی ہوا بدل گئی تھی۔ جہاں اپنی عبارت لکھتے ہیں وہاں ہر بیان کے سر پر ایک تمہید کا تاج رکھتے ہیں اور رنگینی اور سنگینی سے اپنا کمال ثابت کرتے ہیں۔ جسے سب ادب سے تسلیم کرتے ہیں۔

حبیب السیر میر غیاث الدین نے لکھی۔ اس میں 930ھ تک کا حال ہے۔ اس صاحب کمال نے نظم ونثر دونوں میں طبیعت کا جوش دکھایا۔ گویا روضۃ الصفا کو اکثر عبارتیں بدل کر تقریباً ہم رنگ کیا۔ بہت سے حالات اپنی اپنی جگہ زیادہ کیے۔ خصوصاً علما و اہل کمال کے حالات

کو عہد بعہد خوب توضیح سے لکھا۔ مگر طول کلام اس قدر ہے اکثر جگہ صفحے کی خاک چھان کر مطلب کی دو باتیں نکلتی ہیں۔

اس صدی میں ترکوں کی ترکی تمام ہو کر ایران میں سلاطین صفویہ کا دور شروع ہوا۔ خاندان مذکور کی سیادت اور پارسا بزرگوں کی برکت نے خلائق کے دلوں میں عظمت کے نقش جمائے تھے۔ لاکھوں آدمی معتقد تھے۔ انھیں کے جوش اعتقاد نے مخدوم زادوں کو مسند فقر سے اٹھا کر سریر سلطنت پر بٹھادیا۔ وہ آبائی علوم کے سنبھالنے والے اور فرزندان فنون کے پالنے والے تھے۔ صدہا کتابیں ہر علم و فن کی فارسی میں تالیف و تصنیف ہوئیں۔ انشا پردازی، روشن استعاروں، چمکتی تشبیہوں، رنگین خیالوں سے مرصّع ہوئی۔ مضامین نے ترقی کر کے قطرے کو دریا اور ذرّے کو آفتاب کر دیا۔

1000ھ سے 1100ھ تک

یہ قاعدہ ہے کہ استعارے اور تشبیہیں جتنے نئے ہوں اتنے ہی خوش آیند ہوتے ہیں اور جتنے پاس پاس اور سامنے کی چیزوں میں ہوں اتنے ہی مزا دیتے ہیں کیونکہ جلد سمجھ میں آتے ہیں اور مطلب کے رنگ کو جھکاتے ہیں۔ 2۔ 3 سو برس میں پاس پاس کے استعارے خرچ ہوگئے اس لیے واجب ہوا کہ یا آگے سرکیں یا اضافت کو دہرا کر کے استعارہ در استعارہ کریں۔ اسی طرح صفت در صفت اور تشبیہ وغیرہ میں۔ چنانچہ پہلے گلِ عارض کہتے تھے۔ اب رنگ عارضِ گل۔ کہنے لگے۔ پہلے گلِ خوبی کہتے تھے۔ اب گلِ گلزارِ خوبی کہنے لگے۔ اس سے ایک نزاکت پیدا ہوگئی مگر معنی مشکل در مشکل ہوگئے۔ ان لوگوں نے قدر دانوں سے نازک خیال اور خیال بند کا خطاب حاصل کیا۔

عالم آرائے عباسی۔ سلاطین صفویہ کی تاریخ ہے۔ فارسی کے زبان دان سمجھتے ہیں کہ سکندر منشی نے ملک سخن میں انشا پردازی کا نشان بلند کیا ہے۔ اس نے ظفر نامہ کا انداز لیا ہے۔ طولانی اور الجھے ہوئے فقروں کو کچھ سلجھایا ہے کچھ الجھایا ہے اور استعاروں اور تشبیہوں کا رنگ بھی کچھ گہرا کیا ہے کچھ ہلکا کیا ہے۔ زبان کی خوبی کو جلوہ دیا ہے۔ پھر بھی جہاں جوش آجاتا

ہے وہاں دھوم دھام کی تمہید، لفظوں کی بہتات، بلند پروازی کا زور لگا تا ہے۔ اس پر تُرکی کا طرّہ۔ یہ گفتار اس کے قلم کی خاص رفتار ہے۔ عالم اور شاعر سب اُسے صاحبِ کمال اور اپنی طرز کا استاد مانتے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ طرزِ مذکور میں بذات خود کیا خوبی، کیا نقصان ہے۔ نمونۂ عبارت :

ذکر آغاز سال ایت ایل ترکی مطابق احدی و ثلثین والف کہ سال ششم قرن ثانی جلوس مبارک شاہی ظلِ الٰہی ست۔

باز طنطنہ رایات بہار طلیعہ افروز عرصۂ روزگار گشتہ جہانیاں را بتازگی نوید فتح۔ و مژدۂ فیروزی دادہ۔ آفتاب عالم تاب کہ نیّر اعظم۔ و منوّر ساز عرصہ عالم است۔ باکوکبہ نور واشعہ جہاں آرائے بہجت و سرور۔ قدم بر بساط شرف نہادہ۔ ساحتِ گیتی را از فروغ عالمگیری روشنی تازہ و طراوت بے اندازہ بخشید۔ دریں سال خجستہ آغاز سعادت فرجام نوروز فیروز در روز دوشنبہ ہشتم جمید الاوّل مطابق احدی و ثلثین والف ہجری اتفاق افتادہ نوعروسان حجلہ خاک بآراستگی و پیراستگی سر از جیبِ خاکِ مغاک بر آوردہ در بساط جہاں آرائے چمن روزگار بجلوہ گری در آمدند۔ گیاہ و لالہ و ازہار بصد زیب و بہار در عرصہ روزگار صف آراگشتہ عندلیب آسا بہزار زبان ثنائے شہریار کامگار کامران رسانیدند۔

نظم

بہار آمد دگر عالم نوی یافت | فروغ از بزم گاہِ خسروی یافت
جہاں را فرّۂ فرخندگی داد | خلائق را ز نو آسودگی داد

موکب نصرت قرین ہمایوں شاہی ظل الٰہی را بنا بر مقدّماتے کہ در سالِ گزشتہ اشعار شد۔ توجّہ خراسان در خاطر انور تصمیم یافتہ بود لہٰذا عنان نصرت نشان فیروزی و اقبال بجانب خراسان در حرکت آوردہ در قصبۂ 'طبس'، و 'کیلکی' نزول اجلال داشتند۔ بعد از مراسم جشن نوروزی و انجاح مطالب و مقاصد مجزّہ وزیر دستان۔ عنان اشہب صبا پیوند بعزم سیر و شکار سواحل رود ہیر مند۔ و انتظام مہمات ضروری خراسان۔ بدانصوب انعطاف دادہ۔ از راہ تومان دستِ بیاض قائن در حرکت آمدہ۔ فرمان قضا جریان بنفاذ پیوست کہ امرائے عظام و عساکر ظفر فرجام کہ در ولایت نیشاپور قشلاق فرمودہ بودند بولایت 'فراہ' آمدہ در انجا بموکب معلّی ملحق گردند۔ و سپاہ ظفر پناہ فوج فوج و قشون قشون روے توجہ بدانصوب آوردہ چوں موکب ہمایوں 'بفراہ' رسید طبقات

حشم وافواج خدم بنظر ہمایوں فرمانفرمائے عرب وعجم در آمدہ بقاعدہ و قانون مقرر بعرصہ گاہ شگافتہ زبان بدعا ثنا شہریار کامگار کامراں کشودند۔ سوانح ایں سفر خیریت اثر و فتوحاتے کہ روے دادہ در ذیل دفتر مرقوم قلم عنبریں رقم مے گردد انشاء اللہ تعالیٰ۔

ابواب الجنان۔ اسی صدی میں ملا رفیع واعظ قزوینی نے یہ کتاب تہذیب اخلاق میں لکھی۔ مذہبی پیرایہ میں وعظ و نصیحت کرتے ہیں۔ عبارت کے باب میں اتنا کہنا کافی ہے کہ جیسی زمانے کی ہوا دیکھی اسی انداز میں گھوڑا اڑایا ہے۔ پھر بھی یہ بات قابل تعریف ہے کہ وعظ کی کتاب ہے اور ہر مطلب کی بنیاد آیت اور حدیث پر ہے بلکہ جس صفحے میں دیکھو کئی آیتوں کے ٹکڑے اور حدیث کے فقرے نظر آتے ہیں۔ جہاں حکایت ہے وہ بھی مذہبی روایت ہے۔ باوجود اس کے اپنی انشا پردازی کے رنگ کو پھیکا نہیں ہونے دیتا۔ وہی لفظوں کی رنگینی، معانی کی بلند پردازی۔ استعاروں میں الجھے ہوئے فقرے، ہر فقرے کے ساتھ ہم معنی فقرے کا جوڑا موجود ہے۔

عبارت ابواب الجنان۔ ولیکن در زیارتِ قبور میباید کہ صاحب فرہنگانِ کامل۔ مانندِ شوخ وشنگان جاہل نباشند، کہ حسرت گاہِ مقابر را۔ عشرت گاہِ نفس کافر قرار دادہ۔ چنانکہ در اکثر بلاد متعارف ست۔ کہ ہر ہفتہ روزے معیّن بسیر آنجا میروند۔ و بتماشاے بازیگران و حقہ بازان کہ دراں معرکہ ہنگامہا ساختہ اند محو گشتہ۔ سراپا چشم و گوش میگردند۔ و صاحب مذاقانِ بے آبرو بصد گونہ طلب و جست و جو۔ فرزندانِ مسلمانان را از ہر سو بنظر در آوردہ۔ سر در دنبال ایشاں میگذارند۔ و شاہد بازانِ شوخ و شنگ۔ با جامہائے سرخ و زرد و نیمرنگ در ہر گوشہ باشاہدانِ بے حیاے حیلہ باز۔ ہنگامہ راز و نیاز در میاں میدارند۔ جمعے بیباک بر قبور آں غریبانِ خاک نشستہ۔ بجاے تلاوت قرآن بہ لغو و ہزیان مے پردازند۔ و گروہ گروہ در آں مقامِ پُر اندوہ۔ حلقہ بستہ۔ در عوضِ ہائے ہائے گریۂ کہ باید بروز خود کنند بہ قہقہہ و خندہ آواز بلند مے سازند۔ و اصلاً از اں عزیزانِ خاک شرم و حیا نہ۔ و از آخر کار خود اندیشہ و پروا نمیدارند۔ و نمیگویند کہ در زیر پاے ما بیک دو ذرع فاصلہ چہ خبر و چہ صحبت۔ و دریں شگافہائے زہرہ شگاف۔ چہ ولولہ و چہ وحشت است۔ ابنائے جنس ماںند کہ باخاکِ تیرہ یکساں گشتہ اند۔ اقران و امثال مایند۔ کہ نالۂ پُر حسرت شاں بزبانِ حال از فلک گزشتہ۔ گردن کشانند۔ سر بگریبانِ مذلّت کشیدہ۔ سخت مردانند۔ بسنگِ صعوبتِ اجل۔ نرم گرویدہ۔ سرو قدانند۔ ہیزم صفت در آتشِ نیستی قدم قدم بر سر ہم اُفتادہ۔

نازک تنانند۔ مانندِ اوراقِ گل در خاک فتاتہ تہ زیر زمین بر روے ہم نہادہ۔ آزادانند۔ ہیچ و پوچ گشتہ۔ دلشادانند۔ در آتش حسرت برشتہ۔ جہاں کشایانند۔ در بر روئے خود بستہ۔ فرماں روایانند۔ بتاسّف نافرمانی نشستہ۔ شیر شکارانند۔ سر در زنجیرِ امواج بلا کشیدہ۔ میداں دار نند۔ بسوراخ تنگ فنادر خزیدہ۔ صاحب نظرانند۔ سرمہ صفت در چشم خاک خفتہ۔ سخنورانند۔ مانندِ زبان در کام زمین نہفتہ۔ عالمانند۔ اجزاے کتاب وجود شاں از ہم پاشیدہ۔ کاتبانند۔ کز لکِ مرگ رقم ذکر شاں راز از صفحہ روزگار تراشیدہ۔ چرب زبانانند۔ شمع صفت مغز جانِ شاں بشعلہ مرگ گداختہ۔ شیریں کلامانند۔ مورانِ گور۔ جسمِ زار شاں را خانۂ زنبور ساختہ۔ کلۂ پُر بادانند۔ دستِ اجل خاک در کاسۂ سر شاں کردہ۔ خشک مغزان اند۔ آتش فنا دود از نہادِ شاں بر آوردہ۔ خود فروشانند۔ شکستِ متاعِ خودی را بجاں خریدہ۔ الواں پوشانند۔ جامۂ کفن بخونِ شاں گلبندے گرویدہ۔ از ہادئ طریقِ زندگی۔ و محیِ مراسمِ بندگی حضرت امیر المومنینؑ منقول است کہ ما من احد یمرُّ بمقبرۃ الا و اھل القبور یقبور یقولون۔ یا غافل۔ لو علمت ما نعلم لذاب لحمك علیٰ جسدك حاصل معنی اینکہ ہیچ کس بر قبرستانے گزر نمیکند۔ مگر اینکہ مردگان آں قبور۔ و خفتگانِ آں رخنہاے پر مار و مور۔ گویند اے بے خبر اگر بدانی۔ آنچہ ما میدانیم۔ ہر آئنہ بگداز دگوشت بر اندام ت۔

اسی صدی میں انشا پردازی کے عالم میں بہت سے مخلوق پیدا ہوئے جو عجیب الخلقت ہیں۔ یعنی چند کتابیں لکھی گئیں کہ علمی، تاریخی، اخلاقی کوئی مطلب کتابی ان میں نہیں۔ پھر بھی کتابیں ہیں۔ ایک ان میں سے سہ نثر ظہوری ہے۔ ابراہیم عادل شاہ نے علم موسیقی میں ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ اس کے 3 دیباچے ہیں۔ ان میں سرمایۂ مضمون کیا ہے؟ فقط تعریف یعنی خوشامد۔ پہلی نثر تمام گانے بجانے کی ضلع بازی ہے اور ناچ رنگ کے جگت اور پھبتیاں۔ جنھیں متین لوگ تشبیہیں اور استعارے کہتے ہیں۔ باوجود لطافت اور نزاکت کے ان کے مضامین کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ حمدِ الٰہی کو نغمہ اور زمزمہ بنادیا۔ قانونِ شریعت کو ساز و آواز میں بجادیا۔ بہرام کی کیا حقیقت ہے۔ گور میں نچادیا۔

فقرۂ نعت۔ و درود باساز و برگ نوازندۂ اُمّتان کہ قانونِ دین بمضراب ہدایتش پر صدا است۔

بادشاہ کی تعریف کرتے کرتے کہتے ہیں :

ز بس در نغمہ انگیزیست ایام سزد رقصد اگر در گور بہرام

باقی نثروں کے حال کہاں تک لکھوں افسوس آتا ہے کہ کیسے عالی دماغوں سے بلند مضامین اُترے اور کہاں برباد ہوئے۔

پنجبر قعہ یہ کتاب بھی انہی کی سنگت میں آئی۔ ہر رقعہ ایک لمبا چوڑا خط عاشق کی طرف سے معشوق کے نام ہے۔ مضمون، مطلب کچھ نہیں۔ طول کلام اور فقط استعاروں کے پیچ در پیچ ہیں۔ باقی خیر وعافیت۔ بے سہارے جسم کے۔ ہوا پر رنگ چڑھائے ہیں۔

مینا بازار میں بزاز۔ کنجڑا۔ تنبولی۔ بہت سے بازاریوں کی تعریف جدا جدا فصلوں میں کی ہے۔ آپ عاشق اور اتنے سارے معشوق۔ مضامین کی باریکی اور تاریکی سے تمام بازار میں اندھیر مچ رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے ظہوری کی تصنیف ہے۔ کوئی کہتا ہے ارادت خاں واضح کی۔

شبنم شاداب فقط ایک باغ کی تعریف ہے۔ وہی استعارہ اور تشبیہ کی بہار ہے۔ خیال کے پھول مہک رہے ہیں۔ رنگ اڑتا ہے ثمر کچھ نہیں۔ وہم کی نہر بہی جاتی ہے۔ مطلب ندارد۔

اسی صدی میں مرزا طاہر وحید شاہ عباس کے منشی باشی تھے۔ فرامین اور مراسلات شاہی لکھتے تھے۔ زور قلم سے کاغذ کے نقارے بجاتے تھے اور ہوائی توپیں چلاتے تھے۔ یہ سب ہم آواز مرغ ہیں۔ ایک ایک کی بولیاں کہاں تک سناؤں۔

میرے دوستو! یہ انشاپرداز۔ منہ زور گھوڑے کے شہسوار تھے کہ بے مطلبی کے میدانوں میں، بے ارادہ کسی منزل کے، خواہ مخواہ گھوڑے مارے چلے جاتے تھے اور حق پوچھو تو یہ بھی بڑا کمال ہے۔ ذرا سی بات کو بلکہ بے بنیاد معاملہ کو۔ مثلاً بادشاہ کی مدح کہ وہ بہت اچھا ہے۔ یا باغ کا حال خوب شاداب ہے۔ یا بازاری دکانداروں کی تعریف کو اس قدر لمبانا اور چوڑانا۔ بغیر دودھ کے اُبال اٹھانا ہے اور یہ انہی کا کام تھا، مگر بے حاصل۔

ایک تیز قلم مصور نے نظر کے زور اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتّی پر قلعۂ فورٹ ولیم کی تصویر کھینچی اور اس میں کوئی جز اس کی عمارت کا باقی نہ چھوڑا۔ یا کسی نازک دستکار نے چنے کی دال کا جنگی جہاز تراشا۔ اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اصل جہاز کا دیکھو تو موجود پاؤ۔ بے شک! دونوں نے بڑا کمال کیا۔ مگر اس کے قلعہ کے ایوان میں کونسا بادشاہ ملکداری کرے اور جہاز میں کونسا لشکر سمندر پار اُترے۔

انداز مذکور نے ایسا ذوق و شوق پھیلایا کہ تمام تحریریں تشبیہ اور استعارہ میں مسلسل ہو گئیں۔ کوئی ماجرا۔ کوئی معاملہ۔ کوئی مراسلت نہ رہی کہ اس سے خالی ہو۔ اسے رنگیں بیانی، نازک خیالی، معنی آفرینی کہنے لگے اور فقرے وہی ہم معنی۔ جوڑہ جوڑہ۔ جو بہت بے تکلف سادہ نویس ہوتے ان کا کلام رنگین نہ ہوتا تھا مگر نیم رنگ ضرور ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ سادہ نویسی اور سلاست عبارتِ زبان سے گم ہو گئی۔ بلکہ اصلیت نگاری اور مطلب نویسی کی طاقت اس میں نہ رہی اور زبان پر یہ داغ لگ گیا کہ مبالغہ اور بناوٹ فارسی زبان کا جوہر ہے۔ اہل ایران مالک زبان تھے۔ افغانستان، ترکستان، ہندستان سب اس کے شاگرد تھے۔ جو بات وہاں خوبی سمجھی گئی، اس کی نقل کو سب نے فخر سمجھا۔ ان کے قلم بھی انہی کی چال چلنے لگے۔ یہ صاحب زبان نہ تھے۔ ان بے چاروں کی زبانیں تھوڑے ہی عرصے میں ضعیف بلکہ اپاہج ہو گئیں۔

میرے دوستو! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ کُتب مذکورہ بالکل نکمّی ہیں۔ ایسا کبھی خیال نہ کرو۔ ان کے نازک خیال۔ خوبصورت استعارے۔ نئی نئی تشبیہیں، خوشنما ترکیبیں، لفظوں کی عمدہ تراشیں، خیالوں کی نزاکتیں، طبیعتوں کی بلند پروازیاں صنعتوں کے ہجوم جواب نہیں رکھتے۔ ظہوری نے جس فقرہ کے ساتھ فقرہ جوڑا ہے۔ وہی اس کا جوڑا ہے۔ مجال نہیں کہ ایک کو اٹھا کر کوئی دوسرا فقرہ اس کی جگہ رکھ سکے۔ ذرا دیکھنا! بادشاہ کی فصاحت کی تعریف میں کہتا ہے۔ نکتہ ہائے برجستہ۔ غنچہ ہائے سربستہ (پھر کہتا ہے) ہر صفحش چمنے۔ ہر سطرش انجمنے۔ ہر حرفش فصلے۔ وہر فرعش اصلے۔ (حسن کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے)۔ ابروانِ خجستہ۔ کلید دلہاے بستہ۔

بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو بڑے غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہیے۔ انھوں نے خوبیِ الفاظ اور نزاکتِ خیال اور زور طبع کو بے مطلب اور بے مدّعا خرچ کیا ہے۔ تم انھیں لو اور بیان مطلب کے کام میں لاؤ۔ پھر دیکھو گے تمھاری عبارت کیا کیفیت اور کیا تاثیر پیدا کرتی ہے۔

ہندُستان پر ان صدیوں میں اکبری اور جہانگیری دور تھا۔ اس کے مصنّفوں نے عہدِ صفوی کی تصنیفوں پر تصنیفیں لکھیں۔ ابوالفضل کو انشا کے عالم میں فرمانروا کہنا چاہیے۔ وہ باوجود فضیلتِ علمی کے قادر الکلام انشا پرداز تھا۔ اس نے ایرانی انشا پردازوں کے ساتھ میدان بمیدان برابر گھوڑے دوڑائے اور کہیں آگے بھی نکل گیا۔ اس کا اکبر نامہ عرصۂ سخن کا کارنامہ ہے۔ تین موٹی موٹی جلدوں میں انواع مضامین کے طلسمات باندھے ہیں۔ خوشنما انداز تراشتا

ہے اور نئے نئے فقرے ڈھالتا ہے۔ مراسلات شاہی کو پڑھو۔ سبحان اللہ، عبارت کی شان، شگفتگی بیان، ادائے مطلب کے انداز عین برجستہ و مناسب۔ لمبے لمبے فقرے۔ ان کا عجز و ایک دوسرے کی پشت پناہ۔ لفظوں کی بہتات کلام کا زور شور ہے کہ برابر توپخانہ داغتا چلا آتا ہے۔ اس پر طبیعت کا یہ عالم ہے کہ کہیں تھکتی ہی نہیں۔ زبردست تیر انداز کی کمان ہے۔ فقرہ پر فقرہ کستا ہی چلا آتا ہے، ڈھیلا نہیں ہوتا۔ پھر جس انداز میں چاہو دیکھ لو۔ یہی عالم ہے حکیمانہ، عالمانہ، صوفیانہ، دوستانہ، اقسامِ سخن میں۔ جس عبارت کو دیکھو سنجیدہ اور برگزیدہ خیالات ہیں۔ انھیں ایسے مناسب، برجستہ، برمحل الفاظ و عبارت میں ادا کیا ہے کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔

اکبر کو علوم و فنون۔ مذاہب اقوام۔ ہر امر کی تحقیقات کا شوق تھا۔ اس کے عہد میں سنسکرت۔ عربی۔ ترکی۔ لاطینی۔ یونانی سے اکثر کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ ابوالفضل نے کلیلہ دمنہ کو سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ کئی عالموں نے گنوان پنڈتوں کی مدد سے مہابھارت کے ترجمے کیے۔ ایک عالم نے انہی داناؤں کے ساتھ بیٹھ کر رامائن کو فارسی لباس پہنایا۔ سنگھاسن بتیسی کی پتلیوں کو فارسی بُلوایا۔ ان کتابوں کی عبارت نہایت سلیس ہے کیونکہ ادائے مطلب کے ساتھ اصل کی مطابقت مد نظر تھی۔

آئینِ اکبری حقیقت میں اکبر نامہ کی چوتھی جلد ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفضل کو رائج الوقت تحریر کی لغویت سمجھ میں آگئی تھی اس لیے پرانے انداز کو نیا کیا۔ اس نے فارسی کی پرانی تصنیفیں اُن پارسیوں سے پائی ہوں گی جو خاندیس سے اکبر کے دربار میں آئے تھے۔ اس نے پُرتگال اور اٹلی کے پادریوں اور عالموں سے لاطینی اور یونانی کتابوں کے ترجمے بھی لکھے یا اپنے ماتحت لکھوائے تھے۔ ان سے بھی سادہ نویسی کا مزہ پایا ہوگا۔

یہاں آئینِ اکبری کے مفید مطالب اور عمدہ تحقیقاتوں کے باب میں گفتگو کا موقع نہیں۔ طرز عبارت کے باب میں کہنا ضرور ہے کہ ہندُستان میں یہ طرز اسی صاحب کمال کا ایجاد ہے۔ آج تک دوسرا شخص اس پر قلم نہیں اٹھا سکا۔ تشبیہ اور استعارہ اگر اسے اپنی رنگینی کا قلم لگائیں تو ہاتھ کاٹے جائیں۔ ننھے ننھے فقرے برابر جڑے ہوئے جیسے ولایتی انار میں دانے۔ مگر ایک ایک دانے میں کئی کئی اناروں کا رس بھرا ہے۔ تاریخ، فلسفہ، فروع ریاضی، علم الارض، علم الحیوانات، اخلاق، تدبیر المنزل وغیرہ وغیرہ۔ کوئی علم نہیں جو اس میں نہ ہو۔ اس پر قدرت کلام دیکھو کہ جس زور سے اٹھا ہے چڑھتا ہی چلا گیا ہے اور اتنی موٹی کتاب کو اوّل سے آخر تک

ایک انداز میں تمام کر دیا ہے۔ نئی نئی تراشیں، انوکھی ترکیبیں، بیان کا بانکپن، ادائے مطلب کے نرالے انداز چشمہ خیز طبیعت سے اُبلتے آتے ہیں۔ وہی جوش تھا کہ خاتمۂ کتاب میں شعر ہو کر پھوٹ بہا :

بس کارنامہ ایست کہ آمد بروے کار
حیراں شوند اگر دو سہ حرفے رقم زنند

بے درد اسے فخریہ کہتے ہیں۔ آزاد کہتا ہے کہ واقعیت کے دل کا ارمان نہیں نکلا۔ اس سے بڑھ کر کہنا چاہیے تھا۔ اب اس کی چند سطریں سنائے بغیر مجھ سے نہیں رہا جاتا۔

آئینِ پیل خانہ

ایں شگرف جانور در تنومندی و استواری کوہ آسا۔ و در دلیری و جاں شکری شیر کردار۔ در شکوہ افزائی۔ و کشور کشائی۔ ستر گ نبرد۔ و در آبادیِ سپاہ و ملک۔ والا دست آویز۔ شناسندگانِ ہندی بوم۔ گزیدہ را برابر پانصد سوار بر شمارند۔ و بہ ہمعنانیِ دلیرانِ تیر انداز۔ یک تنہ کار ہزاراں کند۔ در تند خوئی و سبک عنانی چوں تازی بارگی۔ و در فرماں پذیری و رموز دانی بسان زیرک مردم۔ در شورشِ مستی و آشوب کینہ وری از مردمی۔ بیشتر بمادہ گزندے نرساند۔ با آنکہ دستمایہ[1] گرفتاری میگردد۔ و بخر دفیلاں در نیاویزد۔ و در خورمالش نداند۔ و از حق شناسی تیماردار خود را نیازارد۔ و ہموارہ خاکبازی کند۔ و در سواری ازاں باز ماند۔

فیلے در شورش مستی بھسر خود آویزہ داشت۔ خورد سالے پیش پاے اودر رسید۔ از مہربانی بخرطوم بر گرفتہ یکسو بر نہاد و جنگ از سر گرفت۔ و در وقت مستی چوں از بند رہائی یابد۔ و ہنگامہ خودسری آراید۔ ہیچ یک راز ہرہ آں نبود کہ پیرامون گردد۔ کاروان پُردل بر مادہ فیل سوار شدہ نزدیک رودو آنرا پاے بند کند۔ بسا مادہ در سوگواری از خورد آشام باز ماند۔ و در غم فرو شود۔ گوناگون آموزش پذیرد۔ واصول را کہ جز موسیقی شناس بداں راہ نیابد فرا یاد گیرد۔ واعضار ابداں

---

[1] کجلی بن میں جب ہاتھیوں کو پکڑتے ہیں تو ہتھنی کی لاگ سے پکڑتے ہیں۔ اُسے سدھا کر جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ ہاتھیوں کو لگالاتی ہے اور ان کی اصطلاح میں اسے کٹنی کہتے ہیں۔

نمط جنبش دہد۔ و برد شہابر آید۔ و کمان کشیدن۔ و تیر انداختن۔ وافتادہ رابر گرفتہ بہ فیلبان دادن خو کند۔ رسم آنست کہ دانہ بکاہ پیچیدہ بخورش دہند۔ باشارتِ پاسبان بگوشۂ دہن نگاہ دارد۔ و در تنہائی بر آوردہ سپارد۔ پستان و زاد نگاہ او بسان آدمی۔ و طوطی آسا گرد زبان۔ و خایہ پیدا یے ندارد۔ آب از درون شکم بخرطوم کشد۔ و بر خود افشاند۔ و بوے ناخوش ندہد۔ کاہ خوردہ را روزِ دیگر بیروں آورد و دگر گوں نبود۔ ارزِ او یک لک روپیہ تا صد باشد۔ و پنجہزاری بسیار پیدائے گیرد۔ وہ دہ ہزاری نیز یافتہ شود۔ چہار گونہ بود۔ یکے بھدّر بفتح 'با' و 'ہائے' خفی۔ و فتح 'دال' ہندی مشدّد۔ و 'را'۔ متناسب اعضا۔ افراختہ سر۔ کشادہ سینہ۔ بزرگ گوش۔ درازدُم۔ دلیر۔ و رنج کش باشد۔ و از پیشانی او مُہرہ چوں بزرگ مروارید بر آورند۔ و بہ ہندی زبان گج موتی گویند۔

اس وقت ہندستان میں فارسی زبان کی تصنیفات عام ہو گئی تھیں۔ ہر قسم کی تحریریں رنگین یا نیرنگ عبارتوں میں لکھتے تھے اور افسوس یہ ہے کہ تاریخ اور بیان واقعات میں بھی اس چال کو نہ چھوڑتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ استعارہ اور تشبیہ جو کلام کا زیور تھے ان کی بہتات سے کلام میں مبالغہ اور اصلیت میں فرق آگیا۔ جس بیان کو دیکھو۔ آدھا خواب سچا ہے۔ آدھا جھوٹا۔ آدھا تیتر۔ آدھی بٹیر۔

فاضل بدایونی کی منتخب التواریخ۔ آصف خان کا اکبر نامہ۔۔ نظام الدین بخشی کی طبقات اکبری وغیرہ وغیرہ۔ کوئی کم کوئی زیادہ اسی انداز میں لکھی گئی ہیں۔ یہ کتابیں عمدہ اور معتبر تاریخیں ہیں، مگر اندازِ تحریر نے چاندی کو کھوٹا کر دیا ہے۔ تاریخ کے علاوہ اکثر علمی اور مذہبی کتابیں بھی فارسی میں تحریر ہوتی تھیں۔

تاریخ فرشتہ دکن میں مرزا محمد قاسم فرشتہ نے لکھی۔ اس کا درخت خاکِ ایران سے اگا تھا۔ عبارت بموجب رواج وقت کے اعلیٰ درجہ فصاحت پر ہے۔ پہلے دفتر کی عبارت نیرنگ، دوسرے دفتر میں اس قدر زور مارا ہے کہ اگر بس ہوتا تو سہ نثر ظہوری سے جا ملاتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کل اوصاف رواج وقت کے موجود ہیں مگر یہ تاریخ کی شان نہیں۔

توزوک جہانگیری۔ جس طرح تیمور نے ملفوظات اور توزوک تیموری اور بابر نے توزوک بابری لکھی تھی۔ یہ کتاب جہانگیر نے خود لکھی اور اپنے ہی نام سے لکھی۔ اس کی سلیس عبارت اپنی سادگی میں آب رواں بہاتی ہے۔ صاف صاف باتیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو بولتا تھا، وہی لکھوا دیتا تھا۔ عمدہ تحقیقاتوں کے علاوہ بُری بھلی، میٹھی پھیکی۔ کوئی بات

اپنی نہیں چھوڑی۔ اسی سادگی کی برکت ہے کہ جہاں سے پڑھو بات پوری کیے بغیر چھوڑی نہیں جاتی۔

بہار دانش شاہجہاں کے عہد میں لکھی گئی۔ مطالب خلاف تہذیب۔ عبارت کہیں شوخ رنگ اور اکثر نیم رنگ ہے مگر خوش رنگ ہے اور محاورہ سے شیر و شکر۔ بادشاہ کی طبعِ باانصاف پر ہزار رحمت! دیکھ کر فرمایا۔ عنصر کثیف را کسوۃ لطیف در بر کردۂ۔ جب وزیر نے سفارش کے کلمے کہے تو کہا۔ خطِ زشت است و آبِ زر نوشت است حقِ محتش بدہند۔

شاہجہاں نامے کئی لکھے گئے جنھوں نے زیادہ طبیعت پر زور دیا ہے انہی نے مطالب پر زیادہ پردہ ڈالا ہے اور حال کو بدحال کیا ہے۔

نازک خیالی کا سکہ کل ایشیا میں چلتا تھا پھر بھی جو کام کے مواقع ہوتے تھے وہاں سادگی کی طرف التجا کرنی پڑتی تھی۔ مہموں کے ذمّوں والے اور تدبیروں کے دردمند رنگینی کی چھینٹ بھی اپنے کاغذ پر نہ پڑنے دیتے تھے۔ یہاں اس دور میں طرزِ مذکور کی کتاب رقعات عالمگیری ہے۔ عالمگیر نے دل معتدل اور زبان قادرالبیان پائی تھی۔ اس لیے اپنے فرمان اور خطوط آپ لکھتا تھا یا سامنے لکھواتا تھا۔ کاغذات پر خود حکم چڑھاتا تھا۔ وہ 50 برس سلطنت کر کے 1118ھ میں فوت ہوا۔ اس کی تحریریں دیکھ کر تعجب آتا ہے کہ جس طرح اورنگِ سلطنت زیر قدم رکھتا تھا۔ اسی طرح کشورِ سخن بھی زیرِ قلم۔ دیکھو اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے۔ ملک رانی کے پیچوں میں الجھے ہوئے ہیں مگر عبارت صاف ہے اور لفظ لفظ میں محاورہ کا نمک دیا ہوا ہے۔ تمام انتظامی ہدایتیں اور اکثر اخلاقی نصیحتیں ہیں کہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس کی تحریر کو گلستاں سے تشبیہ دوں تو مضائقہ نہیں۔ اتنا فرق ہو گا کہ گلستاں کے خیالی مضامین ہیں اور اس کے حالی۔ عبارت اس کی جتنی پڑھنے میں سہل ہے اتنی ہی لکھنے میں دشوار ہے۔

1100ھ سے 1200ھ تک

فارسی کی تحریر پر یہ صدی ایران اور توران میں برابر منحوس رہی۔ اصلیت مطالب عبارتوں سے جلاوطن ہو گئی تھی۔ جو عیب تھا وہی عین کمال سمجھا جاتا تھا۔ انشا پردازی کا نمونہ مرزا مہدی خاں کی تصنیفات ہے کہ نادر شاہ کا منشی باشی تھا۔ اس کی جہانکشا نادر شاہ کے عہد کی تاریخ ہے اور ایک انشا ہے جس میں بادشاہی فرمان اور مراسلے اور خطوط درج ہیں۔ انشائے مذکور

کی ایسی ہوا بندھی تھی کہ اب تک ایران سے قندھار اور کابل تک مکتبوں میں پڑھاتے ہیں اور بچّوں کو حفظ کرواتے ہیں۔

جہاں کشا کا انداز وہی ہے جو عالم آرائے عبّاسی کا ہے۔ جہاں کوئی بڑی مہم یا مقدمہ سلطنت ہوتا ہے وہاں تمہید کی دھوم دھام ہے۔ ایسے مقاموں میں فقرے پر ہم معنی فقرہ بھی سوار ہے۔ البتہ بیان مطالب میں خیالات نئے اور عبارتیں بھی کچھ سلیس۔ لمبے لمبے فقرے کم الجھے ہوئے ہیں۔ پھر بھی بات کو بلند لفظوں سے بڑھاتے اور چڑھاتے ہیں اور الفاظ مُکرّر کی اس پر طرّہ۔ حرف ربط اور اس کے فعل جملوں کے اخیر سے جابجا گراتے جاتے ہیں۔

جہاں کشا کی عبارت :

(جب نادر شاہ ہندوستان پر آیا اور کابل کے افغانوں نے قلعہ نشین ہو کر مقابلہ کیا۔ نادر نے 3۔ 4 کوس ہٹ کر لشکر ڈالا۔ تیسرے دن سوار ہو کر شہر کی طرف آیا۔ افغان باہر نکل کر توپیں اور بندوقیں مارنے لگے۔ اس موقع پر لکھا ہے :)

ایں معنی مہیّجِ غضبِ خاقانی گشتہ جمعے را کہ دراں وقت در رکابِ اقدس حاضر بودند بہ تنبیہ آں جماعت اشارۃ فرمودند۔ مامورین بجانب آں جماعت اسپ برانگیختہ۔ دہا شمشیرہائے آختہ بایشاں در آویختہ تاپائے قلعہ سر افشانی کردند۔ وغیرہ وغیرہ۔

(خیوہ کی مہم میں ایک شہر پر دھاوا کر کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اس مقام پر کہا ہے)

پس جوالہائے آسماں رفعت ترتیب دادہ توپہائے رعد ادائے اژدر دہان و خمپارہ ہائے ستارہ ریز آتش فشاں را سہ شبانہ روز برق خرمن صبر و تواں۔ و خانمانسوز قلعگیاں ساختند۔ و نقابان چابکدست از چند جابہ شگافتن زمین و کافتن نقب پرداختند۔ و دیوار قلعہ بضرب توپ قلعہ کوب ویراں۔ و نقبہا با برج و حصار دست و گریباں گردیدند۔

(مہمِ خوارزم سے فارغ ہو کر ملکی انتظام کیے۔ ان کے سلسلہ میں لکھا ہے:)

و تمامی اُسرا را کہ در عہد سلف از ولایاتِ خوراسان بردہ بودند۔ ذکور واناثاً جمع کردہ بہر یک از خویشان و اقربائے ایشاں کہ حاضر بودند سپردند۔ و ہمچنیں سابقاً جمعے از طائفہ روسیّہ گرفتار قید از بکیّہ بودند۔ ایشانرا متخلص۔ و بازاد و راحلہ مرخّص کردہ روانہ مقصد ساختند۔ و عدد اُسرائے خراسان ہمہ جہت دوازدہ ہزار نفر متجاوز میشد۔ بارگیر و دواب بجہت ایشاں سرانجام نمودہ۔ و ذخیرہ و ماکول در وجہ ایشاں معین فرمودہ روانہ خراسان ساختہ در قلعۂ کہ چہار فرسخ

ابیورد۔ بمعماری ہمت بلند و سرکاری نیت ارجمند آنحضرت احداث شدہ بود۔ سکنی دادہ قلعہ مذبور را بہ خیوہ آباد موسم کردند۔

ہندُستان میں آکر اس خیال بندی کی اور بھی مٹی خراب ہوئی۔ جو اہلِ ایران مالک زبان تھے، وہ ضرورت کے وقت مطلب بھی ادا کرجاتے تھے۔ یہاں کے لوگ بالکل اپاہج ہوگئے۔ فارسی کے اچھے اچھے دعویداروں اور انشاپردازوں کو دیکھا۔ جب کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو اول بہار کی تمہید اٹھاتے ہیں، پھر مطلب کی طرف مڑتے ہیں۔ ایک آدھ فقرہ کسی معمولی استعارہ پر بنیاد رکھ کر اٹھایا۔ اُس کے لفظوں کے خیال سے ایک اَور فقرہ اور اس کے لگاؤ سے کوئی اَور۔ پھر بہکتے بہکتے کہیں اور جاپڑتے ہیں۔ جب ہر پھر کر مطلب پر آئے تو پھُسک گئے۔ مطلب کی عبارت کو دیکھو تو پھُسر پھُسر۔ جب تک ہوائی طوطے مینا بولتے تھے۔ تب تک تو لعنت بہ پیچ کچھ تھے بھی۔ جب وہ نہ رہے تو کچھ بھی نہ رہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ زبان میں طاقت اور کلام میں بیان مطلب کی قوّت نہیں۔ حق یہ ہے کہ رنگینی اور عبارت آرائی جس طرح مطالب پر پردہ ڈالتی ہے، اسی طرح ان کی لیاقت کا پردہ ڈھانکتی ہے۔ جب وہ اٹھ جاتی ہے، پردہ اٹھ جاتا ہے۔ جن تشبیہوں اور استعاروں پر انھیں ناز ہوتا ہے۔ وہ بھی پہلے بزرگوں کے چبائے ہوئے نوالے ہوتے ہیں۔ انھیں کو چباتے ہیں اور موچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔

جو اعلیٰ درجے کے خیال بند کہلاتے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں مرزا بیدل کا 'چار عنصر' اور 'رقعات' وغیرہ ایک نامی نمونہ ہے۔ انھیں پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ اضافت پر اضافت۔ استعارہ در استعارہ۔ فقروں پر فقرے۔ خیال در خیال برابر چلے جاتے ہیں۔ اس پر مقفّیٰ اور مسجّع اتنے باریک ہوئے ہیں کہ نظر نہیں آتے اور جو کچھ ان سے سمجھ میں آتا ہے وہ اصل میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ الفاظ بہت خوشنما مگر سراسر مضمون۔ مدّعا غائب۔ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا کہتے ہیں اور کیوں کہتے ہیں۔ آپ خیال فرمایئے کہ اس طرز میں اگر کوئی تاریخ یا اخلاق یا کسی علم کی کتاب لکھی جائے یا کوئی سلطنت کا فرمان جاری ہو تو پڑھنے والوں پر کیا گزرے۔

کسی دوست کو ایک عرصے کے بعد خط لکھا ہے۔ مطلب کچھ نہیں فقط اتنی بات ہے کہ میں مدّت سے سوچ رہا تھا کہ کس عذر کے ساتھ آپ کو خط لکھوں۔ اس سوچنے کو دیکھو۔

رقعہ مدّتیست بے دل متحیّر غبارِ دامنِ تاملّ بود تا بوسیلۂ کدام طاعت سر از جیبِ تسلیم بدر آردیا بواسطۂ چہ خدمت قدم بہ عرصۂ نیاز گزارد۔ انفعالِ نارسایہا بسامانِ عرقے نہ

پرداختہ کہ ترّی از جبہ ٔ تحریر تواند شُست۔ و شرمِ ناتوانی بساطِ سرنگوں طرح نہ نمودہ کہ از خامۂ جرأتِ گردن افرازی تواں جست۔

طرز کے طرفدار ان فقروں کو پڑھتے اور لوٹ لوٹ جاتے ہیں کہ دیکھیے گا! کیا سوچ ہے! اور کیا عذر ہے! اور سلام بھی اسی میں آگیا اور نیاز بھی اور ندامت تو دیکھیے! اسی ڈھنگ کی 15 سطریں اور ہیں۔ مطلب مدّعا ہیچ۔

1200ھ سے 1300ھ تک

تیرھویں صدی میں زبانِ فارس کی لغویت حد کو پہنچ گئی۔ حالت یہ تھی کہ ملک کی طبعی زبان کئی سو برس سے معزول بیٹھی تھی اس لیے اپنے کلام میں ناطاقت بلکہ اپاہج ہو گئی تھی۔ خیال بند جو اس کے دعویدار بنے تھے۔ افلاس میں گرفتار تھے۔ خیالی رنگ ان کا سرمایہ تھا۔ وہ بھی اڑ گیا تھا۔ پرانے بزرگوں کے چیتھڑے لیتے تھے۔ انھی سے پیوند پارہ اور وقت کا گزارہ کرتے تھے۔ یعنی جب کچھ لکھنا ہوتا تو معمولی استعارے۔ وہی تشبیہیں۔ اکثر استادوں کے فقرے لے لیتے تھے۔ جوڑ توڑ کر مطلب ادا کر دیتے تھے۔ 70 برس اسی عالم میں گزر گئے۔

یکایک زبان کی طبیعت نے زور کیا اور اس طرح کیا کہ جن سببوں سے اب تک طرز تحریر میں تغیر ہوئے تھے۔ یہ ان سب سے علیحدہ تھا۔ شاہ نے ممالک یورپ کی طاقتوں کو دیکھ کر ملک کو خطرناک حالتوں میں دیکھا۔ غور کے بعد معلوم کیا کہ ان ملکوں کو علوم، فنون اور ایجادِ صنائع نے زور دیا ہے۔ اس لیے مستعد طالب علموں کو پیرس بھیجا۔ بعد اس کے اکثر دانایانِ یورپ کو بلا کر مدرسہ اور صنعت گری کا تعلیم خانہ کھولا۔ خود یورپ کا سفر کیا، وہاں کے تعلیم خانوں اور کارخانوں کو مشاہدہ کیا۔ اس سلسلہ میں ترجمہ اور تالیف کا رستہ کھلا۔ بہت کتابیں فرنچ۔ جرمن اور انگریزی سے ترجمہ ہوئیں۔ تاریخیں، جغرافیے، علما، حکما، شعرا کے تذکرے لکھے گئے۔ نئی تعلیم نے سبق پڑھا دیا تھا کہ ان مطالب کا ادا کرنا ملک کی طبعی زبان کے سوا دوسرے کا کام نہیں ہے۔ اس لیے اسی کو بحالی کا خلعت ملا اور خیال بندی کو ملک ایران بلکہ ملک خیال سے بھی نکالا ملا۔ اب تعلیم خانہ شاہی کے علاوہ اکثر شاہزادے، امرا اور شوقین علما تصنیفیں کر رہے ہیں۔ کاغذ دولت (گورنمنٹ گزٹ)۔ ایک اخبار باتصویر اور عام خبروں کے 3 اخبار جاری ہیں۔

اسی جوش و خروش میں صدہا برس کا دبا ہوا بیج پھوٹ نکلا۔ اس نے ایران کی تاریخ لکھ کر 'نامہ خسروان' نام رکھا۔ عہد قدیم سے آج تک کا حال اس میں درج کیا ہے اور یہ التزام رکھا ہے کہ ایک لفظ بھی عربی کا نہ آنے پائے۔ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوا اور باوجود ایسی سخت قید کے لطف عبارت اپنے اعتدال پر تلا ہوا ہے۔

ہندُستان میں اس صدی کے شروع میں اس زبان مذکور کا سکہ چلتا تھا مگر کچھ کھوٹا کچھ ملت۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ نہ فارسی نہ ہندی۔ نہ پلاؤ نہ کھچڑی۔ قاعدہ ہے کہ بنیاد قوم کی قوّت پر قائم ہوتی ہے۔ یا حکومت پر۔ قوم کے جو لوگ یہاں آئے تھے ان کی اولاد ہندی ہو گئی تھی۔ بادشاہ اور اس کا دربار سو سو برس سے شطرنج کی بساط ہو گیا تھا۔ ان کی زبان اردو ہو گئی تھی۔ اس صدی میں وہ دربار بھی نہ رہا تھا کیونکہ علمداری انگریزی ہو گئی۔ 30۔ 40 برس بعد کچہری کی تحریر اردو ہو گئی۔ پھر بھی 9 سو برس سے کہ فارسی کی جڑ دلوں میں دوڑی ہوئی تھی۔ اس کی محبت اہل ہند سے آپس کی تحریریں فارسی ہی میں لکھواتی تھی۔ سن رسیدہ بڈّھے کیا ہندو کیا مسلمان۔ اُردو کو بے علمی کی علامت جانتے تھے۔ لیکن اب وہ بھی نہ رہے۔ اس لیے ہر جگہ اردو ہی اردو ہے۔ باوجود اس کے اکثر ریاستوں اور پرانے قصبوں میں جو خاندانی اشخاص باقی ہیں وہ اب تک فارسی میں خط لکھتے ہیں مگر یہ پچھلی رات کی چاندنی ہے۔ آگے اللہ ہی اللہ ہے۔

اب میں ان چند فقروں پر لکچر کا خاتمہ کرتا ہوں کہ جس طرح ایران کی تصنیفیں پہلے ہم لوگوں کے لیے نمونۂ تحریر تھیں۔ ویسا ہی اب بھی عمدہ نمونہ ہیں اور تہذیب کے حکم کے بموجب نمونہ ہیں۔ ان کی صاف اور سلیس کتابوں میں 'ناسخ التواریخ' کا انداز ہماری اصلاح کا دستور العمل ہے۔ اس میں تکلف رنگینی اور عبارت آرائی کا اثر مل کر فضول لفظ کا گزر بھی نہیں ہوا۔ فقط ادائے مطلب ہے اور ایسے سنجیدہ اور برگزیدہ لفظوں میں ہے جو بیان کا حق جوں کا توں ادا کر دیتے ہیں۔

شاہ نے اپنے 4 سفر نامے لکھے۔ یہ مبارک نامے واجب تھا کہ اور کتابوں کے بادشاہ ہوتے۔ چنانچہ ہیں۔ وہ ہمیں قانون دیتے ہیں کہ اس طرح بولو، اس طرح لکھو۔ ان کی عبارت کی روانی پانی کی روانی ہے۔ دار التصنیف کے عالموں کو ان مراتب کی پابندی کی تاکید ہے۔ ان کی تصنیفیں خبر دیتی ہیں کہ تہذیب کے تار آ رہے ہیں۔ علوم و فنون کی ریل آیا چاہتی ہے۔ ملک کو مالا مال کر دے گی۔

منتظم ناصری۔ آغاز سال ہجرت سے ایک تاریخ عالم ہے اور سال بہ سال کا حال جس قدر تحقیق کو پہنچا ہے تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں یورپ کی تاریخوں کے مطالب بھی شامل ہیں۔

مرأت البلدان۔ اس میں ممالک دنیا کے ہر شہر کا حال ردیف وار ہے اور اس کے بیان میں ایشیا اور یورپ کی معلومات کا سرمایہ شامل ہے۔

تذکرۃ العلما۔ علماے اسلام کے سوانح عمری عمدہ تحقیق اور مناسب تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔

شاہی جنتری۔ سال بسال چھپتی ہے۔ اس میں مملکت کے عزل و نصب۔ عہدہ داروں کے نام اور ترقی و تنزل کے احکام مشتہر ہوتے ہیں۔ ان سب کی عبارت ایک انداز میں ہوتی ہے۔

دارالترجمہ اور دارالتصنیف کے دفتر کھلے ہیں اور تصنیفات کے سلسلے جاری ہیں۔ شاہ اپنے قلم خاص سے بھی بعض مسوّدے لکھ کر بھیجتے ہیں اور علما کے مسوّدے طلب کر کے سنتے ہیں اور ہدایتیں کرتے ہیں۔ نئی تصنیفوں کی تفصیل کہاں تک لکھوں۔ اگر ہوس است۔ ہمیں قدر بس است۔

عزیزانِ وطن! زبان نے جو صدی بہ صدی انقلاب کے رنگ بدلے۔ آپ نے دیکھے۔ اگرچہ ان کے پھیلانے کو سامنے میدان فراخ ہے۔ مگر فرصت کا میدان تنگ ہے۔ شائقانِ سخن اجازت دیں کہ اب طول کلام کو مختصر کروں اور آریا کے رشتہ سے جو سنسکرت اور فارسی کا تعلق ہے اس کے بیان کا سامان کروں۔

پانچواں لکچر

قُدمائے فارس کے اُصولِ شرعی اور رُسومِ عرفی

میں نے جلسۂ گزشتہ میں فارس اور فارس کے آئینِ شرعی، رسومِ قومی اور آداب سلطنت کے باب میں کچھ کچھ اشارے کیے تھے۔ اب خیال کیا تو ان کی آگاہی بھی انشاپردازی کا ایک جزو مستقل ہے اور تہذیب و شائستگی کیسی قدم بقدم ساتھ چلتی ہے۔ یہ بھی دیکھو کہ ہر ملک کی تاریخ وہاں کے آئین قدیم اور قواعدِ رسوم کو ظاہر کرتی ہے لیکن بالفرض اگر تاریخ بالکل نہ رہے تو انشاپردازی وہاں کی کس خوبصورتی سے مٹے ہوئے نشانوں پر اشارے کرتی ہے۔ ان سب باتوں میں ہندوؤں کے ریت رسوم پر بھی خیال کرنا ہوگا۔

عزیزانِ وطن! اس ملک میں بہت سے خاندان بادشاہوں کے گزرے۔ ان میں 'مہ آبادیوں' کا خاندان شہرت۔ عظمت اور تقدس میں سب پر فائق تھا اور یہی خاندان تاریخ ایران کے سر کا تاج ہے۔ یہ پاک سلسلہ بادشاہی سکتہ سے حکمرانی کرتا رہا اور پیغمبری برکت سے خلائق کے دلوں میں اطاعت کی تاثیر دیتا رہا۔ پھر اخیر میں آکر پیشدادی۔ کیانی۔ اشکانی۔ ساسانی۔ چار خاندان نامور ہیں جن پر تاریخ فارس کی بنیاد قائم ہے۔ مہ آبادیوں کے فرمانوں کی تعمیل سب کے نزدیک دین کی سعادت اور دنیا کی برکت سمجھی گئی۔ ان کے احکام آئین فرہنگ کہلاتے تھے۔

جتانے کے قابل بات یہ ہے کہ اکثر باتیں شاستر سے مطابق تھیں۔ گویا دونوں

شاخیں ایک درخت سے نکلتی ہیں۔

(1) جو 4 برن ہندوؤں میں اب تک موجود ہیں وہی وہاں تھے۔ عہد قدیم کی تقسیم میں 1۔ کاتوزی ترک دنیا کر کے پہاڑوں میں رہتے تھے۔ 2۔ نیساری لشکروں کو قوت، سلطنت کو قیام، مردانگی کو عزت دیتے تھے۔ 3۔ نسودی۔ سختی اور سخت بات کی برداشت نہ کرتے تھے۔ 4۔ انوحشی۔ محنت کشی اور پیشہ وری کرتے تھے۔

ان چار حلقوں کو زمانہ کی گردش نے توڑ ڈالا۔ اس لیے جمشید کو پھر بندوبست کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل 'وندیداد' میں اس طرح ہے۔ 1۔ آسورانی۔ علماے ملت۔ 2۔ 'ارتشتار'۔ سلاطین وسپاہ۔ 3۔ 'استر ہوش'۔ کشتکار۔ 4۔ 'ہوتخش'۔ کارندے اور مزدور۔

کہتے ہیں کہ اس میں اخیر کے دو لفظ ژندوپاژند کے ہیں۔ مالکم صاحب کہتے ہیں کہ مجھے یہ امر تحقیق نہیں ہوا۔ البتہ واستر، پہلوی میں دانہ اور سبزہ کو کہتے ہیں۔ ہو۔ خوب۔ آزاد کہتا ہے کہ برہان میں واس، غلہ اور تخشا محنت و کوشش کو کہتے ہیں۔

لطیفہ۔ فارس کے محاورہ میں جواب تک 4 مذہب دیکھتے ہیں۔ مثلاً :

مئے گو چو آبِ زلال آمدہ بہر چار مذہب حلال آمدہ

مُلک کی قدیم زبان میں 4 ملت ہوگا اور اس سے یہی چار فرقے مراد ہوں گے کہ جو کل قوم کو شامل تھے۔ اسلام کے بعد بھی محاورہ کا اثر قائم رہا۔ پھر 4 اماموں کے 4 فتوے مراد رکھے گئے۔

(2) ان کے مذہب میں بھی حیواناتِ بے آزار کا مارنا گناہِ عظیم تھا :

چہ خوش گفت فردوسیِ پاک زاد کہ رحمت براں تُربتِ پاک باد

میازار مورے کہ دانہ کش است کہ جاں دارد و جانِ شیریں خوش است

موذی حیوانوں کا مارنا جائز تھا۔ 'شودر' لوگوں کو شکار کا گوشت اور ان کا مردار کھانا بھی جائز تھا۔

(3) تناسخ کا مسئلہ ان میں بھی تھا چنانچہ جو شخص بے گناہ کو مارے اسے دوسری ولادت میں اس کا عذاب اٹھانا پڑتا تھا۔ ہمارے تصوف نے اس خیال کو زندہ کیا۔

ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

ہزار بار خم و کوزہ کردہ اند مرا ہنوز تلخ مزاجم ز مرگ شیریں کار

(4) صبح۔ دوپہر، آدھی رات، شام عبادت کے وقت تھے۔ اس میں یادِ الٰہی کے زمزمے اور گیت ہوتے تھے۔ انھیں 'کاتھا' کہتے تھے۔ یہ وہی لفظ ہوگا جس کے نام پر یہاں 'گیتا' کتاب ہے۔ 'وید' میں 'منتر' ہیں۔ 'کاتھا' کے اجزا 'منتھرا' کہلاتے ہیں۔ ہر گرہن کے وقت خاص خاص طور پر عبادتیں بجالاتے تھے۔ لطیفہ یہ ہے کہ 'گرہن' سنسکرت میں اس مصدر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں 'گرفتن'۔ فارسی میں آج تک گرفتن آفتاب اور گرفتن ماہ محاورہ ہے۔

(5) خدائی کے کارکن بہت سے 'دیوتا' یا فرشتے تھے اور انھیں کاروبارِ دنیا میں صاحب اختیار سمجھتے تھے۔ یہ مسئلہ ہند۔ یونان۔ روما وغیرہ کے اکثر قدیمی مذہبوں میں ہے۔ فلاسفہ عرب نے اس کا ترجمہ 'ربّ النوع' کیا۔ آگ، پانی، ابر، بجلی، بہار، حسن، عشق، راگ رنگ، وقت وغیرہ وغیرہ سب کے لیے ایک ایک دیوتا تھا۔ زرتشت نے آکر ان خیالات کو مٹایا۔ وہی پرانے خیال تھے جنھیں سعدی نے رنگِ توحید میں کہا ہے:

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند　　　تا تو نانے بکف آری و بہ غفلت نخوری

ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار　　　شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نہ بری

غور کرو تو دیوتاؤں کا معاملہ ایک طبعی خیال ہے کہ انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ متأخرین فارس کے دماغ سے بھی اپنے استعارات کی لہر میں کہیں کہیں ٹپک گیا ہے اور ظہوری سے اس کا ظہور اکثر ہوا۔ وہ 'سہ نثر' کی حمد و نعت کے بعد بادشاہ کی تعریف میں کہتا ہے: 'مژدہ شنیدن را بہ گفتنِ سخن شہنشاہِ چنیں وچناں۔' مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ قوۃِ کلیّۂ شنیدن کی (یارب النوع سماعت) جس سے ہر کان کو فیضانِ سماعت پہنچتا ہے اسے خوشخبری ہو کہ میں فلاں ممدوح کی تعریف شروع کرتا ہوں۔ اس میں دو لطف ہیں۔ اوّل یہ کہ ہر خاص و عام ایسے امر عالی شان کے سننے کے قابل نہیں۔ رب النوع سماعت سنے۔ دوسرے جس وقت وہ سنے گا تو فیض لطف اس کا خود بخود تمام جہان کو پہنچ جائے گا۔ ایک اور جگہ کہتا ہے؛ فضاے دیدن بہ صفحا تش گلشن۔ وسوادِ خواندن بہ بیاضش روشن۔ یہ بھی اسی جوہر کی چمک ہے کہ اندر سے لفظوں میں چمکی ہے۔

قربانی بھی کرتے تھے اور اسے 'استی' کہتے تھے۔ دیکھو۔ اسے سنسکرت میں اشٹی इष्टि کہتے ہیں۔

جنیؤ اگرچہ بعینہ ایسا نہیں۔ مگر ایک رسّی کمر سے لپیٹتے ہیں اور اسے 'کستی' کہتے ہیں۔

ہون بھی ہوتا تھا اس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ مگر عبادت مذکور کے وقت جو آگ پر چمچہ سے گھی ڈالتے ہیں اسے 'آجِوتی' کہتے تھے۔ سنسکرت میں 'آہوتی' आहुति کہتے ہیں۔

(6) پہلے یہاں اور وہاں 'آسُر' بمعنی غالب تھا۔ رگھوبید کے ابتدا میں اس سے آفتاب مراد ہے۔ زرتشت کے عقائد سے دونوں میں مخالفت پڑی۔ ہندو 'اَہر' کو شیطان قرار دے کر 'آسُر' کہنے لگے۔ ایرانی بدستور 'اَہر' بمعنی غالب سمجھ کر 'اہورامزدا' (ہرمزد) خدا کو کہتے ہیں (سنسکرت کا 'س' فارسی میں 'ھ' ہو جاتا ہے)۔

دیو کے معنی پہلے دونوں جگہ متبرک تھے۔ پارسیوں نے ہندوؤں کی ضد سے دیو بمعنی شیطان بنادیا۔ خیالات کا اتفاق پھر بھی قابل غور ہے کہ یہاں نیک اشخاص کو راکشسوں سے لڑایا ہے۔ وہاں دیوؤں سے لڑایا ہے۔ تم نے 'رامائن' میں سنا ہوگا کہ جنگل کے جانوروں نے راون کے مقابلے میں رامچندر جی کی مدد کی۔ 'شاہنامہ' میں کیومرث کا حال پڑھو۔ اس کے بیٹے کو دیو نے مار ڈالا۔ باپ نے دیووں پر فوج کشی کی۔ شیر، چیتے، بھیڑیے، جنگل کے درندے اس کی فوج میں داخل ہوئے۔ آخر دیووں پر شکست پڑی۔ درندوں نے انھیں چیر پھاڑ کر فنا کر دیا۔

تاتار کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ 'دیو' سے اکثر اہل چین مراد لیتے ہیں کہ انھیں آکر ستاتے تھے۔ اسی واسطے دیو اکثر ایسے دشمن کو کہتے تھے جو قوت اور حیلہ تدبیر میں ان سے چست اور غالب ہو۔

(7) اجرام آسمانی کی عظمت واجب اور تغیرات عالم میں انھیں موثر سمجھتے تھے۔ دبستانِ مذاہب میں سات سیاروں کی صورتیں لکھی ہیں۔ ہندی جوتش سے مطابق نہیں مگر مشابہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کی مورتیں بنا کر پرستش کرتے تھے۔ ان کے گنبد اور اس میں پرستش کے طریقے اور دھونیاں جدا جدا تھیں۔

زحل کی مورت سنگِ سیاہ کی بنائی تھی۔ بندر کا سر۔ آدمی کا بدن۔ سُور کی دُم۔

مشتری۔ خاکی رنگ۔ گدھے کا سر۔ اس پر تاج۔ تاج پر مرغ کا سر اور اژدہا۔

مرّیخ۔ مورت سنگ مرمر کی۔ داہنے ہاتھ میں تلوار۔ اس ہاتھ کو لٹکائے تھا۔ بائیں

ہاتھ میں لوہے کا کوڑا علم کیے تھا۔

سورج کی مورت سونے کی ڈھلی ہوئی تھی۔ایک آدمی گھوڑے پر سوار۔ دو رُخا چہرہ۔ دونوں سروں پر تاج۔ سات سات کنگرے۔ لعل و یاقوت سے مرصّع۔ اژدہے کی دُم۔ داہنے ہاتھ میں سونے کا عصا۔ جواہرات کا مرصّع ہار گلے میں۔

زہرہ۔ آدمی کی مورت۔ سر پر سات گوشہ کا تاج۔ دست راست میں ایک تیل کا شیشہ۔ بائیں ہاتھ میں کنگھی۔

عطارد۔ سُور کا سر۔ مچھلی کا دھڑ۔ سر پر تاج۔ داہنے ہاتھ میں قلم۔ بائیں میں دوات۔

چاند۔ ایک آدمی سفید گائے پر سوار۔ داہنے ہاتھ میں یاقوت کا عصا۔ بائیں میں تلسی کی ٹہنی۔

اسی واسطے ہر کام لگن پوچھ کر اور ساعت دکھا کر کرتے تھے۔ جس دن جواہرات کانوں سے۔ پھول پھل باغوں سے۔ اناج کھیتوں سے۔ پشم بھیڑ بکری اونٹوں سے لینی شروع کرتے تھے تو مبارک دن مبارک لگن دیکھ لیتے تھے۔ مہینے کا ایک دن۔ ایک ایک دیوتا یا فرشتہ کا تھا۔ ہفتہ کا ایک ایک دن، ایک ستارہ کا۔

افسانہ گو کا قاعدہ ہے کہ جن کا افسانہ کہتا ہے۔ اُن کا اُن کے ملک کا، اُن کے رسم و رواج کا جامہ پہن لیتا ہے۔ فردوسی اپنے شاہنامہ میں جہاں ان لوگوں کی زبانی باتیں کرتا ہے۔ ستاروں کا پرتو ضرور دیتا ہے مثلاً :

بدو گفت سہراب کاے خوب چہر　　به تاج و به تخت و به ماه به مہر
که ایں باره باخاک پست آورم　　ترا اے ستمگر بدست آورم

پھر کہتا ہے :

مگر چوں تو باشی بمردی و زور　　سپہرش دہد بہره کیوان و ہور

پھر کہتا ہے :

چنینم نوشته بُد اختر به سر　　که من کشته گردم بدستِ پدر

اگرچہ اسلام نے ان اعتقادوں کو بالکل مٹا دیا مگر ان کا خیال نہ مٹ سکا۔ شیخ سعدی ایک پردہ کے ساتھ کہتے ہیں :

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کار اند　　تا تو نانے بہ کف آری و بہ غفلت نہ خوری

مؤکّلے کہ تعین است بر خزائنِ باد چہ غم خورد کہ بمیرد چراغ بیوہ زنے

خواجہ حافظ کہتے ہیں :

مزرعِ سبز فلک دیدم و داسِ مہِ نو یادم از کشتہ خویش آمد و ہنگام درد

تکیہ بر اختر شب گرد مکن کیں عیار تاج کاؤس ربود و کمر کیخسرد

ان کی خصوصیت نہیں۔ ہر شاعر نے اپنے اپنے طور پر یہ مضمون باندھے ہیں۔

(8) گائے کی محبت ان کے سینوں میں دلنشیں تھی اور اس کا سبب عام شفقت یا حق شناسی معلوم ہوتی ہے جو ہمیشہ نیک دلوں میں رہتی ہے۔ گرشاسپ نامہ میں لکھا ہے کہ سیستان میں ایک بادشاہ تھا اس کی بیٹی جمشید کے محل میں تھی اور نور یعنی گرشاسپ کا پرداداد ختر مذکور کے بطن سے تھا۔ وہ گائے کی عظمت کرتا تھا۔ 'گاورنگ' اس کا نام تھا۔ اسدی طوسی نے گرشاسپ نامہ میں لکھا ہے :

مر آں شاہ را نام گورنگ بود کز و تیغ و فرہنگ بے زنگ بود

نوشیرواں کا چچیرا بھائی حاکم مازندران اسی محبت سے 'گاویار' کہلاتا تھا۔ نژاد نامہ میں اس کا حال توضیح سے لکھا ہے۔

ابوریحان البیرونی نے آثار الباقیہ میں لکھا ہے کہ مملکت مذکور میں 7 بادشاہ ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے گائے کی محبت اور عظمت سے اسے اپنے نام کا جز قرار دیا تھا۔

پارسی لوگ مہرگان کے دن عید کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آج کی رات ایک گائے ظاہر ہوتی ہے۔ سونے کے سینگ۔ چاندی کے کھر۔ ایک جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے۔ جسے نظر آتی ہے اس کا تمام سال عیش اور خوش حالی میں گزرتا ہے۔

گائے کی عظمت کا سبب ایک اور تاریخی افسانہ ہے اور چونکہ اس میں چند اَور الفاظ کی دلچسپ توضیح ہوتی ہے۔ اس لیے بیان کرتا ہوں کہ فارسی کے مبتدی شوقینوں کے لیے سرمایہ آگاہی ہوگا اور یہ بھی دیکھیں گے کہ ملک کی انشاپردازی اپنے ملک کی تاریخ کن اشاروں سے بتاتی ہے۔

ماران ضحاک۔ جب ضحاک نے بلادِ عرب سے اٹھ کر جمشید کی سلطنت کو خود پرستی کے گناہ اور غفلت کی سزا دی تو شہنشاہی کا تاج سر پر رکھا اور ایسا ظلم و ستم کرنے لگا کہ تمام ایران گھبرا اٹھا۔ اس کے دونوں شانوں پر دو پھوڑے نکل آئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ گناہوں کی

سزا میں خدا نے دو سانپ بھیجے تھے۔ بہر حال طبیبوں نے آدمی کا بھیجا درد کی دوا یا سانپوں کی غذا نکالی۔ گھر گھر سے باری باری دو نوجوان بے گناہ لے کر مارے جاتے تھے۔

مایہ۔ مایون۔ ضحاک کو ہر وقت خاندان شاہی کی طرف سے کھٹکا لگا رہتا تھا۔ جسے کیانی سنتا تھا مروا ڈالتا تھا۔ ایک حاملہ بی بی جان بچا کر بھاگی اور پہاڑوں میں گھس کر کسی گاؤں میں رہنے لگی۔ بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام 'فریدون' رکھا۔ نحوست کی گرمی نے دودھ سکھا دیا۔ خدائی رحمت نے ایک گائے بھجوادی۔ اس کا نام 'مایہ' یا 'مایون' رکھا۔ کیونکہ مایۂ پرورش تھی۔ ادب سے 'برمایہ' اور 'برمایون' بھی کہتے تھے۔ اسی حالت کے بیان میں فردوسی تقدیر کی زبانی کہتا ہے:

یکے گاؤ برمایہ خواہد بُدن جہاں دار را دایہ خواہد بُدن

قدرتِ الٰہی اقبال کے فرزند کو پہاڑوں میں پال رہی تھی۔ نجومی اور فال بین ہر وقت دربار میں لگے رہتے تھے۔ ظالم کو خبر دی کہ ماں بچے سمیت فلاں مقام میں ہے۔ سنتے ہی خود روانہ ہوا۔ جب اس کی آمد آمد کی خبر اُڑی۔ عاجز بی بی نے بچے کو تعویذ کی طرح گلے سے لگایا اور اس گاؤں سے سرک گئی۔ 'مایہ' رہ گئی۔ خونخوار نے جل کر اسے مروا ڈالا۔

درفش کاویانی۔ 'کاوہ' ایک لُہار تھا مگر صاحبِ خاندان۔ '70' بیٹے پوتے اپنے تن کے رکھتا تھا۔ ایک دن اس کے بیٹے بھی سانپوں کے حصے میں گئے۔ لُہار لوہے کی طرح لال ہو گیا۔ مگر بُڈھا کہن سال تھا۔ حبِّ قومی کے خون کو گرما کر اٹھا۔ اس نے اپنے پیش بند چمڑے کو ایک بانس پر باندھ کر حبِ قومی کا نشان قرار دیا۔ قوم کے نام پر ہزاروں آدمی اُمنڈ پڑے اور ان ستم رسیدوں کا شمار نہ تھا جو سمجھتے تھے کہ مدتوں کے بعد خدا نے دُعا قبول کی ہے۔

گرزِ گاؤ سر۔ جب حبِّ قوم کی آگ سلگی تو اقبال کا فرزند پہاڑوں میں پَل کر جوان ہو گیا تھا۔ قوم کے حامیوں نے اُسے پتھروں سے اٹھا کر جواہر نگار تخت پر بٹھا دیا اور ضحاک پر لشکر لے کر آئے کہ حق دار کو حق دلائیں۔ کاوہ کا لوہا تیز نکلا۔ حمایت قومی فتحیاب ہوئی اور ایسا جبّار و قہّار بادشاہ باوجود خزائن شاہی اور سامان و لشکر کے گرفتار ہوا۔ فتحیاب فریدوں نے حبِّ قوم کے چمڑے کو مبارک سمجھ کر لعل و جواہر اور موتیوں سے مرصّع کیا اور درفش کاویانی نام رکھا۔ محبت کا دودھ جوش میں آیا۔ پیاری برمایہ کی یاد میں اپنے گرزِ فولادی کو کلۂ گاو کی مورت میں ڈھالا۔ (فردوسی نے کہا):

بیامد فریدوں بجاے نشست ہماں گرزۂ گاؤ پیکر بدست

تمام ایرانی پہلوانوں نے پیروی کی۔ آج تک گرزِ گاؤسر۔ گاؤسار۔ گاؤپیکر۔ گاؤچہر سے فصحا اپنے کلام پر شوکت کے سینگ نکالتے ہیں اور فریدوں کے ساتھ برمایہ کے نام کو بھی زندہ کرتے ہیں۔ دقیقی نے ایک بہاریہ قصیدہ کا کیا خوب مطلع کہا ہے۔ ذرا وقت کی زبان پر بھی خیال کرنا :

نو بہار آمد جشن ملک افرودنا واں کجا گاو نکو بودش برمایونا

غور کرو۔ کل ملک میں تاریخ کی واقفیت عام تھی جبھی انشاپردازی میں ایسے اشارے مزہ دیتے تھے۔ اگر ان فصیحوں کے کلاموں کو کوئی نہ سمجھتا تو وہ کب کہتے۔

چاہِ بیژن۔ کے خسرو کے عہد میں بیژن ایک نامی پہلوان نوجوان۔ عالی خاندان تھا۔ وہ گودرز یعنی کاوہ کے پوتے کا پوتا۔ گیو کا بیٹا اور رستم کا بھانجا تھا۔ بادشاہ کے دربار میں سرحدِ ایران کے لوگ فریادی آئے کہ ہمارے علاقہ میں جنگلی سُور کوہ دشت سے آگئے۔ کھیتوں کو برباد اور لوگوں کو مار مار کر فنا کیے دیتے ہیں۔ کیخسرو نے حکم دیا کہ ایک پہلوان کچھ فوج لے جائے اور انھیں فنا کر دے۔ بیژن نے بڑھ کر اجازت چاہی ؎۔ فدوی اکیلا کافی ہے۔ حکم ہوا کہ من چلا بہادر ابھی نوجوان ہے۔ گرگین پہلوان پرانا سپاہی اس کے ساتھ جائے۔ دونوں گئے۔ صحرائی لوگ بھی ساتھ ہوئے اور سُوروں کو مارنا شروع کر دیا۔ نوجوان بہادر مارتا مارتا افراسیاب کے ملک میں جا پہنچا۔ وہاں ایک شاداب گلزار تھا کہ افراسیاب کی بیٹی مُنیزہ اپنی سہیلیوں کو لے کر آیا کرتی تھی اور بہار کی خوبی اور صحرا کی سرسبزی سے دل خوش کرتی تھی۔ ان دنوں وہ آئی ہوئی تھی۔ نوجوان نے اس عالم پرستان کو دیکھا۔ اس نے اسے دیکھا۔ دونوں کے دل پھنس گئے۔ کئی دن وہاں رہے۔ جب منیزہ گھر جانے لگی تو بیژن کو چھپا کر ساتھ لے گئی اور محلوں میں چھپا رکھا۔ افراسیاب کو خبر ہو گئی۔ آگ ببولا ہو گیا۔ بیژن کو پکڑ کر سیہ چاہ میں قید کر دیا۔

بیژن کا اس طرح پھنسنا سہل بات نہ تھی۔ ایران میں خبر پہنچی۔ رستم دربار میں طلب ہوا۔ مصلحت کے بعد ایک سوداگری کا کاروان باندھا۔ رستم کارواں سالار بنے۔ بہت سے پہلوانوں کو سامانِ جنگ سمیت صندوقوں میں چھپایا۔ بہتوں کو ساربان بنایا اور دارالخلافہ توران پہنچے۔ دن کو مقام کیا۔ سارے حالات معلوم کیے۔ رات کو اپنے پہلوانوں سمیت پہلے سیہ چاہ پر

پہنچے۔ بیژن کو نکالا۔ پھر افراسیاب کے محلوں پر پہنچے۔ غافل بے خبر پڑے سوتے تھے۔ پہلوان کمندیں ڈال قلعہ میں کود پڑے۔ جن کی قضا تھی مارے گئے۔ باقی اٹھ اٹھ کر بھاگ گئے۔ یہ اپنے صندوق لوٹ کے مالوں اور خزانوں سے بھر، منیژہ کو لے ایران میں داخل ہوئے۔

اسی قصہ کا اشارہ کیا ہے خاقانی نے :

چو بیژن داری اندر چہ مخسپ افراسیاب آسا   کہ رستم در کمین است و نہنگے زیر خفتانش

چاہ رستم۔ شغاد رستم کے بھائی نے بھائی کی ناموری کے رشک سے ایک شب اس کی دعوت کی اور رستے میں کئی کنوئیں کھود کر اوپر گھاس بچھا دی۔ اندر برچھیاں تلواریں خنجر وغیرہ کھڑے کر دیے۔ رستم رات کو بے خبر گیا۔ رخش سمیت کنوئیں میں گر پڑا۔ بے نظیر گھوڑے نے ہمّت کر کے جست کی تو دوسرے کنوئیں میں جا پڑا۔ پھر جست کی تو اور کوئیں میں تھا۔ آخر کہاں تک۔ رہ گیا اور بھائی کی بے مہری سے بھائی کی جان گئی۔

سیمرغ۔ سام رستم کا دادا تھا اور زال رستم کا باپ تھا۔ جب سام کے گھر میں زال پیدا ہوا تو اس کے تمام بدن پر سفید بال تھے۔ دائی نے پہلوان جہاں کو خبر کی۔ وہ پہلوان نامی پشت در پشت مملکت ایران کا حامی اسے بدنامی کا سبب سمجھا۔ کچھ غمگین ہوا کچھ شرمندہ ہوا اور بچّہ کو چپ چپاتے دامنِ کوہ میں رکھوا دیا۔ وہاں سے کوئی کہتا ہے کہ ایک سیمرغ نے بچّے دیے تھے وہ اٹھا لے گیا کہ انھیں چوگا دے۔ اس کے دل میں خدا نے رحم ڈالا اور بچّوں کے ساتھ پرورش کیا۔ جب وہ بڑا ہوا تو سام نے خواب میں دیکھا کہ بیٹا جوان ہوا اور یکہ پہلوان ہوا۔ فلاں مقام پر موجود ہے۔ چنانچہ گیا اور لے آیا۔ چلتے ہوئے سیمرغ نے اسے اپنے کئی پَر دیے کہ جب کوئی مشکل پیش آئے تو ایک پَر کو آگ دکھائیو میں فوراً آکر مدد کروں گا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا رہا۔

بعض کا قول ہے کہ سیمرغ ایک زاہد پرہیزگار بزرگ دُنیا کو چھوڑ کر اس پہاڑ میں رہتا تھا اس نے زال کو پالا تھا۔ وہی ہر ایک موقع پر اس کی مدد کیا کرتا تھا۔

سیاوش۔ کاؤس بادشاہ ایران کے محل میں ایک بچّہ پیدا ہوا۔ نجومیوں نے زائچہ کو دیکھ کر کہا کہ یہ لڑکا منحوس ہے۔ رستم دربار میں حاضر تھا۔ وہ اقبال کا پہلوان نحوست کو کب مانتا تھا۔ اس نے بادشاہ سے مانگ لیا اور سیستان میں جا کر پرورش اور تربیت کیا۔ جب بڑا ہوا تو ایک دن دربار میں آیا اُسے بھی ساتھ لایا۔ بادشاہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ خون نے جوش مارا اور کہا کہ ہمارے پاس رہا کرے۔ کاؤس کی ایک چہیتی بی بی اس پر عاشق ہو گئی اور در پردہ پیغام کیا۔ سیاوش

نے انکار کیا۔ وہ دشمن ہو گئی اور کاؤس سے الٹی چغلی کھائی۔ وہ بھی رستم کا پالا ہوا تھا۔ گفتگو نے طول کھینچا۔ آخر آگ بھڑکائی گئی۔ سیاوش اپنے سچ کے دعوے پر اس میں گیا اور بال بال سلامت نکل آیا۔

خونِ سیاوش۔ سیاوش باپ کی طرف سے دل شکستہ رہتا تھا۔ افراسیاب نے پیغام سلام بھیج کر اسے اپنی دامادی اور ملک کی بادشاہی پر للچا کر بلایا۔ وہ توران میں چلا گیا۔ بدعہد افراسیاب نے چند روز کے بعد بیٹے کے اغوا سے داماد کو مروا ڈالا۔ رستم انتقام کا لشکر تیار کر کے پہنچا۔ افراسیاب کو شکست دی۔ ملک کو لوٹا مارا اور کیخسرو سیاوش کے بیٹے کو لے آیا۔ خونِ سیاوش یعنی خونِ بے گناہ اسی قصّے کا اشارہ ہوتا ہے۔ جہاں اس کا خون گرا تھا وہاں ایک قسم کی گھاس اُگی کہ قدرت خدا سے اکثر امراض کی دوا ہے۔ اس کا نام پرسیاوشاں ہے اور شبرنگ سیاوش کا گھوڑا۔

شیریں و فرہاد کی سرگزشت کے مختلف اشارے۔ کوہِ بے ستون کا تراشنا۔ قصرِ شیریں کا بنانا۔ جوئے شیر کا لانا۔ کوہکن کا لقب پانا۔ بڑھیا کے فریب سے سر پھوڑ کر مر جانا۔

اسی میں خسرو پرویز۔ اُس کا باربد ماہر موسیقی۔ زردست افشار۔ سات خزانے۔ ان کے بہم پہنچنے کا جدا جدا افسانا۔ شیریں کا گھوڑا گلگوں۔

نوشیروان کا عدل۔ مداین میں اس کا ایوانِ عدالت۔ اُس میں بڑھیا کے جھونپڑے کی رعایت رکھنی اور ایوانِ شاہی کی ناموزونی گوارا کرنی، وغیرہ وغیرہ ہیں کہ انشاپردازی کے قلم سے جابجا تاریخ کے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر ایک کے لیے نثر کے فقرے یا نظم کے شعر لکھوں تو کلام بے لطف ہو جاتا ہے۔

(9) برہمنوں کی جگہ ان کے ہاں موبد اور دستور ہوتے تھے۔ علم و فضل کی آگاہی اور نیکی و پرہیزگاری کے سبب سے بادشاہ، امیر غریب سب ان کی عظمت کرتے تھے۔ شادی غمی اور گھروں کے بڑے بڑے معاملات بغیر ان کے سرانجام نہ ہوتے تھے۔ ان کا چرن امرت آنکھوں سے لگاتے تھے کہ نجات ہو۔ پیتے تھے کہ برکت اور شفا ہو۔ انشائے فارس اس رسم کا پتہ بتاتی ہے۔ فردوسی ایسے موقع پر ضرور موبد کو لاتا ہے۔ موبدِ پاک۔ نیکو نہاد۔ نیکو سرشت ان کی صفت واقع ہوتی ہے۔

(10) وہ لوگ جنتر یا منتر یا طلسموں کی برکت سے مقدسان آسمانی کا فیض حاصل کر لیتے تھے اور نحوستوں اور بلاؤں سے محفوظ رہتے تھے :

به بازوے رستم یکے مہرہ بود — کہ آں مہرہ اندر جہاں شہرہ بود
بدو داد و گفتش کہ ایں را بدار — اگر دختر آرد ترا روزگار
بگیرد بگیسوے او بر بدوز — به نیک اختری فال نیکو فروز
در ایدوں کہ آید ز اختر پسر — به بندش به بازو نشانِ پدر
به بالاے سام نریماں بود — به مردی و خوے کریماں بود

اور شاعر کہتا ہے :

نقشے کہ برزر است ندانی کہ سرسری ست — ایں گرد نامہ ایست کہ پیدا کند پری

اسی علاقہ کی سرزمین سے مجھے چند دانے نگینوں کے ملے جن پر کچھ کچھ گھسے پسے نقش موجود ہیں۔ وہ طلسم معلوم ہوتے ہیں اور ان کی وضع اور تراش سے، اور ان میں جو سوراخ ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈورا ڈال کر گلے میں پہنتے تھے یا بازوؤں پر باندھتے تھے۔

(11) شگون کو مانتے تھے اور غور کرو تو اتنی ہی بات کافی ہے کہ سعادت و نحوست کے خیالات پہلے تھے جب شگون کا لفظ زبان میں پیدا ہوا اور نہ لفظ کہاں سے ہوتا اور دیکھو! اس میں بھی دونوں قومیں متفق ہیں۔ شگن शकुन سنسکرت ہے۔

مبارک آدمی کا منہ صبح کو دیکھتے تھے تو سمجھتے تھے کہ آج تمام دن خوشی سے گزرے گا۔ منحوس نظر آئے تو دن بھر نحوست۔ سعدی اپنی شاعری میں خبر دیتے ہیں :

خورم آں فرخندہ طالع را کہ چشم — افتدش بر روے تو ہر بامداد
ہر کس بہ تمنائے فال از رخِ او گیرد — بر تختۂ فیروزی تا قرعہ کرا باشد

یہی شگون نیا چاند دیکھ کر اور نئے سال پر بھی سمجھتے تھے۔ نظامی :

به فرخندگی فال زن سال و ماه — کہ فرخ بود سال فرخندہ ماہ

ہمیشہ نیک کلام زبان سے نکالتے تھے اور اس کا نیک اثر سمجھتے تھے۔ خلاف اس کے برخلاف۔ نظامی :

مبارک بود فالِ فرخ زدن — نہ بر رخ زدن بلکہ شہ رخ زدن
مزن فالِ بد کا ورد حال بد — مبادا کسے کو زند فال بد

انسان کے یا گھوڑے وغیرہ کے آنے یا خریدنے سے بھی نیک و بد شگون نکالتے تھے۔ جب کسی زبان کی انشاپردازی نے فرخ پے۔ فرخندہ پے۔ وغیرہ وغیرہ محاورے لکھے۔ سمجھنے والا فوراً سمجھ

گیاکہ قوم کا یہ خیال تھا۔

چہ میدانی اے خضر فرخندہ پے   کہ از مے مرا ہست مقصود مے

ان کی انشاپردازی خبر دیتی ہے کہ عام باتوں کو بھی نیک اور مبارک لفظوں میں ادا کرتے تھے۔ چنانچہ نحس قدم کو 'سبز قدم' کہتے تھے۔ چراغ اور شمع کے بجھنے اور بجھانے کے لیے 'مُردن' اور 'کشتن' کا لفظ ہے۔ فصیحِ فارس اپنے محاورہ میں کہتا ہے۔ قدرے روغن در چراغ کن کہ گل میشود۔ شمع راز یر دامن بگیر کہ خاموش نشود۔ چراغ گل کنید۔ شمع گل کنید۔ دروازہ بند کرنا ہو تو کہتے ہیں۔ معمور کنید۔ کوئی چیز ہو چکے تو کہیں گے برکت شد، جلسہ میں کسی کا ذکر آئے اور وہ موجود نہ ہو تو کہیں گے۔ احمد کہ جائش سبز است بمن گفتہ بود۔ یا۔ احمد کہ یادش بخیر باد بمن خبر دادہ بود۔ وغیرہ۔ کسی کے جواب میں انکار کرنا ہو تو 'نہیں' نہ کہیں گے مثلاً ایک شخص صبح کو تمھارے گھر آیا۔ تم نے پوچھا۔ ناشتہ کردید؟ وہ کہتا ہے۔ قبلہ خیر (ناشتہ نہیں کیا)۔

ہُما۔ دونوں قومیں اس خیال میں متفق تھیں کہ جس کے سر پر 'ہُما' کا سایہ پڑے وہ بادشاہ ہوتا ہے۔ اسی واسطے اس کے پَر تاجِ شاہی میں لگاتے تھے۔

ہمائے اوجِ سعادت بدام ما اُفتد   اگر ترا گزرے بر مقام ما اُفتد

ہمایوں کو جب بمعنی مبارک دیکھے گا تو صاحبِ نظر سمجھے گا کہ 'ہما' میں کوئی برکت ضرور ہے۔

ہمایوں منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد
مبارک کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

اُلّو۔ کوّے۔ چیل کو وہ بھی منحوس سمجھتے تھے۔ اسی سے ہے زاغ دل = سیاہ دل۔

سعدی:

ماری تو کہ ہر کجا بہ بینی بزنی   یا بوم کہ ہر کجا نشینی بکنی

خسرو:

زاغ دلاں را قفس شوم دہ   مغز غلیو از و سر بوم دہ

آب بر آئینہ ریختن۔ عہدِ قدیم میں دستور تھا کہ جب کوئی سفر کو جاتا تھا تو رشتہ دار یا دوست آشنا اُس کے پیچھے آئینے پر ایک سبز پتا رکھ کر پانی ڈالتے تھے اور پانی کو بہنے

اور پتے کو بہانے سے یہ مراد تھی کہ وہ بھی اسی طرح جلد منہ دکھائے۔ ہندوستان میں پان۔ رکھتے ہیں۔

دیدہ را تر کنم از اشک چو رفتی ز برم　　　　در قفائے سفری آب بر آئینہ زنند

سبز اور سرخ رنگ کو اچھا اور مبارک سمجھتے تھے۔ سیاہ کو منحوس اور ماتمی۔ چنانچہ 'سیاہ گلیم' سے بدبخت و بے دولت مراد ہے۔ 'سیہ سال' = قحط سال۔ 'سیہ کاسہ' = مفلس منحوس۔ 'سیہ پستان' = جس عورت کا بچہ نہ جیے۔ 'سیہ پوش' = ماتمی۔

فال شانہ۔ ولایتیوں کے دستر خوانوں پر اکثر دیکھا گیا کہ پلاؤ کی قابوں میں جب شانہ کی ہڈی ثابت نکل آتی ہے تو بعض اشخاص اب تک استخوان مذکور کو ورق کتاب کی طرح دیکھتے ہیں اور آئندہ یا غائب کی خبر دیتے ہیں۔ اسی کو 'فال شانہ' یا 'شانہ بینی' کہتے ہیں۔

جب اکبر نے گجرات پر یلغار کی تو رستہ میں ایک مقام پر کھانا کھانے کو اتر پڑے۔ ہمراہی ادھر اُدھر پھرنے لگے۔ ایک ہرن نظر آیا۔ اکبر نے ایک چیتا اس پر چھوڑا اور کہا کہ شگون لیتے ہیں، اگر چیتے نے مار لیا تو جانو کہ ہم نے غنیم کو مارا۔ ہرن نکل گیا تو سمجھو کہ وہ بھی نکل جائے گا۔ چیتے نے دو ہی جستوں میں شکار مار لیا۔ دستر خوان پر بیٹھے تو ایک ہزارہ حاضر تھا (اس قوم میں اکثر اشخاص کو شانہ بینی میں خوب نظر ہوتی ہے) کسی قاب میں شانہ کی ہڈی نکلی۔ ایک امیر بولا کہ مُلاّ! دیکھو اس یلغار کا انجام کس کی فتح پر ہے۔ اس نے بغور دیکھا اور کہا کہ فتح ہماری ہے مگر ایک سردار ہمارا کام آئے گا۔ چنانچہ فتح ہوئی اور یوسف خاں اکبر کا کوکلتاش مارا گیا۔ صائب نے اس مضمون کو عجب لطف سے باندھا ہے اور بنیاد اس کی فقط لفظ شانہ پر رکھی ہے کہ فارسی میں کنگھی کو بھی کہتے ہیں اور ایران میں اکثر چوب شمشاد کی کنگھیاں بنایا کرتے ہیں :

خواہد فتاد دامنِ زلفش بدست ما　　　　ایں فال راز شانۂ شمشاد دیدہ ایم

خواب کے نتیجوں پر اعتبار کرتے تھے۔ دیکھ لو انشا پردازی میں بھی ہزاروں مضامین نظم و نثر میں ہیں جو کہ اس خواب پریشاں کی تعبیر دیتے ہیں۔

پری۔ جن۔ بھوت وغیرہ کو مانتے تھے۔ ان کی انشا پردازی کو تم بھی دیکھتے ہو۔ تمام پرستان ہے آباد ہے اور بیابان غولوں سے۔

چوٹی سر پر چوٹی ضرور رکھتے ہوں گے۔ کیونکہ کتابوں میں اس کے لیے لفظ چتر موجود ہے اور اکثر اہلِ ایران اب تک رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نزلہ کو مفید ہے۔ اب کاکُل کہتے ہیں۔

مملکتِ مذکور میں بادشاہ کی تعظیم، خدائی تعظیم تھی۔ جس طرح وہ مرتبہ اور حکومت میں سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ اسی طرح نیک نیتی اور نیکوکاری میں بھی سب سے افضل ہوتا تھا۔ وہ گالی سے زبان آشنا نہ کرتا تھا۔ فاحشہ، مسخرے، دیوانے صحبت میں نہ جاسکتے تھے۔ جو ایسے اوصاف نہ رکھتا ہو وہ بادشاہ نہ ہوتا تھا۔ اگر اتفاقاً ہو جائے تو معزول ہو جاتا تھا۔ بادشاہ اپنا ولیعہد جس بیٹے کو چاہتا تھا آپ کر دیتا تھا اور چونکہ آئینِ فرہنگ کے بموجب ہوتا تھا، اس لیے اگر دوسرے بیٹے کو اس کا حکم ناگوار ہو تو اپنی بدنفسی سمجھ کر خود دل میں شرمندہ ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک شاہزادے نے خواب میں دیکھا کہ باپ نے میرے بھائی کو بادشاہ کر دیا ہے اور اس عالم میں مجھے یہ امر ناگوار ہوا ہے۔ اٹھ کر آپ اپنے تئیں مار ڈالا۔

یہی عظمتیں خاص و عام کی آنکھوں میں سمائی تھیں اور محبتیں دلوں پر چھائی تھیں کہ ملک کی زبان نے اکثر بڑائی اور تعریف کے خیالات کو لفظِ شاہ سے ترکیب دے کر مضمونوں کی شان بڑھائی ہے، جو اَور زبانوں میں نہیں ہے۔ مثلاً شہ رگ، شاہ راہ۔ شہسوار۔ شاہ مرکب۔ شہباز۔ شاہین۔ شاہ بیت۔ شاہ کاسہ۔ شہتیر۔ شاہ بز۔ شاہ دارد۔ خسروانی وغیرہ بیسیوں لفظ ہیں کہ اب عام محاورے ہو گئے ہیں۔

اہلِ دربار یار عایا اپنے بادشاہ کا نام بڑی تعظیم سے لیتے تھے۔ سلطنت کی یہ عظمت تھی کہ اس کی قسم کھاتے تھے۔ تم نے ابھی سنا سہراب نے تاج و تخت کی قسم کھائی۔ بادشاہ کے نام پر کوئی جھوٹی قسم کھاتا تو اس سے ملنا چھوڑ دیتے تھے (یہ بھی وہی اشارہ ہے کہ برادری کا باہر۔ حقّہ پانی بند)۔ کوئی شخص بادشاہ کی طرف سے آتا یا سفر میں جاتا ہوا کسی کے گھر میں اترتا تو اس کے پانْو کا دُھووَن لے کر تبرّک کی طرح رکھتے اور خدمت گاروں کی طرح کام کو حاضر رہتے۔

ننگ و ناموس رعایا کی بڑی رعایت تھی۔ کیونکہ شاہ ان کا حقیقی باپ اور سلطنت ماں۔ آئینِ مہ آباد میں بڑی تاکید تھی کہ رعایا آرام سے رہے۔ اسے کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ انشاپردازوں کی تحریریں اس پر محضرِ شہادت ہیں۔ خصوصاً شیخ سعدی کی تصنیفات :

میازار عامی بہ یک خردلہ　　　کہ سلطاں شبانست و عامی گلہ
چو پرخاش بینند و بیداد ازو　　　شباں نیست گرگ است فریاد ازو

ایک اور جگہ کہا ہے :

نہ آں شوکت و پادشاہی بماند　　　نہ آں ظلم بر روستائی بماند

جب نوشیرواں مالگزاری کے آئین باندھ چکا تو بابک کو بلایا کہ لشکر کی موجودات اس کا ذمہ تھا، اس سے کہا۔ چاہتا ہوں کہ ملک سے جو خراج وصول ہوتا ہے بیکار نہ جائے۔ فوج میں ایک آدمی ہزار درم۔ ایک سو درم کے لائق ہے۔ ایک ہوتا ہے کہ تیر جوڑنا بھی نہیں جانتا اور تیر اندازوں کی تنخواہ لے جاتا ہے۔ ایک تلوار کا ہاتھ نہیں مار سکتا اور تلواریوں کی تنخواہ لیتا ہے۔ ایک کے پاس ہتھیار ہی نہیں اور پورے سپاہیوں کی تنخواہ پاتا ہے۔ یہ مجھ پر ظلم ہے۔ میں سپاہی اور رعیت پر ظلم نہیں کرتا۔ چاہیے کہ وہ بھی مجھ پر ظلم نہ کریں۔ یہ کام تیرے حوالے کرتا ہوں اور مملکت کا خزانہ سپرد کر کے پورا اختیار دیتا ہوں۔ اپنے قلعہ کے آگے میدان میں تیرے لیے نشیمن بنواتا ہوں۔ وہاں بیٹھ اور فوج کی موجودات لے۔ ہر شخص کا حلیہ اور نام اور پتہ قلم بند کر۔ چنانچہ ہر سپاہی کے لیے زرہ، جوشن، کمند، خود، دستانے، چاہئیں۔ زین، رکاب، برگستوان سب درست ہوں۔ زین کے آگے ترکش تیروں سے بھرا ہوا، بائیں ہاتھ پر قربان جس میں دو کمانیں زہ کی ہوئی اور دو زہ زیادہ لچھائی ہوئی، کندھے پر آویزاں رہیں کہ کمان کی ایک زہ بگڑ جائے تو اپاہج نہ رہ جائے۔ جس سپاہی کے پاس سب سامان درست ہو، لکھ لے۔ جس دن ان میں سے کوئی چیز کم ہو، درم کاٹ لے اور جس کے پاس سب چیزیں موجود ہوں، اس کی سوار کاری دیکھ، پھر ایک ایک ہتھیار میں اس کی کاروائی دیکھ، جو سب طرح پورا ہو چار ہزار درم سے زیادہ تنخواہ نہ دے۔ پیادوں میں جو سب میں گھٹ کا ہو، اسے سو درم سے کم نہ چاہیے۔

غرض بابک کو سب باتیں سمجھا کر خلعت دیا اور پریٹ پر جگہ مقرر کر کے ہیمدستی[1] مسند کے ساتھ پیشگاہ مقرر کی۔ عملہ انتظام کے لیے دیا اور فوج میں حکم بھیج دیا کہ سب آکر

---

1. مسند وزرا و امرا کو ہیمدستی کہتے ہیں۔

موجودات دیں کہ دفتر میں نام لکھا جائے۔ تیاری کے لیے تین دن کی مہلت دی گئی۔

چوتھے دن بابک پر یٹ پر آکر بیٹھا۔ تمام فوج حاضر ہوئی۔ اس نے سب کو دیکھا اور کہا۔ "جاؤ جسے حاضر ہونا چاہیے تھا وہ نظر نہیں آتا۔" سب چلے گئے۔ نوشیرواں نے سن کر جانا کہ سپہ سالار نہ گیا ہوگا۔ دوسرے دن پھر سب فوج حاضر ہوئی۔ بابک نے دیکھ کر پھر وہی کہہ دیا۔ "جاؤ جسے آنا چاہیے تھا وہ نہیں آیا۔" پھر چلے گئے۔ نوشیرواں نے سنا۔ مگر نہ سمجھا کہ کسے چاہتا ہے۔ تیسرے دن بابک نے چاؤش سے کہا۔ بآواز بلند کہہ دو! "صاحبِ تاج و تخت کو چاہیے کہ حاضر ہو (سب میں بڑا سپاہی وہ ہے۔ اُسے سب سے پہلے نمونہ دکھانا چاہیے) اور موجودات میں نام لکھوائے۔" دوسرے دن نوشیرواں نے خود سر پر رکھا۔ سب ہتھیار سجے اور اسی طرح سوار ہو کر میدان میں آیا۔ بابک نے جب اسے دیکھا تو کہا۔ "اے بادشاہ مجھ سے تو تیرے کام میں بھی کمی نہیں دیکھی جاتی۔" نوشیرواں نے اپنے اوپر خیال کیا، دیکھا کہ دوزہیں کمان کی بھول گیا۔ اسی وقت منگا کر پیچھے لٹکائیں اور موجودات دی۔

غرض ایک ایک سپاہی بابک کے سامنے سے گزر گیا۔ جب موجودات ہو چکی تو بولا کہ "اے بادشاہ! تو صاحبِ تخت و تاج ہے تیری تنخواہ اوروں سے کچھ زیادہ ہونی چاہیے۔" نوشیرواں نے کہا "تجھے اختیار ہے۔" بابک نے اس کے لیے چار ہزار ایک درم لکھے۔ دوسرے دن دربار میں آکر کہا کہ حضور کے لیے میں نے ایک ہی درم زیادہ لکھا ہے کہ اَوروں کو ترقی مانگنے کا موقع نہ ہو۔ نوشیرواں نے کہا کہ میں تیری نصیحت سمجھا اور حق تیرا مانا جو مصلحت کے لیے مجھ پر سختی کرے، میں اس کی برداشت کروں گا۔ چنانچہ خلعت دیا اور عزّت سے رکھا۔ (یہی باربک ہے جس کا مخفف بابک کتابوں میں لکھا ہے)۔

وزیر وہ شخص ہوتا تھا جو سب سے بڑا مہندس ہو۔ اس سے کم اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ ہر شہر میں ایک اندازہ گیر (مہندس) اور ایک ارشیا[1] (محاسب) وزیر ہوتا تھا۔ اسے رعایا زرِ مالیہ دیتی تھی۔ اس کے نیچے اور اہلکار ہوتے تھے۔ ہر قصبہ اور قریہ میں ایک ایک دستور رہتا تھا۔ وہاں کے مالیات کے کام اسی کے متعلق تھے۔

وزیر کے ماتحت دو استوار (امین) ہوتے تھے۔ دو شُدَہ بَند (وقائع نویس) ہوتے

---

1 اَرشیا۔ ارتھیا کا مبدل ہے۔

تھے اور بہت سے تُوند رَوَند[1] (خبر رساں) اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ سامان سالار (میر س۔ ں)۔ خبر کار (داروغہ)۔ اپنے اپنے کام سرانجام کرتے تھے۔ فوج میں لاکھ پر ایک سپہبد۔ ان سے نیچے کئی کئی سر ہزار کے سردار۔ پھر سیکڑوں پر سردار۔ پھر دَہاکوں پر سردار۔ پھر 5 5۔ 4 4 کے افسر۔ 10 کا افسر سالار۔ 100 کا سپہدار کہ ہندوستان میں بخشی اور ایران میں (کئی سو برس گزرے) لشکر نویس کہلاتا تھا۔ بادشاہ کے پاس بار نگار (چوکی نویس) دن رات حاضر رہتا تھا کہ دم دم کا حال لکھتا رہتا تھا۔ 4 4 آدمی کی چوکی ہوتی تھی۔ دو دو آدمی ایک ایک پہر جاگتے تھے۔ دو دو سوتے تھے۔ شدہ بند (واقعہ نویس) دار الخلافہ کے گھر گھر کا حال بادشاہ کو برابر پہنچاتے تھے اور ہر شہر کا شدہ بند اپنا اپنا فرض برابر ادا کرتا رہتا تھا۔

ہر شہر میں فرہنگ روز (کوتوال) ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ تین واقعہ نویس اور امین رہتے تھے۔ ہر لشکر میں ہر شہر کے حاکم کے پاس بھی واقعہ نویس اور امین رہتے تھے۔ جو صاحب خدمت اپنی خدمت میں کوتاہی کرتا فوراً بادشاہ کو خبر پہنچتی تھی اور کوتاہی کی سزا ملتی تھی۔ جاسوس اگر اپنی یہ خدمت لوگوں کو جتادے تو موقوف ہو جاتا تھا۔ بادشاہی خیر خواہی کرکے جو کسی کا حق رکھ لے تو سزا پاتا تھا۔ جب پیادہ یا سوار نوکر ہو تو اس کا اور گھوڑے کا چہرہ لکھا جاتا تھا۔ گھوڑا اکثر بادشاہی ہوتا تھا۔ گھوڑا مر جاتا تا عاملوں۔ سواروں اور لوگوں کی گواہیوں سے اُور ملتا تھا۔ رعیّت سے مالیہ $\frac{1}{20}$ لیتے تھے۔ جب ساسانیوں کی سلطنت نئی قائم ہوئی تو رعیّت نے امداد کے لیے خوددہ یکی قبول کی۔ اسی لیے اسے باج ہمداستانی کہتے تھے۔

آئین مہ آباد کے فتویٰ بغیر بادشاہ کو بھی قتل کا اختیار نہ تھا۔ فرہنگ دار (قاضی) اور دادستاں (مفتی) سے فتویٰ لیا جاتا تھا۔ امرا اور شہزادے پاس ہوں یا دور، بے حکم بادشاہ قتل نہ کرسکتے تھے۔ ہاں کوئی ایسا سرکش ہو کہ اگر فوراً نہ مار ڈالیں تو فساد اٹھا کھڑا ہو۔ اس کے قتل میں دربار کے حکم کا انتظار نہ کرتے تھے۔ بادشاہ کی نیک نیتی کی حکومت اور لوگوں کی صدق دلی کی اطاعت اس درجہ کو پہنچی تھی کہ اگر حکم ہوتا تو ایک آدمی جاتا اور سپہبد کا سر اُتار لاتا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا اور سرداروں نے آپ سر جھکا جھکا کر گردنیں کٹوادیں۔ چونکہ یہ بھی دستور تھا کہ

---

1 اسی کا بگڑ کر رونا رہ گیا ہے۔

باپ کے بعد بیٹا اس کی جگہ پاتا تھا اس لیے بادشاہ ان کی اس اطاعت سے خوش ہوا۔ سب نے سراہا اور بیٹے نے باپ کا عہدہ پایا۔ رعایا بھی ایسی جاں نثار تھی کہ بادشاہ کے حکم کو حکمِ الٰہی سمجھتی تھی۔ اس کی خوشی میں مر جانا بہشت میں جانا تھا اور اسی کو زندگی سمجھتی تھی۔ یہ اعتقاد و اطاعت بادشاہ کی یا تو چنگیز خاں کو اپنی قوم مغول پر نصیب ہوئی یا شاہ اسماعیل کو قزلباش پر ہوئی۔ ہر قسم کی سزا قاضی کے فتوے سے ملتی تھی۔ بید اور کوڑے بھی لگتے تھے۔ مگر اشراف کو پاجی سے نہ پٹواتے تھے، جب تک کئی جاسوسوں کی خبر مطابق نہ ہوتی تھی تب تک اس پر عمل نہ کرتے تھے۔ شہزادوں کی بھی ہش (حاضری) اور باش (غیر حاضری) ہوتی تھی، تاکہ غریب نوکروں کی ضرورتوں کی قدر معلوم ہوتی رہے۔ حضور میں بلائے جاتے تو سپاہی جاتا اور پیادہ لے کر آتا کہ پیدل چلنے کی قدر معلوم رہے۔

ایک ایک علاقہ ایک ایک تعلقہ دار کو سپرد تھا۔ اس کے نیچے کئی کئی گاؤں کے علاقہ دار۔ ان کے نیچے ذیلدار۔ ان کے نیچے لمبردار وغیرہ وغیرہ۔ حکم تھا کہ زمیندار سے اتنا ہی روپیہ وصول کرو جتنی اسے گنجائش ہو۔ رعایا پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ اتنا لو کہ وہ آرام سے رہیں۔ تمھاری عدالتوں کے خرچ نکل آئیں اور فوج آسودہ رہے۔ زمیندار اپنے کام سے گرتا تو دستگیری کرتے تھے۔ مر جائے تو اس کی اولاد کو سنبھالتے تھے۔

لڑائی پیش آتی تو تعلقہ داروں کو حکم پہنچتا۔ ہر شخص اپنی حیثیت اور قاعدہ کے بموجب فوج لے کر حاضر ہوتا۔ چونکہ ہر شخص ملک کا حمایت دار تھا اور سب اپنے اپنے علاقوں پر جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے۔ اس لیے سب شکار کے شوقین اور مشاق ہوتے تھے۔ یہ ضرورتیں ہر شخص کو سپاہی بناتی تھیں اور سامان سپاہگری تیار رکھتی تھیں۔

سفر میں ہر شخص کے پاس کل ہتھیار، کل ضروری چیزیں، گھوڑے کے نعل بلکہ درفش اور سوئی تک بھی ہوتی تھی۔ باوجود اس کے تکلیفوں کے مشاق۔ تھوڑے سامان کے ساتھ دُور دُور کے رستے کاٹتے تھے۔ خیمے ڈیرے کی پروا نہ کرتے تھے۔ سخت گرمی، سخت جاڑا، برف باران سب سر پر لیتے تھے۔ فارس کی انشا پردازی اس امر سے آگاہ کرتی ہے۔

سالار اور سردار سپاہ بڑے زرق برق سے رہتے تھے۔ تاجِ خسروی تو خاص بادشاہ کے لیے تھا۔ امرا کے سر پر بھی خاص خاص وضع کے تاج ہوتے تھے اور ہزاروں لاکھوں روپے کے جواہرات سے مرصّع ہوتے تھے۔ زرّین کلاہ، زرّین پٹکا، زرّین کفش، زرّبن زین امیر الامرا کی

وردی تھی۔ ان میں بھی درجوں کا لحاظ تھا۔ بعض طلائی، بعض ملمع، بعض چاندی کے۔
انشاپردازی ان سب باتوں کی خبر دیتی ہے۔ فردوسی

تہمتن بہ توسن چو آزادہ سرو — بہ سر بر کلہ ہمچو بالِ تدرو

(اور موقع پر)

چو شاہِ سمنگاں چنیں دید باز — بخشید او را ز ہر گونہ ساز

(اور موقع پر)

ز تاج و ز تخت و کلاہ و کمر — ز اسپ و ز اشتر ز زرّ و گہر

(ایک موقع پر)

تہمتن بیامد بہ نزدیک شاہ — میاں بستہ زرم و دل کینہ خواہ

(ایک موقع پر)

بیا در سپاہ و در فش مرا — ہماں تخت و زرینہ کفش مرا

خواجہ حافظ نے بھی اشارہ کیا ہے :

تکیہ بر اختر شب گرد مکن کیں عیار — تاج کاؤس ربود و کمر کیخسرو

(سعدی شیرازی)

بسر چاوشاں دید و تیغ و کمر — قباہاے اطلس کمر ہاے زر

(اور موقع پر)

یکے بر سرش خسروانی کلاہ — یکے در برش پر نیانی قباہ

میدانِ جنگ میں جب تک بادشاہ یا اُس کا قائم مقام کھڑا رہتا۔ سپاہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتی۔ اگر کوئی بھاگتا تو اُس کا کھانا پانی، رشتہ داری بند کر دیتے جو اُس سے ملتا وہ بھی ویسا ہی خوار و ذلیل ہو جاتا۔

کوئی عہدہ دار مر جاتا تو اس کے بعد بیٹے کو ورنہ اس کے قریبی رشتہ دار کو اُس کی جگہ دیتے۔ بے گناہ کسی کو موقوف نہ کرتے تھے۔ اسی سے شریف عہدہ داروں کی نسلیں صدہا سال تک برابر درباروں میں قائم چلی جاتی تھیں جن پر جاں نثاری کے واقعی بھروسے کیے جاتے تھے۔ امیر زادہ نا قابل ہوتا تو عہدہ سے موقوف کر دیتے تھے۔

جس گھوڑے، گدھے، گائے، بیل سے خدمت لیتے بڑھاپے میں اسے آرام سے

بٹھاتے اور کھلاتے تھے۔ جانوروں پر لادنے کے وزن مقرر تھے۔ اس سے زیادہ لادے تو سزا پائے۔ اسی قانون کی بنیاد باقی ہے کہ اس سے اور بیگار وغیرہ سے فارس کے ناصح انشاپرداز عمدہ مضامین پیدا کرتے ہیں۔ خصوصاً شیخ سعدی کہ اس قانون کی پابندی میں کہیں بادشاہ کو شوق دلاتے ہیں۔ کہیں دھمکاتے ہیں :

دلِ بادشاہاں شود بار کش　　　چو بینند در گل خرِ خار کش

سپاہی زخمی ہوتا تو بڑی کوشش سے اس کی تیمارداری کرتے۔ کمزور یا بڈھا ہو جاتا تو بیٹے کو اس کی جگہ دیتے تھے۔ بچہ ابھی نوکری کے قابل نہ ہوتا تو خزانہ سے وظیفہ پاتا۔ کچھ نہ ہوتا تو بڈھا پنشن پاتا۔ مر جاتا تو جورو بیٹا بیٹی جو بچتا بادشاہ اس کے ساتھ وہ سلوک کرتا جو باپ بچّوں کے ساتھ کرتا ہے۔

سپاہی مارا جاتا تو بیٹا عزت کا عہدہ پاتا۔ اس کے پس ماندوں کے ساتھ رعایت کرتے تھے۔ لڑائی میں گھوڑا گرتا تو اُس سے اچھا سرکار سے ملتا۔

سوداگر اپنے کام سے گرتا تو اس کی مدد کرتے تھے۔ مر جاتا تو اس کی اولاد کو سنبھالتے تھے۔ ہر فرقے کو اس کا کام سکھاتے تھے۔ عملداری میں کوئی مفلس نظر نہ آتا تھا۔ جو پردیسی شہر میں داخل ہوتا حاکم کو خبر کرتے۔ وہ اس کی حیثیت کو دیکھتا اور گزارہ کی فکر کرتا تھا۔

بیمار اپاہج بیمار خانوں میں داخل ہو جاتے تھے۔ حکیم علاج کرتے۔ خدمت گار تیمارداری کرتے تھے۔ مردوں کے بیمار خانے جدا تھے، عورتوں کے جدا۔ یہی مطالب ہیں جو ظہوری کے ایک مصرع میں بند ہیں۔ ع

شہنشہ تر ہر آں کو مہرباں تر

یعنی بادشاہ کی بڑائی، اس کے ملک کی وسعت اور خزانہ کی بہتات سے نہیں ہوتی۔ جو رعیّت کے حال پر زیادہ شفقت کرے وہی بڑا شہنشاہ ہے۔

سراؤں کی تعمیر اور رستوں کی آبادی کی بڑی تاکید تھی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بہت سفر کرتے تھے اور اس کے فوائد سے کافی حصّے لیتے تھے۔ اگر یہ تاریخی آگاہی نہ ہوتی تو بھی رباط، سرائے، مہمان سرائے، کارواں سرائے، سبک باری، گراں باری وغیرہ کے مضامین و الفاظ اوران کے استعاروں سے زبان مذکور تمھیں خبر دیتی ہے۔ جو اَور زبانیں کم دیتی ہیں :

سبک سار مردم سبک تر روند　　　حق اینست صاحب دلاں بشنوند

ہر کہ سبک بار سبک خیز تر مرغ سبک پر پرد تیز تر

عرب کی زبان یہ سامان نہیں رکھتی اس لیے کہ ملک ریگستان اور جنگل ویران ہے۔ وہاں اس طرح کی تعمیریں اوران کی آبادی ممکن نہیں۔ ہاں ریتیلی زمینیں، پتھریلی زمینیں ٹیلے، پہاڑیاں، حنظل کے درخت، طلح کی چھانو، اُثل کے جھنڈ ہیں۔ وہی اس کے الفاظ واستعارات میں نظر آتے ہیں۔ ہند میں آبادی خوب، مگر سراؤں کی رسم کم تھی۔ یہاں کے مندر ٹھاکردوارے وغیرہ ان کا کام دیتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ زبان مذکور میں ان کے خیالات اور ادائے مطلب کے لیے الفاظ بھی کم ہیں۔

فقیر کو سخت سخت ریاضتیں کرنی پڑتی تھیں۔ اگر حقیقت میں خدا پرست ہوتا تو فقرا کے ساتھ خانقاہوں میں رہتا۔ ورنہ اپنے پیشہ سے لگتا۔ کاہل مفت خور ان میں نبھ نہ سکتا تھا۔

بادشاہ کے مصاحب لیاقت والے نیک نیت لوگ ہوتے تھے۔ اچھی اچھی تاریخیں، سچی داستانیں، مفید افسانے سناتے تھے۔ نجومی، حکیم، طبیب، صاحب انشا، صاحبِ تحریر ہوتے تھے اور یہ لوگ حاکم کے ساتھ ہر شہر میں رہتے تھے کہ رعایا ہمیشہ ان کے محتاج ہیں۔ یہ باکمال اپنے اپنے فن میں کامل ہوتے تھے۔ سپاہی، رعایا، پیشہ ور سب کو پڑھنا لکھنا واجب تھا۔ ایک پیشہ کا آدمی دوسرے پیشہ میں ہاتھ نہ ڈالتا تھا۔ یہ نہ ہو سکتا تھا کہ لشکر کا سپاہی یا سردار ہو اور سوداگری بھی کرے۔ ہر شہر میں اہل علم، پیشہ ور، اہل طرب، تاجر، سپاہی، جس قدر کھپ سکتے تھے اتنے رکھتے تھے۔ باقی کھیتی پر لگادیتے تھے تاکہ ہر شخص تھوڑا تھوڑا سب کچھ جانتا ہو۔ مگر بہت آدمی ایک ہی کام نہ کریں۔ جس کام میں بادشاہی محصول سخت ہوتا اگر کوئی خیر خواہی دکھانے کو اس کی ترقی دکھاتا تو اسے سزا دیتے تھے۔

ہفتہ میں ایک دفعہ دربارِ عام ہوتا تھا۔ ہر مظلوم بادشاہ تک پہنچ سکتا تھا۔ سال بھر میں ایک دفعہ بادشاہ سب کے ساتھ مل کر بیٹھتا اور کھانا کھاتا تھا۔ دو جگہ دربار کرتا تھا۔ ایک 'روزستان' یا 'تابسار' تھا۔ اونچی جگہ پر بیٹھتا تھا۔ پہلوان بہادر صف بستہ حاضر ہوتے۔ دوسرا شبستان۔ رات کو دن سے بھی زیادہ جگہ بلند ہوتی تھی۔ نامی نامدار اور بڑے بڑے سردار باہر کھڑے ہوتے۔ دروازہ پر شاہی خواص۔ جو لوگ پاس حاضر ہوتے، جنگی ہتھیاروں میں اوپچی بنے ہوتے تھے۔ بادشاہ کے پانْو تک بھی کسی کا ہاتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ کوئی جوتیوں کو بوسہ دے لیتا۔ کوئی

گردپھیر لیتا تو بڑی بات تھی۔ آستینیں لمبی لمبی ہوتی تھیں اور الگ ایک تخت پر دھری رہتی تھیں۔ بڑے ہی صاحب رتبہ ہوتے تھے کہ تخت کے پایہ کو بوسہ دے سکتے تھے۔ بزرگانِ عصر آستین کو تاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ خواجہ حافظ کہتے ہیں :

به زیر دلقِ ملمّع کمندها دارند　　درازدستیِ ایں کوته آستیناں بیں

خسرو

آه ازیں طائفهٔ زرق ساز　　آستیِ کوته و دست دراز

دیکھو انشاپردازی نے لباس ملک پر کیونکر اشارہ کیا ہے۔

برونستان (روزستان) کا حال تو سن لیا۔ درونستان (شبستان پنہانی) کا حال بھی سننا چاہیے۔ حرم سرا کو 'مشکوے زریں' کہتے تھے۔ نامہ آذر ہوشنگ (آئین مہ آباد) میں ہے کہ بادشاہ کی کتنی ہی بیگمات ہوں۔ مگر بانوان بانو (بادشاہ بیگم) ایک ہی ہوتی تھی۔ جو خدمتیں باہر مردوں کی تھیں محل میں بانوان بانو کے حضور میں لیاقت مند عورتیں بجالاتی تھیں۔ مگر اسے شاہانہ حکم احکام جاری کردینے کا اختیار نہ تھا۔ بادشاہ کی ماں زندہ ہوتی تو اس کی عظمت بانوان بانو سے زیادہ ہوتی تھی۔ انھیں باہر کے کاروبار میں کچھ دخل نہ تھا۔ بلکہ باہر ان کا نام بھی نہ لے سکتے تھے۔ وہ بے ضرورت سوار نہ ہوتی تھیں۔ بادشاہ اندر جاتا تو دیر تک نہ بیٹھتا تھا۔ وہ دربار کے کاروبار میں، مثلاً کسی عہدہ دار کے تقرر، ترقّی، تنزل۔ تبدل میں کچھ نہ کہہ سکتی تھیں۔ امیروں کے ہاں ایک ایک بڑھیا بادشاہ کی طرف سے رہتی تھی کہ بانوان بانو کو کل حالات لکھ کر بھیج دیتی تھی۔ یا زبانی آکر عرض کرتی تھی۔ وہ بادشاہ سے کہہ دیتی تھی۔

مشکوے زریں میں یا امرا کے محلوں میں خواجہ سرا یا بچّہ تک نہ جاسکتا تھا۔ بے گناہ کسی کو خوجہ نہ کرتے تھے۔ جس طرح اب درباروں سرکاروں میں خوجے محرم راز ہوتے ہیں اس وقت ایسا نہ تھا۔ بیچنے کے لیے کسی کو خوجہ کرنا بڑا جرم تھا۔ برس میں کئی دفعہ عیدوں کی تقریب سے شرفا کی عورتیں بانوان بانو کے سلام کو حاضر ہوتی تھیں۔ سال میں ایک دفعہ دربارِ عام ہوتا تھا۔ اُس میں تمام شہر کی عورتیں آتی تھیں۔ بادشاہ ان عورتوں پر نگاہ نہ کرتا تھا جس دن وہ محل میں آتیں تو کہیں اور چلا جاتا۔ ان زنانے درباروں سے مطلب یہ تھا کہ کسی کو اپنے شوہر یا رشتہ دار سے کچھ شکایت ہو تو خود اس ذریعے سے بادشاہ تک پہنچائے۔ بادشاہ آئین سلطنت کے بموجب دادرسی کرے۔

بے آزار جانور کے قتل پر عہد قدیم میں جان کے بدلے جان کا قصاص لیتے تھے۔ شراب پینی بھی ایسا ہی جرم تھا۔ کیومرث کے زمانے سے خفیہ پینے لگے۔ رفتہ رفتہ کھلم کھلا ہو گئی۔ مگر کوچہ و بازار میں مست نہ پھر سکتے تھے۔ دیکھ پاتے تو سزا دیتے۔ بادشاہ اتنی شراب نہ پیتا تھا کہ بیہوش ہو جائے۔ کیونکہ وہ پاسبان ہے۔ پاسبان کو ہشیار رہنا چاہیے۔ (باوک) بادہ دِہ (شراب دِہ) یعنی ساقی عورتیں ہوتی تھیں۔ بے ریش لڑکا جلسہ میں نہ آ سکتا تھا اور ابتدائے عہد میں پیتے بھی اس وقت تھے کہ حکیم کسی مرض کے لیے بتاتا تھا۔ آخر رواج ہو گیا تو یہ بھی دربار اور آرائشِ محفل کے سامانوں میں داخل ہو گئی۔ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے کی محبت کا پیالہ اٹھاتے تھے۔ کبھی غائب کی یاد پر جام پیتے تھے۔ شاہنامہ اور سکندر نامہ کے جام ایسے شعروں سے چھلک رہے ہیں :

فردوسی :

بیاد تو نوشم ہمہ روز جام   بمہر تو کوشم ہمہ صبح و شام

فردوسی :

بہ شادی زمانے بر آریم کام   ز جمشید گوئیم و نوشیم جام

نظامی :

بدہ ساقی نوش لب جامِ مے   بنوشم بیادِ شہ نیک پے

خواجہ حافظ اسی خیال میں فرماتے ہیں :

چو باحبیب نشینی و بادہ پیمائی   بیاد آر محبان بادہ پیما را

وہاں کے ارمنی اور آتش پرستوں میں قدیمی رسمیں موجود ہیں۔ جب دوست آشنا مل کر سُرور کرنے بیٹھتے ہیں۔ جامِ بلوریں، شیشہ و مینا، نقل و گزک وغیرہ وغیرہ سامان حاضر ہوتے ہیں۔ ساقی جام بھر کر دیتا ہے۔ طرف ثانی آنکھوں ہی آنکھوں میں شکریہ ادا کرتا ہے اور ایک انداز کے ساتھ گردنِ مینا یا دوسرے گلاس سے ٹکرا کر کہتا ہے۔ بیادِ دوست! کبھی ذرا سی چھلکاتا ہے اور کہتا ہے۔ قُربانِ سرِ دُوست اور پی جاتا ہے۔ ساقی دوسرے کو بھر کر دیتا ہے وہ آنکھوں کو لگاتا ہے اور چڑھا جاتا ہے۔ اسی پر خواجہ حافظ کہتے ہیں :

اگر شراب خوری جرعہ فشاں بر خاک
از آں گناہ کہ نفعے رسد بہ بغیر چہ باک

رستوں پر منزل بہ منزل سرائیں تھیں[1]۔ وہاں بھی شُد بند (خبر نویس) موجود۔ طبیب سامانِ ضروری کے ساتھ بچّوں، بیماروں، اپاہجوں کی خبر گیری کو حاضر۔ مستورات مسافر ہوں تو بڑھیاں عورتیں موجود ہوتی تھیں جو در کار ہو حاضر۔

سپاہیوں کی عورتیں بڑی کار گزار ہوتی تھیں۔ کاتنا، سینا، پرونا اور ہر قسم کی دستکاریاں جانتی تھیں۔ گھوڑے کستی تھیں۔ سوار ہوتی تھیں۔ کمانداری و تیر اندازی میں مشّاق ہوتی تھیں۔ سفر کی محنتیں مردوں کے برابر اٹھاتی تھیں۔ (یہ اوصاف وہاں کی صحرا نشین عورتوں میں اب بھی موجود ہیں)۔

خبر رسانی کا انتظام بھی خوب تھا۔ سلطنت بہت وسیع تھی۔ اس لیے تمام رستوں پر (رَوَند) ڈاک کے رونے بیٹھے ہوئے تھے۔ شدہ بند اپنے رَوَند کو دیتا تھا۔ رَوَند بہ رَوَند بادشاہ تک پہنچادیتے تھے۔ اسی واسطے تھوڑی تھوڑی دور پر (آبادچہ) گانو بسائے تھے۔ جابجا ڈاک چوکی کے لیے گھوڑے تیار رہتے تھے۔ اسی طرح بادشاہ کی طرف سے احکام روانہ ہوتے تھے۔ بعض کام ایسا خفیہ اور ضروری ہوتا تھا کہ بادشاہ کسی خاص امیر کو کاغذ دیتا تھا۔ بجائے 'رَوَند' کے وہ آپ لے کر چوکی بہ چوکی پہنچتا تھا کہ دوسرے کو بُو تک نہ پہنچتی تھی۔ انھیں 'نوند' کہتے تھے۔ مگر 'نوندوں' کی مجال نہ تھی کہ رستہ میں کسی کا گھوڑا جبراً چھین لے۔ لیتے تو سزا پاتے تھے۔

بخشی ہمیشہ سپاہیوں سے پوچھ لیتا تھا کہ افسر سے راضی ہو؟ پہرہ میں چار چار مل کر پہرہ دیتے تھے۔ پَہر پَہر بھر۔ دو ہتھیار بند کھڑے پہرہ دیتے تھے۔ دو تیار سوتے رہتے تھے۔ وہ دو سو کر اٹھتے تو یہ دونوں سو رہتے۔ صبح ہوتے یہ رخصت 4 اور حاضر۔ اس پر بھی لشکر دار کے حکم سے افسر تین دفعہ آکر دیکھ جاتا تھا کہ پہرہ پر ہشیار ہیں یا نہیں۔ جب پہرہ دے کر جاتے تو ان سے پوچھ لیتے کہ افسر سے کسی بات کی شکایت تو نہیں کرنی؟ ہر جگہ بخشی ماہ بماہ فوج کی موجودات لیتے تھے۔ سامان اور لوازماتِ سپہ گری میں کسی چیز کی کمی ہوتی تو باز پرس کرتے تھے۔

---

1. اب بھی اصفہان سے طہران اور مشہد مقدس اور ہرات تک برابر 3 3 4 4 کوس پر عالی شان سرائیں اور رباط سلاطینِ صفویہ کی عظمت اور حسن نیت دکھا رہی ہیں۔ میں جس سرا پر پہنچتا تھا اس کی استواری اور عمدہ تعمیر دیکھ کر دل اور زبان برابر کہتے تھے شکر اللّٰہ سعیھُم۔ ہاتھ اٹھاتا تھا اور فاتحہ پڑھ کر ثواب پہنچاتا تھا اور کاروان میں بھی چند آدمی ضرور نیکی سے یاد کرتے تھے۔ میرے دوستو! دیکھو نیکی کیا شے ہے اور اس میں کتنا زور ہے۔

عذر معقول مقبول ہوتا تھا۔ ضرورت ہوتی تو اس کا سرانجام کرتے۔ کسی کی جاگیر پر تنخواہ ہوتی تھی، کسی کی نقدی پر۔ روزانہ، ماہانہ جو ہوتا برابر ملتا تھا۔ دن رات میں کوئی غائب ہوتا تو اتنا ہی وضع ہو جاتا نہ کہ تمام۔ ضرورت پر رخصت مانگتا تو ملتی تھی۔ افسر بھی اپنے ماتحتوں سے خوشنودی نامہ لیتے تھے کہ ہم سے کوئی بدسلوکی نہیں کی۔ وہ دست بدست بالادستوں کے ہاتھوں بادشاہ تک پہنچتا تھا۔ جاسوس ہفتہ بہ ہفتہ خبریں دیتے رہتے تھے۔ پھر بھی بادشاہ سپاہ اور نوکروں سے پوچھتا رہتا تھا کہ حق سے محروم تو نہیں رہے۔

مصاحبوں کو مجرم کا جرم بخشوانے کی مجال نہ تھی۔ احکام کی پابندی اس قدر تھی کہ بیٹا باپ کو اور باپ بیٹا کو بے دریغ سزا دیتا تھا۔ اگرچہ قتل کیوں نہ ہو۔

ہاتھی شیر اور بڑے بڑے درندوں کی لڑائی کے لیے مقام مقرر رکھتے تھے۔ ان کے کناروں پر دیواریں اونچی اونچی بناتے تھے۔ گرد لوگ بیٹھے تماشا دیکھتے تھے۔ انھیں کچھ خطر نہ تھا۔ مست ہاتھیوں کو اور پلے ہوئے درندوں کو بازاروں میں نہ لاتے تھے۔ آبادی سے دور رکھتے تھے۔ مست ہاتھی نے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ بادشاہ نے اسے مار ڈالا اور محافظوں کو بھی قتل کیا۔

لڑائی کے وقت ترتیب سے قلعہ باندھ کر لڑتے تھے۔ اس ترتیب کو نہ لڑائی کے وقت ٹوٹنے دیتے تھے نہ بعد فتح کے توڑتے تھے۔ دشمن بھاگ جائے تو اس کی لوٹ پر نہ جا گرتے تھے۔ میدانِ جنگ میں ایک ایک جاں باز نکلتا تھا اور دلاوری اور حبِ قومی کی داد دیتا تھا۔ شاہنامہ میں بہت سے معرکے ایسی لڑائیوں کے تماشے دکھاتے ہیں۔ مگر انشاپردازی میں یکہ تاز، یکہ سوار، یک سوار وغیرہ الفاظ بھی اس رسم پر دلالت کرتے ہیں۔

فتح کے بعد بادشاہ سوچ سمجھ کر ایک حصہ فوج کا بھیجتا تھا جو خیمے ڈیرے مال اسباب رہ جاتے تھے اس کی قرقی ہوتی تھی۔ فتحیاب فوراً اپنے خیموں میں داخل نہ ہوتے تھے کہ ایسا نہ ہو دشمن پلٹ پڑے۔ لوٹ میں سے بادشاہ پہلے غریبوں کا حق اور عمارت اور کارہائے مفید کے لیے ایک حصہ نکال لیتا۔ پھر اہلِ فوج، جنھوں نے جنگ میں جانفشانیاں کی ہوں، ان کے حق۔ پھر جو معرکہ میں موجود تھے انھیں پھر سپہبدوں اور سرداروں کو دیتا تھا۔ پھر اپنا حق لیتا تھا اور نہایت قدیم زمانہ کے بادشاہ اپنا حق بالکل نہ لیتے تھے۔ جو جو لوگوں کے نقصان ہوئے انھیں کا تدارک کرتے تھے۔ اپنے ملک میں کسی پر سازش کا شمول پاتے تو تحقیقات کے بعد سزا دیتے۔ حریف کے لشکر میں جو ہتھیار ڈالتا اور امان مانگتا اسے نہ مارتے۔ زخمیوں کی تیمارداری میں بڑی توجہ

کرتے تھے۔

40 50 منزل کا احاطہ گھیرتے۔ اس میں کوسوں کے جنگل اور پہاڑوں سے جانوروں کو گھیر لاتے تھے۔ نکاس کے موقعے بند کرتے۔ بہت سے لکڑ ہاتھ آجاتے تو کٹہرے کھڑے کرتے۔ ایک دن بادشاہ تمام امیروں کے ساتھ آتا۔ اچھے اچھے سپاہیوں اور پہلوانوں کو لاتا۔ بادشاہ کا تخت بہت اونچا سجایا جاتا کہ کسی جانور کا حملہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ شاہ شاہزادوں سمیت بیٹھتا۔ درندے جانوروں کو سامنے گھیر کر لاتے اور ایسی ہشیاری سے روکتے کہ ایک جانور بھی نکلنے نہ پاتا۔ پہلے شاہ تیر پھینکتا، پھر شاہی خاندان لے لوٹ، پھر اور امیر، پہلوان، سپاہی، جب سب درندوں کو مار لیتے تو جمع کرکے ڈھیر لگاتے اور دیکھتے۔ اگر کسی کے ہاتھ سے بے آزار جانور مارا جاتا تو اُسے بہت سی لعنت ملامت کرتے اور قصاص میں اسے مار کر ساتھ رکھ دیتے تھے۔ پھر موبد ایک بلندی پر چڑھ جاتا اور کہتا کہ اے بے آزار جانورو۔ تمھارے دشمنوں سے انتقام لینے کو بادشاہ دادگر نے بذاتِ خود توجّہ کی۔ خون کا عوض لیا گیا۔ وہ اپنی سزا کو پہنچے۔ اب آرام سے جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرو چلو رہو سہو۔ دیکھو اپنے ربّ النّوع کے سامنے شکوہ نہ کرنا۔ پھر احاطہ توڑ دیتے تھے۔ بے آزار جانور جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے تھے۔ اس شکار کو 'داد شکار' کہتے تھے۔ اب کتب تاریخ میں اسے 'شکارِ قمرغہ' اور 'شکارِ جرگہ' کہتے ہیں (ترکی لفظ ہیں)۔

گھر گھر قومی رسم و رواج کا پابند تھا۔ ننگ و ناموس کی بڑی حفاظت تھی۔ بچّوں کی تربیت پر توجّہ تھی۔ جب لڑکا سمجھ والا ہوتا تو 3 باتوں کی تعلیم دیتے تھے۔ راستبازی، شہسواری۔ تیر اندازی۔ ساتھ اس کے بڈّھے کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ مجلس میں اس سے اوپر نہ بیٹھتے تھے۔ رستہ میں آگے نہ بڑھتے تھے۔ یہ تاریخی آگاہی ہے اور ماہر لغت لفظ 'سالار' ہی کو دیکھ کر سمجھ جائے گا کہ مرکب ہے 'سال ار' یا 'سال ور' سے دانائے سخن ان کی انشاپردازی دیکھ کر سمجھ جائے گا کہ جب کوئی بات نصیحت کی کہتے ہیں۔ پیر مغاں، پیر کہن، پیر دہ کی زبان کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قوم میں ان کی فہمائش بہ نسبت اوروں کے زیادہ موثر تھی۔ مقابل اس کے مخاطب کو اے پسر خطاب کرتے ہیں۔ انشاپردازی یہ بھی خبر دیتی ہے کہ شرفا کے لڑکے آوارہ گردنہ ہوتے تھے۔

منہ اے طفلِ اشک از خانۂ چشمم قدم بیروں
کہ می آیند مردم زادہ ہا از خانہ کم بیروں

کہن سال شخص اپنے علاقہ بلکہ علاقوں کی تاریخ۔ گھر گھر کے حالات کا ذخیرہ اور ان کے رسوم و قواعد کا قانون ہوتا تھا۔ اس کی نیک نیت اور نیکوکاری اسے یہ منصب دلواتی تھی۔ دیکھو 'بوستان' میں ایک بڈھا اپنے بڑھاپے کی واقفیت سے ایک ناواقف کو دباتا ہے :

کس از من نداند دریں شیوہ بہ ندانی کہ فرتوت شد پیر دہ؟

(یعنی میں)

یہی بنیاد ہے جس سے رفتہ رفتہ 'ریش سفید' چودھری، یالمبر دار، یا سردار قبیلہ کو کہنے لگے۔ اب بھی کوہ و دشت کے قبائل میں اس شخص کا زور۔ قومی زور کے شمول سے بعض موقع پر بادشاہ کے قابو کا نہیں ہوتا۔ شیخ سعدی بہت جگہ اس بنیاد پر اپنی نصیحت میں زور پیدا کرتے ہیں :

شنید ایں سخن دہ خدائے قدیم بشورید و گفت اے خبیث رجیم

فردوسی کا شاہنامہ کہتا ہے کہ اس نے اپنے افسانہ کا سرمایہ کہن سال لوگوں سے پایا ہے۔ وہ ہر داستان کے آغاز یا انجام میں کہتے ہیں : فردوسی

چنیں گفت دہقان دانش پژوہ مرا ایں داستاں راز پیشیں گروہ
ز گفتار فرزانۂ مرد پیر سخن بشنود یک بیک یادگیر
ز گفتار دہقاں کنوں داستاں بہ پیوندم از گفتۂ باستاں

نظامی اکثر ساقی کی طرف خطاب کرتے ہیں۔ دہقاں پیر کی طرف کم۔

جوے میستاند ز دہقان پیر بہ زر میفرستد بدیوان میر
گزارندۂ درج دہقاں نورد گزارندگاں را چنیں یاد کرد

فردوسی کے حق میں کہتے ہیں :

سخن گوے دیرینہ دانائے طوس کہ آراست روئے سخن چوں عروس

ستم رسیدہ جب کسی کے ظلم سے سخت نالاں ہوتا تو کاغذی پیرہن پہن کر دربار میں فریادی آتا۔ دیکھو انشا پردازی نے کس رنگ سے خبر دی ہے۔ کمال اسماعیل :

کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد زادۂ خاطر من تا بدہی داد مرا

رسم قدیم ہے کہ جب کسی کا دوالا نکل جاتا ہے تو دُکان کے آگے کھڑا ہو جاتا اور بوق بجاتا۔ انشا پردازی نے اسے آگاہ کیا اور ساتھ اس کے یہ بھی جتایا کہ خر آس یا پنچکی والے بھی بوق بجایا کرتے ہیں تاکہ اناج لانے والوں کو خبر ہو جائے :

آسیائے دہر خالی دیدم از جنسِ وفا　　　　در جہاں بوتے بہ طرز آسیاباں مے زنم

اب اسی طرح حمامی حمام کے آنے والوں کو خبر دیتا ہے کہ آج حمام میں عورتیں ہیں۔ مرد نہ آئیں۔

میں نے جب دھرم شاستر کے باب شہادت میں دیکھا کہ آگ شہادتِ غیبی ہے تو سیاوش کی داستان یاد آئی اور ساتھ ہی رنج ہوا کیونکہ یہاں اس کا عمل در آمد بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وہاں ایک اشارہ کے سوا کچھ بھی نہیں (ہائے تاریخ باستانی) اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ بہت کچھ ہوگا اور خدا جانے کیا کچھ ہوگا۔

ہند کے راج میں جب کسی متہم پر یہ عمل ہوتا تھا، تو نگری کا راجا دو دن پہلے تعلقات دنیا سے محترز ہو کر طہارت حاصل کرتا تھا۔ ایک دن پہلے بموجب طریقہ شاستر کے ایک خاص وضع اور لباس کے ساتھ آتا اور جگہ مقرر کرتا۔ اس کی شان دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ زمین پر نو دائرے کی قطار مغرب سے مشرق کو کھینچتا۔ ہر دائرے کا قطر 16 انگل۔ ہر دائرہ ایک ایک دیوتا کے ساتھ منسوب ہوتا تھا۔ ہر دائرہ میں 32 انگل کا فاصلہ۔ ایک ایک پر گھاس بچھی ہوئی۔ راجہ ہر دیوتا کی پوجا کرتا تھا۔ دائروں کے گوشۂ مغرب کی طرف آگ دہکتی تھی اور شانتی ہوم ہوتا تھا کہ رحمت کی برکت حاصل ہو۔ ایک لوہے کا گولا جس کا 8 انگل کا دَور اس دہکتی آگ میں تپتا تھا۔ برہمن دھرم کی استت یعنی ستائش و نیائش کے منتر پڑھتا تھا سب دیوتاؤں کی پوجا کر کے ہوم شروع کرتا وہ ایک عرصہ معین تک جاری رہتا اور استت کے منتر پڑھے جاتا۔

ملزم کمال اعتقاد اور عجز و نیاز کے ساتھ حاضر ہوتا۔ اس کے ہاتھ چاولوں کے آٹے سے مَل مَل کر دھلواتے تھے۔ برت رکھے ہوتا تھا۔ اسی وقت اشنان کرتا اور بھیگے کپڑے پہنے سامنے آتا۔ ایک کاغذ میں جرم کی تفصیل لکھی ہوتی تھی۔ وہ ایک منتر پڑھ کر اس کے سر پر باندھتے تھے۔ اس کی ہتھیلی پر اشوتا یا پیپل کے پتے۔ وہ بھی نہ ہو تو آکھ کے یا کسی اور درخت کے 7 پتے اوپر تلے رکھ کر 7 دھاگوں سے باندھتے تھے۔ اس پر 7 پتے سمیت کے۔ 7 پتیاں ہری دوب اور کچے چاول دہی ملے ہوئے اور کچھ پھول رکھتے تھے۔ ملزم پہلے مغربی دائرے میں ٹھیک مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوتا تھا۔

راجا ہوم کی آگ میں گولے کو تپاتا تھا اور منتر پڑھتا جاتا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے :
اے آگ تو ہی چار بید ہے۔ تجھی پر کل پرستشوں کا مدار ہے۔ تو دیوتاؤں اور دیوتا مقام بزرگوں

کی مورت ہے تو کل مخلوقات میں رمی ہوئی ہے۔ اسی واسطے ہر نیک و بد کی تجھے خبر ہے۔ تو گناہ سے پاک کرتی ہے اسی واسطے سب تجھے پاک کرنے والا مانتے ہیں۔ اے پاک کرنے والی۔ اپنا ظہور دکھادے۔ گناہ ہے تو جل اٹھ اور نہیں ہے تو ٹھنڈی ہو جا۔ اے آگ تو کل مخلوقات کی گواہ ہے۔ اے روحانی پاک۔ جو حال فانی انسان نہیں جانتا تو جانتی ہے۔ یہ آدمی ایک الزام میں آگیا ہے اور اپنی بَرَاءَت چاہتا ہے۔ اس کو جیسی بَرَاءَت کہ دینی چاہیے، تیرا ہی کام ہے۔ یہ کہہ کر وہ گولا جو تین دفعہ آگ میں دہکا کر سرخ کر چکا ہے، دستے سے پکڑ کر نکالتا تھا اور مجرم کے سامنے لاتا تھا۔ وہ نہایت صدق و یقین کے ساتھ حق کی طرف ملتجی ہوتا تھا اور ہاتھ بڑھا کر آگ کی استت کا منتر پڑھتا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے : اے پاک کرنے والی آگ! تو ہر مخلوق میں رمی ہوئی ہے۔ تیرے ہونے سے ہر چیز ہوتی ہے تو مصیبت زدہ کی بے گناہی ثابت کر سکتی ہے۔ جو کچھ حق ہے۔ گواہ کی طرح بول اٹھیو۔

ملزم پہلے دائرے میں تو کھڑا ہی ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ 7 قدم اور آگے بڑھتا تھا۔ نویں پر جاکر گولا ہاتھ سے پھینک دیتا تھا اور ہتھیلی پر بالکل آنچ نہ آتی تھی تو جرم سے بری سمجھا جاتا تھا۔

مجھے اس بات سے بحث نہیں کہ یہ شہادت غیبی سچی ہوئی یا نہیں اور وہ شخص بری ہوا یا نہیں۔ مگر تصور کر کے دیکھو کہ یہ پُر اثر سامان اور اس وقت اہلِ عمل کی عظمت و شان اور ان منتروں کے موثر الفاظ ان لوگوں کے دلوں پر کیسی تاثیر پیدا کرتے ہوں گے جس کا ذکر بھی ہمارے کانوں میں سے بغیر اثر کیے نہیں گزر جاتا۔ ایران جیسی عالی شان مملکت میں اور 'ژند' و 'استا' جیسی باعظمت کتابوں سے جب ایسے معرکہ کی شہادت ہوتی ہوگی تو اسی بات میں طے نہ ہو جاتی ہوگی کہ آگ میں گئے اور چلے آئے۔ وہاں بھی اس کے بڑے بڑے سامان ہوتے ہوں گے اور عجیب و غریب عبارتوں میں ستائشیں اور نیائشیں ہوتی ہوں گے۔ افسوس کوئی قدیمی کتاب نہ رہی۔ مگر افسوس، کہ باقی ہے۔

قواعد تدبیر المنزل میں لکھا ہے کہ دولت مند مال کے 3 حصے کرتے تھے۔ $\frac{1}{3}$ میں گھر کے کاروبار اور تجارت۔ $\frac{1}{3}$ کی اشرفیاں وغیرہ امانت کہ سفر آپڑے تو جوکھوں کی چیز جہاں چاہے رکھ لے۔ $\frac{1}{3}$ کا روپیہ اشرفی وغیرہ قیمتی چیزیں لے کر ایسی جگہ گاڑ دیتے تھے جہاں کسی کو خیال بھی نہ جاسکے اور ان پر طلسم بھی لگاتے تھے کہ کوئی نہ لے سکے۔ ایسے دفینے کبھی تو

زمینداروں کو ہل جوتتے جوتتے ہاتھ آتے تھے۔ کبھی خدا کے بندے قسمت کے زور سے نکال لاتے تھے۔ یا وہیں کے وہیں رہ جاتے تھے کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ یہ دور اندیشیاں زمانہ کے انقلابوں سے یا بادشاہ وقت کے خطر سے ہوتی ہوں گی! مطلب یہ ہے کہ اہل انشا نے جو 'گنج در دیرانہ' اور 'مار بر سر گنج' اور 'طلسم کشایان خزائن اسرار' وغیرہ کے خیالات باندھے، اسی بنیاد پر ہیں۔ نظامی :

مگر مار بر گنج زینجا نشست　　　　که تا رائگاں گنج ناید بدست

سب سے اول عید نوروز ہے۔ وہاں بھی شروع سال یہی ہے۔ یہاں بھی اسی دن سے سال سمبت شروع ہوتا ہے۔ 12 سو برس ہوئے کہ اسلام اپنی تاثیر اس ملک و مملکت پر پھیلا رہا ہے مگر جب سے آج تک برابر چلا آتا ہے۔ بادشاہ سے امیر اور امیر سے غریب تک گھر گھر جشن مناتے تھے۔ وہی دھوم دھام اور جوش و خروش دلوں پر چھائے ہوئے تھے کہ شاہنامہ اور سکندر نامہ کے ہر داستان پر اور قصاید کے سروں پر گلہائے بہاری کے تاج دھرتے ہیں۔ 6 دن بادشاہ جشن کرتا تھا۔ امرا اپنی حیثیت بموجب اس کی پیروی کرتے تھے۔ غریبوں کو خیرات، نوکروں کو انعام دیتے تھے۔ گھر سجاتے تھے۔ زرق برق کے کپڑے پہنتے تھے۔ پھلے پھولے باغوں میں۔ ہرے میدانوں میں میلے کرتے تھے۔ ناچ ہوتے تھے۔ باجے بجتے تھے۔ سانگ بنتے تھے۔ انڈے لڑاتے تھے۔ دل لگی کے کھیل ہوتے تھے۔ مُردوں کی یادیں کرتے تھے۔ کھانوں کے طبق بھر بھر کر بزرگوں اور خاندان کے بڑے بڑے بہادروں کی ارواحوں کے لیے کوٹھوں اور برجوں پر رکھتے تھے۔ ان میں سے جو اچھے ہوتے تھے وہ پریاں بن کر۔۔ جو خبیث ارواحیں ہو جاتیں وہ بھوت بن کر آتے اور کھا جاتے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے تین دن تک روحیں زمین سے 3 3 کمان اوپر اوپر پھرتی ہیں۔ پھر اپنے اپنے پیاروں اور دوستوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ اگر وہ راضی ہو کر جائیں تو گھر اور گھر والوں کی نحوستیں دفع ہوتی ہیں۔ چنانچہ تین دن تک کوئی گھر سے باہر نہ نکلتا تھا۔ اب تک بھی گجرات دکن کے علاقے میں جو پارسیوں کی نسلیں ہیں وہ اپنی قدیمی رسموں کو معمولی دنوں میں زندہ کرتی ہیں۔

ایسا ہی ایک میلہ ستمبر کے مہینے میں یعنی اعتدال خریفی پر گرمی میں کرتے تھے۔

جون کے مہینے میں 'آب ریزان' ایک تہوار ہوتا تھا۔ آپس میں ایک دوسرے پر پانی ڈالتے تھے۔ جن لطیف مزاجوں کو خدا سامان دیتا تھا۔ وہ گلاب عرق بہار اور انواع و اقسام کی

خوشبوئیاں چھڑکتے تھے۔

دسمبر کے مہینے میں 'آتش سوز' کا تہوار ہوتا تھا۔ تمام آتش خانوں میں روشنیاں ہوتی تھیں۔ ڈھیر کے ڈھیر آگ جلتی تھی۔ لوگ جمع ہوتے تھے۔ اس کے گرد گاتے تھے، ناچتے تھے بلکہ اس میں بعض بعض رسمیں بے رحمی کی بھی ہوتی تھیں۔

ان تہواروں میں بعض دنوں کو فصلوں کے اعتدالوں سے بھی تعلق تھا۔ بعض کو سلطنت کے خاص خاص فتحناموں سے علاقہ تھا۔ بعض بالکل واہیات اور تمسخر تھے۔ چنانچہ ایک جشن ہوتا تھا کہ اسے 'جشن کوسہ برنشین' کہتے تھے۔ ایک آدمی ایسا ڈھونڈ کر لاتے تھے کہ ڈاڑھی کا کوسہ ہو اور آنکھ سے کانا۔ ایک ہاتھ میں پنکھا دیتے تھے ایک میں کوڑا۔ گدھے پر سوار کرتے تھے۔ اکثر خاندان شاہی کے لوگ اور امرا غربا گرد ہوتے تھے۔ اس سے مسخراپن کرتے جاتے تھے۔ اس کے بدن پر گرم دوائیں مل دیتے تھے کہ برابر چلاّتا تھا ہائے گرمی ہائے گرمی اور جلدی جلدی پنکھا جھلنے لگتا تھا۔ تب کوئی اس پر ٹھنڈا پانی ڈال دیتا تھا کوئی برف ڈال دیتا تھا۔ یہاں تک کہ مارے سردی کے کانپنے لگتا۔ پھر بہت غصے ہوتا اور کوڑا سنبھال کر پھرانا شروع کر دیتا۔ لوگ اس کی چوٹیں کھاتے تھے اور ہنستے تھے۔ وہ جس دُکان میں چاہتا گھس جاتا۔ جس سے جو چاہتا مانگتا۔ مالک نہ دیتا تو چھین لیتا۔ کچھ سیاہی، کچھ گیرو، کچھ کیچڑ گھلا ہوا اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ جو نہ دے اس پر ڈال کر خراب بھی کرتا تھا۔ لوگ خود اپنے اپنے دروازوں پر اور جابجا اس کے واسطے نذرانے لیے حاضر رہتے تھے۔ صبح سے دوپہر ڈھلے تک جو جمع ہو، بادشاہ کے خزانے میں جاتا۔ پہر 4 گھڑی دن رہے تک 'کوسے مسخرہ' کا اور اس کے ساتھیوں کا حق تھا۔ شام سے پہلے پہلے یہ سوانگ ختم ہو جاتا تھا اور گدھے سے اترتے ہی ایسا غائب ہو جاتا تھا کہ پھر نہ دکھائی دیتا تھا۔ پھر دکھائی دیتا تو اتنا پٹتا تھا کہ ہوش ٹھکانے نہ رہتے تھے۔

اپریل میں 'جشن خورّم روز' ہوتا تھا۔ اس کی بنیاد عین مصلحت ملکی پر تھی۔ بڑی دھوم دھام سے جشن مناتے تھے۔ امرائے دربار، رؤسائے ملک، شرفائے قوم، تعلقہ داران اضلاع، بڑے بڑے زمیندار بلائے جاتے تھے۔ زمینداروں کی عزّتیں ہوتی تھیں۔ بادشاہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ایک دسترخوان پر کھانا کھاتا تھا۔ پھر ایک ایسی الفت بھری تقریر کرتا تھا کہ جس سے سب کے دل اس کی محبت اور قوم کی ہمدردی سے لبریز ہو جاتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ اے میری قوم! میں، تم ہی میں سے ایک ہوں۔ سلطنت کے، بلکہ دنیا کے کام زراعت اور عمارت پر

منحصر ہیں۔ یہ بے تمھارے نہیں چل سکتے۔ میرا تم بغیر گزارہ نہیں جس طرح کہ مجھ بغیر تمھارا گزارہ نہیں۔ ہم تم سب ہمدرد بھائی ہیں۔ چاہیے کہ ہمیشہ باہم مل جل کر رہیں اور اپنے آرام کو دوسرے کے آرام پر قربان کرتے رہیں۔ تاکہ امن امان اور آسائش و آرام ہم تم میں عام رہے۔

دسمبر میں ان عزیزوں کی یادگار کی رسمیں ادا کرتے تھے جو مر گئے تھے۔ان کی آٹے کی مورتیں بناتے تھے اور چوراہے میں رکھ آتے تھے۔ان کے ساتھ اور بھی چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ان روحوں کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ جون کے مہینے میں کچھ اور ٹوٹکے کرتے تھے اور کہتے تھے کہ دیو بھوت پریت گھروں میں گھسے ہیں اب وہ نکل گئے اور اگر ہیں تو تکلیف نہ دے سکیں گے۔

فروری کے مہینے میں نوشت گژدم کا ٹوٹکا کرتے تھے کہ بچھو گھروں سے نکل جائیں۔ گھر کی تین طرف کی دیواروں پر کاغذ پر کچھ کچھ لکھ کر لگاتے تھے۔ دروازہ کی طرف کھلی رکھتے تھے۔اس وقت رنگین کپڑے پہنتے تھے اور کچھ عمل اور بھی کرتے تھے۔ پھر دروازہ کھول دیتے تھے۔ گویا بچھو ادھر سے نکل گئے۔

اسی مہینے میں 5 دن تک 'مردگیران' کا جلسہ رہتا تھا اور اسے حافظ عورات سمجھتے تھے۔ان دنوں میں عورتوں کو بڑے اختیار ہو جاتے تھے۔جو فرمائش کریں خاوند بجالائیں۔ لیکن باشوہر اور بے شوہر سب پاک دامن ہوتی تھیں۔ کوئی خبث درمیان نہ ہوتا تھا۔ اس میں ہندوستان کے سویمبر کا ڈھنگ ہوتا تھا۔ چنانچہ آپس کی پسند اور رضامندی سے بعض جگہ منگنیاں بعض جگہ شادیاں ہو جاتی تھیں۔ یہ قوم کا عام رواج تھا۔امیر غریب، جاہل، عالم کوئی اس سے باہر نہ تھا۔ چنانچہ جو شادیاں اس طرح ہوتی تھیں وہ بڑی مبارک اور پسندیدہ گنی جاتی تھیں۔ گویا نسل اور ولادت کا فرشتہ ان سے خوش ہوتا تھا۔

ایام بہار میں ہولی کی طرح چراغاں کرکے جشن مناتے تھے۔ ان میں سے 'چراغان روز اسفند' تھا اور یہ مارچ کے دوسرے دہاکہ میں ہوتا تھا۔ان کی شاعری خبر دیتی ہے :

دریں زمانہ چراغان روز اسفندم　　سیاہ روز شدم بہر عشرتِ دگراں

مینہ برسنے کے لیے بھی ٹوٹکا تھا۔ایک سانڈھ کی دُم میں روئی کپڑا وغیرہ آتش گیر چیزیں باندھ کر آگ دیتے تھے اور چھوڑ دیتے تھے۔ وہ بھاگتا تھا اور کسی بلندی پر جا کر ٹھہرتا تو جانتے کہ مینہ

برسے گا۔

بسنت کے میلے کا وہاں بھی اثر ہے۔ ایک قسم کے زرد پھول ہوتے تھے کہ آمد بہار میں سب سے پہلے کھلتے تھے۔ اہل عشرت ایک دن قرار دے کر باغوں میں جاتے تھے۔ گلگشت کرتے تھے۔ وہی پھول بہت سے توڑ کر لاتے تھے۔ گھروں کے حوضوں اور نہروں میں ڈالتے تھے اور خوشیاں مناتے تھے اسے 'جشنِ گل کوبی' کہتے تھے۔ مولوی معنوی فرماتے ہیں :

به باغِ حسن در آمد برسمِ گل کوبی خدائگانِ جمال و خلاصهٔ خوبی

افسوس کہ تقریر کہیں سے کہیں جا پڑی۔ کہنا کچھ تھا اور میں کچھ اَور کہہ گیا۔ حقیقت میں ان حالتوں کا بیان کرنا منظور تھا جس طرح آج کل اہل فارس رہتے سہتے ہیں اور جن رسم و رواج کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کا اثر نظم و نثر میں ظاہر ہوتا ہے۔ خیر۔ اب کی دفعہ اس تقریر کو یہیں ختم کرنا چاہیے اور مقصدِ اصلی کو ہفتہ آئندہ پر ملتوی رکھنا چاہیے۔

چھٹا لکچر

اسلام کے بعد اہلِ ایران کے آداب و رسوم اور رہنے سہنے کے طریق

لکچرِ گزشتہ میں تم نے سن لیا کہ عہدِ قدیم میں اہلِ ایران کے دین و آئین اور رسم و رواج کا کیا طور تھا۔ یہ بھی سن لیا کہ شاہانِ قدیم کی عظمت اور اختیار کس درجہ پر تھے۔ تمھیں معلوم ہے کہ اس کی بنیاد خود بادشاہ کی نیک نہادی اور دینِ الٰہی کی برکت سے تھی۔ شاہانِ قدیم موبدوں کی آواز پر کان لگائے رہتے تھے۔ اسلام کے عہد میں فتوائے شریعت پر سب کی نگاہ ہو گئی۔ گیارھویں صدی کے بعد صفوی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ ان کے ساتھ ہی اہلِ شریعت کے روزِ روشن کا خاتمہ ہوا۔ شاہانِ صفوی کے عہد میں یہ حال تھا کہ اگر مجتہدِ وقت بادشاہ یا کسی حاکم پر مخالفتِ شرع کا فتویٰ لگادیتے تو اسی وقت خاص و عام اٹھ کھڑے ہوتے اور اسے منہ چھپا کر بھاگنا پڑتا۔

شاہ عباس ماضی نے ایک عورت سے جبراً نکاح کرنا چاہا۔ ایک بھائی کے سوا کوئی اس کا وارث نہ تھا۔ مولانا احمد اردبیلی اس وقت مجتہد تھے۔ عورت کا بھائی ان کی خدمت میں پہنچا اور حال بیان کیا۔ انھوں نے ایک کاغذ کے پرزہ پر لکھ کر دے دیا صورہ رقعہ برادرم عباس! خواہر

حاملِ رقعہ را بہ وے بازدہ۔ فتح علی شاہ نے اسی وقت تعمیل کی اور وہ خط فخریتاً سب کو دکھایا کہ سرکار مولانا نے مجھے برادر لکھا ہے۔ پھر خزینہ دار کو دیا کہ اسے احتیاط سے رکھو دفن کے وقت میرے کفن میں رکھنا۔

اختیارات علما کے قائم رہتے، مگر زمانے کی ہوا بدل گئی۔ دولِ خارجہ زور پکڑ گئیں۔ سلطنت کا مزاج ضعف کے سبب سے پہلی باتوں کو برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے واجب ہوا کہ ان میں تبدیلی کی جائے۔ یہ تبدیلیاں نادر کے عہد سے شروع ہوئیں اور وہ بے سبب نہ تھیں کیونکہ ملک کو افغانوں اور رومیوں کے قبضے سے نکالنا ممکن نہ تھا بجز اس کے کہ ملک میں قومی جوش پیدا کیا جائے اور مصالح ملکی کو شرع پر مقدم رکھا جائے۔ آغا محمد خاں دولت قاچاریہ کا بانی اور اس کے جانشین۔ یعنی شاہ حال کے بزرگوں کو روسیوں اور افغانوں سے ملک چھڑانا تھا۔ انھیں مصالح ملکی کو زیادہ تر مقدم رکھنا پڑا۔

ناصر الدین شاہ بادشاہ حال کے عہد میں ایک موقع پر مازندران کے علاقہ میں کوئی سردار باغی ہو گیا۔ اس کی گوشمالی کو فوج بھیجی گئی۔ اس وقت تک اتنی بات باقی تھی کہ ہر فوج کے ساتھ ایک ملائے عسکر ہوتا تھا کہ نماز، روزہ اور جماعتِ ہر روزہ۔ موت زیست کے امورات کا سرانجام کرے۔ اس فوج کے ساتھ بھی ایک ملا صاحب تھے۔ خدا جانے انھیں باغیوں نے کچھ لالچ دیا، یا آپ ہی دین داری کے دودھ میں ابال آیا۔ فوج کو کہا کہ "تم بھی مومنین، وہ بھی مومنین۔ لڑائی میں طرفین سے مومنین مارے جائیں گے۔ یہ جنگ جائز نہیں۔" چونکہ مرنا خود بھی کسی کو پسند نہیں۔ فوج نے لڑنے سے انکار کیا۔ سپہ سالارِ شاہی کو حال معلوم ہوا۔ وہ گھبرایا اور بادشاہ کو عریضہ لکھا۔ ایسے نازک وقت میں بادشاہ کو بجز اس حکم کے چارہ نہ تھا کہ "ملا صاحب کو پہرہ میں کر کے بھیج دو اور غنیم پر فوراً حملہ کرو۔" جناب ملا کو بھی خبر لگ گئی۔ وہاں سے ایسے بھاگے کہ ایک دم ہندستان پہنچے۔ ساتھ ہی بادشاہ نے حکم دیا کہ ملایانِ عسکر یک قلم موقوف۔ ایسے ایسے اکثر مقدمے واقع ہوئے۔ اسے 23 24 برس ہوئے۔ ملا صاحب موصوف کی اسی شہر لاہور میں مجھ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

مجتہد اب بھی وہاں بہت ہیں مگر جو کہ اوصاف اجتہاد سے موصوف ہیں انھیں بادشاہ اور حکام دل سے معزز و محترم سمجھتے ہیں۔ زکوٰۃ اور خمس کے روپے انھیں بانٹنے کو بھیجتے ہیں۔ وہ نہیں لیتے اور کہہ دیتے ہیں کہ اکثر علما ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں، انھیں دو، ہمارا وقت عزیز ضائع

ہوتا ہے۔ وہ تصنیف، درس، وعظ اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ بادشاہ خود ان کے سلام کو جاتے ہیں اور وہ پہلو بچاتے ہیں۔ وہاں کے علما امرائے دربار کو ظَلَمہ کہتے ہیں۔ مجتہد اور با احتیاط اشخاص۔ سوداگر بلکہ ادنیٰ دُکاندار یا پیشہ ور کی ضیافت کھا لیتے ہیں۔ نوکری پیشہ لوگوں کی ضیافت نہیں کھاتے۔ صاف کہہ دیتے ہیں ظلمہ ہستی آغا۔

اب علما کا کام یہ ہے کہ نماز روزہ، کفن دفن، نکاح طلاق، قرض فرض، بیع رہن وغیرہ آپس کے جھگڑے لوگ ان کے پاس لے جاتے ہیں۔ جو مقدمے ملکی معاملات سے تعلق رکھیں انھیں بادشاہ خود فیصل کرتا ہے۔ علما بھی اب ادھر دخل نہیں دیتے۔ سمجھ گئے ہیں کہ زمانہ کے انقلاب نے کاروبار عالم کے اصول بدل دیے ہیں اگر سلطنت کے کاموں میں ہاتھ ڈالیں گے تو جو کچھ ہے یہ بھی جاتا رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ ایران میں کسی عالم کو مجتہد ہونے کے لیے دو امر درکار ہیں اول مجتہدِ کامل کا اجازہ کہ یہ شخص علومِ دینی سے ماہر ہے اور صاحبِ تقویٰ وطہارت ہے۔ دوسرے اپنے تیئں ان صفتوں سے موصوف رکھنا جن سے پبلک کے اعتقاد بذاتِ خود اس کی عظمت کو تسلیم کریں۔ جب تک ایسے ہیں تب تک قبلہ و کعبہ ہیں۔ ایک نکتہ میں فرق آیا اور پبلک کے دل ہٹے۔ پھر جیسے سب ویسے وہ۔ کوئی نہیں پوچھتا۔

اب حال یہ ہے کہ مجتہدانِ حقیقی یعنی علمائے دیندار کو تو بادشاہی معاملات کی کچھ پروا ہی نہیں۔ علمائے دنیادار عالمِ بے اختیاری میں تڑپتے ہیں، کچھ کر نہیں سکتے۔ میں نے خود دیکھا چپکے چپکے کہا کرتے ہیں۔ سلطنت اور حکم سلطنت حق امام کا اور خزانہ دولت مال امام کا ہے۔ جب امام حاضر نہیں تو ہم علما وارث امام ہیں۔ بادشاہ نے ہمیں بے دخل کر رکھا ہے۔ حق امام کا غاصب ہے۔

کئی برس ہوئے ناصر الدین شاہ بادشاہ ایران یورپ کی سیر کو گئے۔ وہاں صدر اعظم یعنی وزیر کی صلاح سے ریوٹر کمپنی کو سڑک وغیرہ کا ٹھیکہ 70 برس کے لیے دے دیا۔ ایران میں بھی خبر پہنچی۔ یہاں علما نے صدر اعظم یعنی وزیر کی تکفیر کا فتویٰ لگا دیا۔ شاہ کو بھی خبر پہنچ گئی۔ اُدھر سے پھرا تو صدر اعظم کو بندرگاہ میں چھوڑ آیا اور کہا کہ معزول کر دیا۔ ساتھ اس کے علما کو سمجھایا کہ ریل بن جائے تو بہت فائدے کی بات ہے۔ آپ صاحبوں کو بھی حج و زیارات میں سواری و بار برداری کا آرام ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ بہت سے غیر مذہب مرد اور عورتیں

یہاں آکر مل جل جائیں گی۔ جن کے عادات واطوار اس ملک کے بالکل برخلاف ہیں۔ گدھے، خچر، اونٹ ہمارے بزرگوں کے بوجھ ڈھوتے رہے ہیں وہی ہمارے لیے کافی ہیں۔ بادشاہ نے کمپنی سے اقرار نامہ توڑنے کی ندامت گوارا کی مگر ان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ بات بھی جتانے کے قابل ہے کہ ایسے جلیل القدر، واجب التعظیم فقط گنتی کے لوگ ہیں۔ باقی جو مُلا اور عالم حاجی کہلاتے ہیں وہ لوگوں کے دلوں میں نہایت پست درجے رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ وہ ہیں جن کے ذکر شعرا کے فقروں میں شوخیاں پیدا کرتے ہیں۔

لطیفہ۔ چند سال ہوئے ایک شخص کے گھر سے آلاتِ شراب نوشی وغیرہ پکڑے گئے۔ فاضل نجفی وہاں کے مجتہد تھے۔ انھوں نے اسے سزا دی اور گھر لٹوا دیا۔ مرزا یغما نے اس پر رباعی کہی :

گردیدہ بساط بادہ خواراں ہمہ طے   شیخ نجفی شکست پیمانۂ مے
در بہر ریا شکست پس وائے بہ وے   گر بہر خدا شکست بس وائے بہ ما

اس کا چرچا ہوا۔ شیخ نے بھی سنا۔ بلایا اور کہا کہ یغما! ''اہانت شرع کردی بد کردی۔'' یہ استاد تھے! دست بستہ سر جھکا کر گربۂ مسکین کی طرح کھڑے ہوگئے اور کہا جناب آغا ہر گہے کہ خوردم پشیمانم بر آں۔ اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّی وَ اَتُوْبُ اِلَیْهِ شیخ بے چارے چپ ہوگئے۔ دعائے توبہ پڑھوائی اور رخصت کر دیا۔ انھوں نے آتے ہی ایک غزل کہی کہ جس کی طرح تھی۔ ساغر نمی کردم چہ می کردم۔ گوہر نمی کردم چہ می کردم۔ وغیرہ وغیرہ۔ اخیر میں کہا کہ :

ز شیخ شہر جاں بُردم بہ تزویرِ مسلمانی
مدارا گر بایں کافر نمی کردم چہ می کردم

یہ غزل یاروں کو دے گئے اور آپ دوسرے شہر میں چلے گئے۔ اسی دن گلی گلی اور کوچہ کوچہ یہ شعر زبانوں پر تھا۔

عہد قدیم میں شاہانِ مہ آباد کی تعظیم تعظیم الٰہی تھی۔ صفویہ کا خاندان بھی رُکن ایمان تھا کیونکہ ہزار در ہزار قزلباش حسن اعتقاد سے ان کے نام پر جان قربان کرتے تھے۔ خاک کی تاثیر اور قومی سرشت دیکھو آج قجر کی بادشاہت ہے مگر داب و آداب اور عظمت و احترام وہی چلے جاتے ہیں۔ دربار جس طرح باہر ہوتا ہے اسی طرح حرم سرا میں ہوتا ہے۔ وہی قواعد ہیں

وہی آئین مجرا ہیں۔ وہاں بھی کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

بادشاہ حال کے دادا فتح علی شاہ قجر نے اپنی تصویر حاکم سندھ کو بھیجی۔ اس کا صندوق ایک نہایت مکلف سواری میں رکھا ہوا۔ فوج کے ساتھ اس توزک و احتشام سے گیا جیسے کوئی درگاہ جاتی ہے۔ جس آبادی کے قریب پہنچتا تھا، لوگ پیشوائی کو نکلتے تھے۔ بڑی عظمت کے ساتھ لاتے تھے اور عید کی طرح خوشیاں منا کر روانہ کر دیتے تھے۔ بوشہر میں پہنچا تو دریابیگی کئی منزل استقبال کو گیا۔ جب شہر میں داخل ہوا تو شلک سلامی سر ہوئی۔

بادشاہی خلعت کسی حاکم کے پاس پہنچتا ہے تو وہ خواہ شہزادہ ہو خواہ کوئی امیر ہو۔ کئی میل تک استقبال کو آتا ہے۔ ہر شہر کے پاس ایک مقام مقرّر ہے۔ اسے 'خلعت پوشاں' کہتے ہیں وہاں ٹھہرتا ہے۔ شہر کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ دھوم دھام کا دربار ہوتا ہے۔ وہاں خلعت پہنتا ہے۔

دربارِ شاہی کے آئین و آداب دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ تمام شہزادے اور امرائے دربار اپنی اپنی جگہ باادب کھڑے، سب کی نگاہیں بادشاہ کی طرف۔ خاموش، بے حرکت۔ گویا بدن میں جان نہیں۔ کسی سے کچھ کہتا ہے تو اس طرح کہ فقط ہونٹ ہی ہلتے معلوم ہوتے ہیں۔ جس کو بلاتا ہے وہ کئی کئی قدم پر آگے بڑھتا ہے اور تھم جاتا ہے گویا بار بار اجازت چاہتا ہے کہ بڑھوں یا نہ بڑھوں؟ بادشاہ گفتگو کرتا ہے تو اپنے تئیں غائب تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شاہ فرمان می دہد۔ شاہ می فرماید۔ شاہ خواہش دارد۔ وزرا و امرا 'قبلۂ عالم' کہتے ہیں اور غائب ہی تعبیر کرتے ہیں۔ قبلۂ عالم کا حکم ہو تو اس طرح کیا جائے اور قبلۂ عالم کی اجازت ہو تو اس طرح عمل میں آئے۔

جب کوئی جشن ہوتا ہے تو طلسمات کا عالم ہوتا ہے۔ انگریزی سیاح اپنے سیاحت ناموں میں لکھتے ہیں کہ آسمان اس شکوہ و شان کے ساتھ دربار ایرانی کے مقابل میں ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ تخت مرصّع پر جواہرات جگمگ جگمگ کرتے ہیں کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ شاہ اس پر بیٹھتا ہے۔ اراکینِ دربار دو طرفہ عالمِ تصویر! میر غضب دیو پیکر گرز کندھوں پر دھرے حکم کے منتظر سامنے کھڑے رہتے ہیں کہ اِدھر اشارہ ہوا اُدھر ہاتھوں ہاتھ اڑا کر لے گئے۔ فرشتہ ہائے عذاب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ڈراؤنی صورتیں دیکھ کر زہرہ پانی ہوتا ہے۔ کئی میل تک دو طرفہ فوج کھڑی ہوتی ہے۔ مگر چپ چاپ، دم بخود، جاہ و جلال، رعب داب، عظمت و وقار کا یہ عالم کہ

گھوڑے کا کان تک ہلتا نہیں نظر آتا۔ ایسے دھوم دھام کے دربار جشن پر ہوتے ہیں یا جب دول خارجہ میں سے کسی کا بالیوس[1] آتا ہے تو اس کی ملازمت پر۔

سفر میں بادشاہ ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہوتا ہے، کیونکہ وہ شہسوار ہوتا ہے۔ بیماری کی ناچاری ہو تو تختِ رواں پر جاتا ہے۔ اسے قجر کھینچتے ہیں۔ سفر کا خیمہ و خرگاہ بھی بڑی نمود و نمائش رکھتا ہے۔ سلاطین صفویہ سادات تھے۔ وہ عبا و عمامہ رکھتے تھے۔ قجر سپاہ گری کا فخر رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کا لباس چست ہے اور عمامہ کی جگہ پوست برہ کی کلاہ۔ سواری کے گھوڑے برق و باد سے باتیں کرتے ہیں۔ سونے چاندی کا ساز دیراق جواہرات سے مرصّع ہوتا ہے۔ اس طرح کے بہت سے گھوڑے سجے سجائے کوتل بھی چلتے ہیں[2]۔ ہر شہر کے حاکم اپنے اپنے طویلوں میں اچھے اچھے گھوڑے تیار کرتے ہیں اور وقت بوقت حضور میں بھیجتے رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے محاورہ میں شاہ کا لفظ مختلف لفظوں کے ساتھ مل کر معنوں کو بھی شان و شکوہ دیتا ہے۔

(دیکھو ص 114)

حکایت۔ ایک دفعہ جہانگیر کابل میں تھا۔ میوہ کی ڈالی میں اعلیٰ قسم کے آلوچے سامنے آئے بہت خوش ہوا اور 'شاہ آلو' نام رکھا۔ وہ اپنی توزک میں 'شاہ دانہ' کا ذکر بھی بہت کرتا ہے۔ اسے بھی اور اکبر کو بھی بہت بھاتا تھا۔ اسی طرح شاہ لیمو، شاہ انجیر، شاہ زیرہ ہے۔ مگر لفظ شہتوت ہندستان میں ہے۔ وہاں فقط 'توت' کہتے ہیں۔ 'بادشاہ حسن'۔ 'تاجدار حسن' وغیرہ معشوق کو کہتے ہیں۔ چمن کے تخت پر پھول کو کبھی 'خسرو بہار'، کبھی 'خسرو گل' کہہ کر بٹھاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

رہنے سہنے اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں میں بہ نسبت اہل سلف کے بہت کم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس ملک میں زیادہ تر دو قسم کے لوگ ہیں (1) اہل شہر کہ خانہ گیر ہیں۔ (2) ایلیات۔ جنھیں بیابان گرد، صحرا نشین، خانہ بدوش جو کہو درست ہے۔ ہزاروں کی

---

1 غیر سلطنت کا وکیل جو دربار ایران میں حاضر رہتا ہے اسے بالیوس یا وزیر مختار کہتے ہیں۔

2 یورپ کے سفر میں ناصر الدین شاہ لندن میں تھے۔ گھوڑے کے ساز کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر گر پڑا۔ ایک گورے نے پایا اور شاہ کے منزل گاہ پر لایا۔ مصاحب نے حضور میں پیش کیا۔ پھر لا کر گورے کو واپس دے دیا اور کہا۔ ہر چہ از شاہ افتاد۔ بادشاہ او را دوست نمی کند کہ افتاد است، بگیرید حلال مال شماست۔ اس کی قیمت 10 ہزار تشخیص ہوئی تھی۔

جمیعت۔ عیال و اطفال، بال بچے، سب خانہ داری کے سامان۔ ایک شہر رواں یا ملک خانہ بدوشاں ہوتا ہے۔ ہزاروں بکریاں اور دُنبے، گھوڑوں کے گلّے، اونٹوں کی قطاریں ان کی املاک اور جاگیریں ہیں کہ ساتھ ساتھ پھرتی ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے اصلی وطن برفانی پہاڑ ہیں۔ ستمبر میں برف سے پہلے پہلے زمینیں تیار کر کے تخم ریزی کی۔ جہاں یخ بندی معلوم ہوئی، سب گھربار باندھا اور دامن کوہ میں اتر آئے۔ زیادہ سردی ہوئی تو درون اور سرسبز میدانوں میں نکل آئے۔ مئی میں برف پگھل گئی، پھر گئے تو دیکھا کہ کھیتی بالشت بالشت بھر کھڑی ہے۔ آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے 15 20 دن میں کاٹنے کے قابل ہو گئی۔ 3 4 مہینے وہاں رہے۔ جو غلّہ ہوا وہ لیا۔ پھر گھربار لاد پھاند کر اُتر آئے۔ تمام عمر اسی طرح گزر جاتی ہے۔

ان کے سفر کی حالت بھی ایک بہار کا تماشہ ہے۔ چولھا، چکّی، پکانے کھانے کے اسباب سب گھوڑوں خچروں اور گدھوں پر لدے ہیں۔ رنگ برنگ کے نمد اور قالین کہ اپنے ہاتھوں کی دستکاری ہے۔ وہی جھولیں پڑی ہیں۔ ننھے ننھے بچے جیسے چاند کے ٹکڑے۔ چھوٹے چھوٹے پنگوروں اور کجاووں میں سوتے ہیں یا بیٹھے ہیں۔ پنگورے اونٹوں اور خچروں پر جھولتے چلے جاتے ہیں۔ جو بہت غریب ہیں وہ کندھوں پر لیے ہیں یا کمر سے باندھے ہیں۔ یہ غریب مال دولت کے غریب ہیں، مگر حسن و جمال کے امیر ہیں۔ حوریں اور پریاں معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے شیر شکار کتّے مویشیوں کو گھیرے لیے جاتے ہیں۔ مجال نہیں کہ ایک جانور رستہ سے پھٹ جائے۔ جس وقت دامن کوہ یا کمر کوہ میں گزرتے ہیں (اور رستہ بھی ایک ایک ہی آدمی یا گھوڑے کا ہوتا ہے) اس وقت وہ رنگا رنگ کے گلزار چینوٹوں کی قطار عجیب بہار دیتی ہیں۔

یہ قدرتی مخلوق جنگلوں اور دروں میں بھی پھرتے چلتے رہتے ہیں۔ جہاں چارہ کے لیے سرسبز جنگل اور اپنے لیے میوہ دار درخت اور شکار دیکھے وہیں سیہ چادر یعنی کالی تنبوٹیاں ڈالیں اور اتر پڑے۔ یہ ڈیرے انھیں کے اونٹوں اور بکریوں کی اون کے ہوتے ہیں۔ ان کا کمسریٹ ان کے ساتھ لدا آتا ہے۔ وہ غلّہ، سوکھے توت، سوکھے زرد آلو، اخروٹ، گوشت قاق (سوکھا گوشت) سوکھا دہی ہوتا ہے۔ کچھ اس سے کچھ جنگل کے ہرے میووں سے کچھ تازہ شکاروں سے اپنے تنوں کو تیار اور جانوں کو تازہ کرتے ہیں۔ ان کے قبیلوں کے سردار جنھیں جوانی کی طاقت اور توانائی حوصلے دیتی ہے شہروں میں جاتے ہیں۔ درباروں سرکاروں میں خدمتوں سے عظمتیں پاتے ہیں۔ بڈھے سردار ریش سفید کہلاتے ہیں اور اس شہر رواں کے حاکم

یا بادشاہ جو سمجھو وہی ہوتے ہیں۔ ریش سفید کا سب ادب کرتے ہیں۔ وہ بھی سیدھی سادی وضع کے ساتھ ان میں انہی کی طرح ملا جلا رہتا ہے۔ سب کی چادریں ہمرنگ اور یکساں ہوتی ہیں۔ البتہ ریش سفید کی چادر ذرا بڑی ہوتی ہے۔

یہ جہاں اترتے ہیں چوکور قلعہ باندھ کر اترتے ہیں۔ اونٹ گھوڑے خچریں دُنبے ادھر ادھر چرنے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جوان کچھ کام نہیں کرتے۔ اگر شکار نہ ہو تو 10 10 20 20 مل بیٹھتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے ہیں، گاتے بجاتے ہیں اور حقہ اڑاتے ہیں۔ عورتیں گھروں پر رہتی ہیں۔ روٹیاں پکاتی ہیں، چرخے کاتتی ہیں، قالین ایسے ایسے بنتی ہیں کہ مخمل کو گرد کر دیتی ہیں۔ بعضی عورتیں بڈھوں اور اپنے بچوں کے ساتھ گلّے چراتی ہیں۔ جب بہار کے موسم میں شہروں کے مسافر گھروں سے نکلتے ہیں تو دیکھتے ہیں آذر بائجان اور کردستان کے درون اور پہاڑوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رنگا رنگ مخلوق خدا سے موج مارتے ہیں۔ یہ صحرائی مخلوق اکثر دامن کوہ میں یا پہاڑ کے آس پاس ہی رہتے ہیں۔ جہاں بادشاہ یا دشمن کی طرف سے کچھ خطرہ معلوم ہوا جھٹ اسباب باندھا اور پہاڑوں میں گھس گئے۔

شکار ان کی موروثی خوراک ہے۔ اسے شہری اور ایلیات دونوں آج تک برابر نباہتے ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ پہلے تیر و شمشیر سے شکار کرتے تھے۔ اب بندوق سے کرتے ہیں۔ شیر، چیتا۔ بھیڑیا، گیدڑ، لومڑی، خرگوش، جنگلی بکرے، پہاڑی بکرے، قسم قسم کے ہرن ان کا نشانہ ہیں۔ چرّہ، باز، شاہین سے، تیتر، خرگوش، کبوتر، مرغابی وغیرہ مارتے ہیں۔

کتّے کو نجس جانتے ہیں مگر شکار کا شوق وہ بھی پلواتا ہے۔ خصوصاً ایلیات کہ ہر سیہ چادر کے ساتھ ایک ایک شیر شکار کتا چوکیدار ہوتا ہے۔ جس سے بھیڑیے کی جان کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ بعض کتّے بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں بعض چھوٹے ہوتے ہیں اور نہایت خوشرنگ اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں، ان کے رنگ بہ رنگ کے نام رکھتے ہیں۔ سیہ مار، شہباز، قراباز، زرگوش، چنگ، پلنگ وغیرہ۔ اگر سیاحتِ ملک یا قوم کی تاریخ ان حالات سے خبر نہ دے تو انشا پردازی آگاہ کرتی ہے۔ خاقانی سفر مکّہ کے قصیدہ میں کہتا ہے :

چوں زراہِ مکّہ خاقانی بہ یثرب کرد رُو | پیشِ قبرِ مصطفیٰ ثانیِ حساں دیدہ ام
بندہ خاقانی سگِ تازی ست پیشِ مصطفیٰ | نخ نخ آں تازی سگے کش فارسی خواں دیدہ ام

خواجہ حافظ :

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی چرا بگردنِ حافظ نمی کنی رسنے

شاہ طہماسپ کے ایک مسخرے کا نام سگِ لوند تھا۔ شاہ ایک دن صبح اٹھتے ہی شکار کو چلا گیا۔ رات کے جلسے میں کچھ ذکر نہ تھا۔ سگِ لوند کو خبر نہ تھی رہ گئے۔ دوپہر کے قریب شاہ آیا۔ سگِ لوند حاضر تھے۔ گھوڑے کے پاس جا کھڑے ہوئے اور کہا کہ :

سحر آمدم بکویت بشکار رفتہ بودی توکہ سگ نبردہ بودی بہ چہ کار رفتہ بودی

چنانچہ یہی سبب ہے کہ بیسیوں اصطلاحیں اس سے ترکیب پا کر نکلی ہیں۔ مثلاً سگ سیرت، سگ دل، سگ جگر، سگ جان وغیرہ۔

ایسے جنگلی ملک میں قوم کی بہادری قائم رہنے کے لیے شہسواری اور صید افگنی ضرور تھی۔ چنانچہ بزرگ ان کے عربستان کے ریگستان سے اچھی اچھی نسلیں لائے۔ ایرانی اور تورانی گھوڑیوں سے انھیں پیوند دیا۔ یہاں کے سرسبز جنگلوں نے پال کر انھیں فربہ، توانا اور خوبصورت بنایا۔ تواریخ قدیمی کے افسانہ خواں جانتے ہیں کہ گھوڑوں نے بڑے بڑے وقتوں پر کام دیے ہیں اور آدمیوں کی طرح رفاقت و جاں نثاری کی ہے۔ اس لیے انھیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور ملک ایسا ہے کہ ہر شخص گھوڑا رکھ سکتا ہے۔ اسپ توسن سمند یگران ہیون تگاور بارہ بارگی خنگی وغیرہ اس کے بہت نام ہیں۔ صبار فتار، بادپا، دشت پیما، صحرانورد، ہاموں نورد وغیرہ وغیرہ بیسیوں صفتیں خوشنما اور خوش آئندہ نکالی ہیں۔ پیار کے مارے ہر شخص اپنے اپنے گھوڑے کے پیارے پیارے نام رکھتا تھا۔ رستم کا رخش۔ خسرو اور شیریں کا شبدیز و گلگوں تھا اور ان کے علاوہ اکثر شیریں، ہمدم، پرند، عقاب، ترنج، غیرہ وغیرہ نام رکھتے ہیں۔ اب تک ناصرالدین شاہ بادشاہ کے ایک ایک گھوڑے کا نام الگ الگ ہے۔ ازانجملہ صباح الخیر ہے کہ سفر یورپ میں ساتھ تھا۔

گھوڑے ہمیشہ ان کے پیش نظر ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بہت سی اصطلاحیں انشاپردازی میں ان کے متعلق پیدا ہو گئی ہیں۔ کوئی شخص بہت بک رہا ہو تو مردِ ظریف کہے گا "ساعتے لگامش بدہید۔ اندکے لگامش بکشید" (تا ازیں ہرزہ دوی باز ایستد)۔ کسی کی یاوہ گوئی کا اشارہ کرنا ہو تو کہتے ہیں۔ آب بے افسار میخورد۔ (رُکتا نہیں برابر بکے چلا جاتا ہے) اکنوں توسن فکر راعناں می کشم (بہت لکھا اب لکھنا موقوف کرتا ہوں) ناچار دریں وادی عنان افگندم۔ اور

فرس افگندم (یہ کام شروع کیا۔ یا اس مطلب پر لکھنا شروع کیا) اور ازیں وادی عنان را بر می تابم۔ یعنی دوسرا مطلب شروع کرتا ہوں۔

اس کے علاوہ گھوڑے کے دوڑانے اور تیز کرنے اور روکنے اور آہستہ اور تیز چلانے کے لیے بہت سی اصطلاحیں نکالی ہیں۔ مثلاً عنان فگندن۔ عنان سبک کردن۔ عنان کشیدن۔ عنان گرم کردن اور عنان در عنان تاختن (برابر برابر) اور عنان گرفتن۔ کسی کو جانے سے روکنا۔ عنان گستہ میرود (بگٹوٹ جاتا ہے) اور بر خلاف اس کے لنگ لنگان دنبالش میروم اور خوش لگام، بدلگام وغیرہ بہت سے اوصاف ہیں کہاں تک لکھوں۔

گھوڑے کے اوصاف اور لوازم ہمیشہ پھرتی، جوش ہمت کے موقع پر استعارہ کیے جاتے ہیں۔ توسنِ فکر، کمیتِ خامہ، توسنِ اندیشہ، عنان عقل، توسنِ قلم۔، یگران قلم، یگران اقبال، توسن روزگار، توسن گردوں، ابلق ایام، سر خنگ افلاک اور کہتے ہیں۔ عنانِ صبر از دست برفت وغیرہ وغیرہ۔

اہلِ ایران اب تک ان کی نسلوں میں احتیاط کرتے ہیں۔ گھوڑوں کے نسب نامے لکھے ہوئے ساتھ رہتے ہیں۔ شہسواری کا یہ رنگ ہے کہ ہرن کے پیچھے گھوڑا اڈالتے ہیں اور بگٹوٹ دوڑاتے ہیں۔ سو دو سو قدم رہتا ہے تو گھوڑے کو اس طرح دباکر ڈپٹتے ہیں کہ زمین سے وصل ہو کر ہرن کے برابر جا نکلتا ہے۔ اُس وقت آپ جھک کر ہرن کی ٹانگ، سینگ جو ہاتھ آئے پکڑ لیتے ہیں اور الگ اٹھالے جاتے ہیں۔

مالکم صاحب سفارتِ ایران پر گئے تھے۔ لکھتے ہیں کہ میں سیر و سفر کے عالم میں ایک مرغزار پر گزرا۔ سیہ چادریں ڈالے لوگ پڑے تھے۔ ایک عورت ہمیں دیکھ کر رستہ میں آکھڑی ہوئی۔ میرے ساتھ چند شرفا تھے۔ ایک نے اس سے پوچھا۔ باجی! شویت کجاست؟ اس نے کہا بہ شکار رفتہ۔ ایک 9 10 برس کی لڑکی بھی اس کے برابر کھڑی تھی۔ ہم نے پوچھا کہ ایں کیست؟ عورت نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا "دختر من است۔" ہم نے کہا۔ "خدا پسرے دِلاورت بدہد کہ برادر ایں دختر باشد۔" عورت مسکرائی۔ پاس ہی اس کی سیہ چادر تھی۔ وہاں اس کا گھوڑا بندھا تھا۔ اُسے جا کر لگام دی اور ننگی پیٹھ لے آئی۔ بیٹی کو اشارہ کیا۔ لڑکی جھٹ لپک کر سوار ہوئی۔ ادھر اُدھر دو تین کاوے دیے۔ سامنے ایک اونچا سا ٹیلا تھا کہ پتھروں سے سنگلاخ ہو رہا تھا۔ سرپٹ دوڑا کر اس پر چڑھ گئی۔ چوٹی پر پہنچی تو چلا کر للکاری۔ ایک ہاتھ اونچا کیا

اور بالکل نڈر، بے خطر پھر اسی طرح دوڑائے چلی آئی۔

یہ سب لوگ حقیقت میں لٹیرے راہزن ہیں اور اسی کو فخر سمجھتے ہیں۔ آج کل کہ انتظام درست ہے۔ بڈھے بڈھے مغل مل کر بیٹھتے ہیں۔ چائیں پیتے جاتے ہیں، حقے اڑاتے ہیں، اگلے زمانوں کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اے آغا! وقت وقتے بود کہ ہر کس شمشیرے در کمر، خونے در جگر، اسپے بزیر ران داشت۔ البتہ میتوانست پارۂ از عمر بآرام بسر برد۔ ایں زندگی نیست، رسوائیست، موت بہزار درجہ بہتر است ازیں زندگی۔

ان کی گزران سفری اور کاموں کی رواروی سے اکثر الفاظ خبر دیتے ہیں مثلاً 'اُجاغ' ترکی میں چولہے کو کہتے ہیں۔ اُچ = 3 + اَیاغ = پا یعنی سہ پایہ۔ تم بھی سمجھتے ہو۔ اَیسا چوٹھا اکثر ضرورت وقتی کے لیے بناتے ہیں کہ پکایا، کھایا اور روانہ۔ ہمارے تمھارے چولھے ایسے نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی گزران ہمیشہ اُن سے اجاغ بنواتی تھی۔ اب گھروں کے چولھوں کو بھی اجاغ کہتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ محاورہ میں 'اجاغ زادہ' خاندانی اشراف کو کہتے ہیں۔

'عالم آرائے عباسی' میں اکثر نمکخواران دولت کے لیے لکھا ہے۔ فلانی کہ از زلّہ خواران اُجاغ ایں دولت است بداں خدمت اعزاز یافت۔

ان لوگوں کو بہت سے لوٹ مار کے کارنامے اپنے بزرگوں کے یاد ہیں۔ وہ فخریہ بیان کیا کرتے ہیں اور کوئی کہتا ہو تو نہایت اشتیاق سے سنتے ہیں۔

فتح علی شاہ (بادشاہِ حال کے دادا) کا زمانہ تھا کہ وزیر مختار دولت فرنگ کا سیاحت کو اٹھا۔ منزل بہ منزل سیر کرتا ہوا جاتا تھا۔ وزیر مختار کی اردلی میں ایک دستہ اپنے سواروں کا رہتا ہے وہ بھی ساتھ تھا۔ اس دستہ کے سوار لُرستان کے رہنے والے 'فیلی' اور 'لک' بیاباں گرد قبیلوں کے لوگ تھے۔ صاحب نے انھیں قواعد سکھائی تھی۔ ان کی وردی یکساں، گھوڑوں کی زین، ساز و یراق سب یکساں۔ سوار قواعد کے پابند، چپ چاپ، بُت بنے چلے جاتے تھے۔ گھوڑے بھی برابر قدم ملائے تھے۔ ساتھ ایک شاہی سردار تھا۔ اُس کے رفیق اور نوکر چاکر بھی ہمراہ تھے۔ یہ بھی اور رستہ کے لوگ بھی دستہ مذکور کی حالت کو چشمِ تعجب سے دیکھتے تھے۔ سردار شاہی مصاحبوں میں بموجب رسم کے ایک مسخرہ بھی تھا۔ رستہ میں صاحب اس سے باتیں کر کے دل خوش کرتے جاتے تھے۔ ایک گانو کے پاس کو گزرے۔ لوگ آبادی سے نکلے اور تماشا

دیکھنے کو آن کھڑے ہوئے۔ مسخرے نے صاحب سے سواروں کی تعلیم کی بہت تعریف کی۔ پھر پوچھا کہ انھیں کتنی مدت میں قواعد سکھائی ہوگی؟ صاحب نے کہا کہ فقط 6 مہینے میں۔ اس نے کہا کہ یہ 6 مہینے کی محنت کہو تو ایک دم میں برباد کردوں! صاحب نے کہا کیونکر؟ وہ جھٹ گھوڑا اڑا کر چلا۔ برابر میں ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا، زمزمہ کی آواز لگاتا ہوا اُس پر چڑھ گیا۔ اکثروں کے خیال اُدھر متوجہ ہوئے۔ جب دستہ مذکور ٹیلے کے برابر میں آیا۔ مسخرہ نے ایک ہاتھ اٹھایا اور اپنی آہنگ ایرانی میں لہکار کر کہا :

اے جوانانِ کرستاں! بشنوید از من کہ من یاد دارم داستانہا از نیاگانِ شما

بزرگوں کی مردانگی کا نام سن کر سب کے کان کھڑے ہوئے۔ اُس نے دوبارہ پڑھا۔ یا تو سب برابر باقواعد چلے جاتے تھے، یا قواعد کو چھوڑ، صفوں کو توڑ پھوڑ، سب کے سب گھوڑے مار کر اُدھر بھاگے کہ دیکھیں ہمارے بزرگوں کی کیا داستانیں سناتا ہے۔ دوسری طرف سے گانٔو والے دوڑے۔ مسخرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہر شخص پاس کھڑا ہونا چاہتا تھا کہ اچھی طرح سن سکے اور اسی واسطے ایک دوسرے سے آگے بڑھا جاتا تھا۔ ولایتی گھوڑے سرشور۔ سیکڑوں باچھیاں چلنے لگیں۔ سوار گر گر پڑے۔ گھوڑے چُھٹ چُھٹ گئے۔ تماشائیوں نے مفت چوٹیں کھائیں۔ عجب ہنگامہ ہوا۔ صاحب بچارے حیران کھڑے دیکھتے تھے کہ یہ کیا ہوگیا۔ مسخرا پھر ہنستا ہوا آیا اور کہا کہ صاحب! دیکھا۔ یہ شعر وہ افسوں ہے کہ نادر کے بعد جب ملک میں بدعملی ہوئی تو ایک شخص چند رفیق اور کئی گویّے ساتھ لے کر ایلیات میں گیا۔ اس کی برکت سے 15 ہزار آدمی جمع کر لیے اور کئی ہفتہ تک بادشاہ بنا رہا۔

قجر کے خاندان میں اب تک آباواجداد کی بہت باتیں سخت استقلال سے برقرار ہیں۔ آزاد کو ان میں سے ایک بات پسند آئی۔ محمد حسن خاں نے (کہ فتح علی شاہ یعنی بادشاہ حال کے دادا کا دادا تھا) ایک موقع پر قبائل صحرانشین میں پناہ لی تھی۔ ایک قبیلہ کے سردار نے اسے اپنی بیٹی دینی چاہی۔ خان مرحوم نے انکار کیا اور کہا۔ اس لڑکی کی طبیعت ایسی نہ ہوگی جس کے بیٹے تخت و تاج کے دعوے پر جان قربان کر دیں۔

ایران کا ایلچی ایک دفعہ ہندستان کی طرف آیا۔ اُس کے پیش خدمتوں میں ایسے ایسے کئی شخص تھے۔ ایک ان میں بہت خوش مزاج تھا۔ ایک صاحب نے اُس سے پوچھا کہ "چہ طور یافتی شہر کلکتہ را" ہنس کر کہا کہ "عجب جائیست برائے چپاد" مگر خوبی یہ ہے کہ چوری کو سخت عیب

سمجھتے ہیں۔ کوئی خون کر کے آیا ہو اور ان کی سیہ چادر پر آ کھڑا ہو۔ اس کی حفاظت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ حاکم خود چڑھ آئے تو اسے دھکّے دے کر نکال دیتے ہیں۔ وہ حاکم کی سزا کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ مائیں بچپن میں بچّوں کو خواہ مخواہ سونٹے مارتی ہیں کہ بڑے ہو کر پٹنے کی عادت رہے۔

باہمی مقدمات کا فیصلہ تانجوت (پنچایت) سے کرتے ہیں۔ 'ریش سفید' صدر انجمن یعنی سرپنچ ہوتا ہے۔ جو فیصلہ اس کے سامنے ہو جائے ردّ نہیں ہو سکتا۔ قبیلہ کی امارت خاندان سے باہر نہیں نکلنے پاتی۔ امیر مر جائے اور چھوٹے سے بچّے کا بھی کہیں پتہ لگ جائے تو وہیں سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ اپنے جنگل پہاڑوں میں لے جاتے ہیں اور ہاتھ چوم کر امیر بناتے ہیں۔ اپنے امیر کے نام پر مال تو کیا جان تک دریغ نہیں کرتے۔ بادشاہ کے لیے جمعیت کی ضرورت ہو تو اس طرح جان توڑ کر جمع نہیں ہوتے، امیر پر وقت آ بنے تو پَل کے پَل میں چادر بچادر۔ پہاڑ پہاڑ اور جنگل جنگل حکم پہنچ جاتا ہے اور سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ طرفدار بمعنی سپہ سالار یا بادشاہ ہو گیا ہے (دارندۂ طرف) اپنے امیر کے مرنے کا بڑا ماتم کرتے ہیں۔ اس کے گھوڑے کو سجاتے ہیں، اُس کی ٹوپی زین کے ہرنے پر رکھتے ہیں۔ دونوں طرف دونوں موزے۔ ایک طرف سپر ایک طرف تلوار لٹکاتے ہیں۔ کمر پٹکا اس کے گلے میں لپیٹتے ہیں۔ اُس کی دُم کتر دیتے ہیں اور جنازہ کے ساتھ ساتھ گرد چکّر دیتے ہوئے لیے چلتے ہیں۔ آپ گریباں چاک، ننگے سر، راکھ منہ پر ملے، روتے پیٹتے جاتے ہیں۔ اُس کے دوست بھی اپنے اپنے گھوڑے (کہ ان پر بھی ہتھیار دھرے ہوتے ہیں) اعزاز و احترام کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ یہ ایک عجیب وقت اور پُر تاثیر حالت ہوتی ہے۔ راہ چلتے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں اور دیکھ کر رونے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدیم رسم ہے۔ ماوراء النہر کے ترکانِ صحرانشیں میں بھی یہی دستور ہے۔ فردوسی نے جہاں سہراب کا جنازہ اٹھایا ہے وہاں بھی یہی سامان درست کیا ہے:

بُریدہ دُمِ باد پایاں ہزار پُر از خاک سر مہتراں نامدار
بریدہ سمند سر افراز دم دریدہ ہمہ کوس روئینہ خُم
سپہ پیش تابوت میر اندند بزرگاں بسر خاک بفشاندند
تہمتن پیادہ ہمیں رفت پیش دریدہ ہمہ جامہ دل کردہ ریش
کشادند گرداں سراسر کمر ہمہ پیش تابوت پُر خاک سر

ہمہ رُخ کبود و ہمہ جامہ چاک   بسر بر فشاندہ بریں سوک خاک

عزیزانِ وطن! فارس کی انشا پردازی تمھیں خبر دیتی ہے کہ میرے ملک میں تجارت کو عمدہ ذریعہ زندگی کا سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ نظم و نثر میں سفر، کاروان، گردِ کاروان، رباط، سرائے، مہماں سرائے، خر، پالان، خرِ لنگ، پشت، ریش، شتر، کجاوہ، محمل، دشت، کوہ، گردِ راہ، منزل وغیرہ کے صدہا استعارے نظر آتے ہیں اور ان الفاظ سے عمدہ مضامین پیدا کرتے ہیں :

دلم ز سینہ بروں رفت و داغ او باقیست   چنانکہ ماند بر جاے کارواں آتش

زبان مذکور آگاہ کرتی ہے کہ زراعت بھی وہاں عمدہ ذریعہ گزارہ کا ہے اور نمونہ اس کا الفاظِ باغ، کشت، دہقان، روستائی، خرمن، تخم، جو، گندم، آب، آبیاری، شبان، گلہ، گرگ، گوسپند، وغیرہ وغیرہ کے استعارے ان کی انشا پردازی میں دکھاتے ہیں :

پیشہ کشاورزی و سوداگری   باز فقیری پس ازاں چاکری

اس سلسلہ میں خواجہ حافظ کا مطلع لکھے بغیر مجھ سے رہا نہیں جاتا :

مزرعِ سبز فلک دیدم و داس مہ نو   یادم از کشتۂ خویش آمد ہنگام درو

اس زمین میں فیضی سے بہتر میں نے نہیں سنا کہ کسی نے مطلع لکھا ہو :

مشتے از جو بکف آریم و بکاریم ز نو   انچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو

جب ان جنگلوں سے کہ خدائی گلزار ہیں آبادیوں کی طرف آؤ تو رستہ میں 4 4 5 5 کوس پر پاؤ گے کہ صفوی سلاطین کی تعمیری سرائیں اور رباطیں اُن کی نیتوں پر آب حیات چھڑک رہی ہیں اور بڑے بڑے شہروں میں دور سے اونچی اونچی عمارتیں بزرگانِ عجم کے ناموں کو بلند کرتی ہیں۔

بازار یہاں وہاں یکساں ہیں مگر اکثر جگہ زانو زانو برف پڑ جاتی ہے اس لیے شہروں میں بازاروں کو لداؤ کی چھتوں سے پاٹتے ہیں۔ شاہجہاں کے زمانے میں جب علی مردان خاں حاکم قندھار ایران سے منحرف ہو کر ادھر آگیا تو سر دملک کا رہنے والا سمجھ کر اوّل اوّل اسے شاہجہاں نے کبھی کشمیر کبھی کابل میں رکھا۔ کابل اور پشاور میں پٹے ہوئے بازار اس نے بنوائے اور یہ بازار بغدادی کہلائے کہ بغداد کے نمونے پر بنوائے تھے۔ کابل میں اب تک بازار چار چھتہ اس کی یادگار باقی ہے۔ پیشاور میں گردشِ فلک سے مٹ گئے۔

بازاروں کے ذکر میں یہ بات اہلِ وطن کو جتانے کے قابل ہے کہ خراسان اور

ترکستان کے گاؤ گاؤ میں ہفتہ بہ ہفتہ۔ یا ہفتہ میں دو دفعہ بازار لگتا ہے۔ چوکوسی پنج کوسی گاؤ کے لوگ کوئی گھوڑے پر، کوئی گدھے پر، کوئی پیادہ اندھیرے منہ گھروں سے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ ان میں ہر قسم اور ہر پیشہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ 8 9 بجے تک وہاں آن پہنچتے ہیں۔ ادھر سے گاؤ کا بچہ بچہ بلکہ عورتیں بھی برقع اوڑھ اوڑھ کر نکلتی ہیں۔ اپنا اپنا مال دیتے ہیں۔ مبادلہ میں اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لے جاتے ہیں۔ گھوڑا، گدھا، گائے، بھینس، بکری، دُنبہ، مرغی، انڈے تک موجود ہوتے ہیں۔ بڑھئی جلاہا درزی تیلی وغیرہ وغیرہ ہر قسم کا پیشہ ور اپنی چیزیں لاتا ہے۔ باغ اور سردرختی والے اپنے میوے۔ زمیندار اپنے غلے بلکہ ان کا بھس تک لے آتے ہیں۔ گاؤ کی عورتیں اپنا کاتا ہوا سوت، سی ہوئی ٹوپیاں لے نکلتی ہیں اور خدا کی شان ہے کہ کوئی کمبخت ہی ہو گا جو ناکام پھر کر جاتا ہو گا۔ یہی سبب ہے کہ تجارت کو بہت رواج ہے۔ مگر ثابت ہوتا ہے کہ روپیہ کی کمی ہے۔ انشا پردازی کے خزانچی کو یہاں سے یہ بات گرہ میں باندھنی چاہیے کہ یہ مقام، آبادیِ قصبہ کے باہر لیکن آبادی سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ رات کو دیکھو تو کتا بھی نہیں، دن کو دیکھو تو جنگل میں منگل ہو گیا۔ پھر شام کو دیکھو آدم زاد کا پتہ نہیں۔ جا بجا راکھ کے ڈھیر ہیں اور میووٗں کے چھلکے۔ مصطلحات میں لکھا ہے "بازارگاہ قطعہ زمینے کہ در آں بازار واقع شود۔ از عالم بزمگاہ و مجلس گاہ۔" میں کہتا ہوں کہ بازارگاہ سے حقیقت میں وہی بازار مراد ہے جنھوں نے ان بازاروں میں لین دین کیا ہے وہ نہ لفظ گاہ کی زیادتی کی فکر کریں گے، نہ تاویل کے محتاج ہوں گے۔ صاحب مصطلحات اصلیت حال سے واقف نہیں ورنہ 'واقع' کا لفظ نہ لکھتا۔ فقط اتنا ہی کافی تھا کہ "قطعہ زمینے کہ در آں بازار شود۔"

بازار کے دن ایک شخص اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ سامنے سے کوئی آتا ہوا ملتا ہے اُس سے پوچھتا ہے۔ چہ خبر است از بازار؟ کبھی وہ کہتا ہے بروید کہ گرم است۔ کبھی دیر ہو جاتی ہے تو کہتا ہے کہ نزدیک است بہ شکستن۔ کبھی کہتا ہے نروید کہ بازار شکست۔ یہیں سے نکلی ہے گرم بازاری (کسی شے کا رواجِ کار)۔ اسی طرح بازار فلاں چیز تیز است اور اس کے برخلاف یہ کہ بازار فلاں چیز سرد است۔ اسی سے ہے بازار نہادن، بازار زدن، بازار کشیدن، بازار آراستن کہ سب ہم معنی ہیں۔ بازار زدہ، جس چیز کو دوبارہ بازار میں لے گئے ہوں اور کوئی خریدار نہ ہوا ہو۔ بازار برچیدن؛ اپنا کاروبار اٹھالینا۔ بازار کردن؛ کسی قسم کا معاملہ یا گفتگو درمیانی لانی۔ اہل زبان کہتا ہے؛ امروز بہ فلانی برخوردیم۔ طرفہ بازارے کردیما۔

قومی عادت اور ملک کی حالت نے اب تک سب کو سپاہیانہ سامان میں رکھا ہے۔ اس لیے ہر شخص ہتھیار بند رہتا ہے۔ ایک درزی اپنے گھر میں یا دُکان پر بیٹھا کپڑے سیتا ہوگا مگر سپر تلوار، پیش قبض، طپنچہ سامنے کھونٹی پر لٹکتا ہوگا۔ یہ خیالات ان کے دماغوں میں ایسے سمائے ہیں کہ جنگی داستانوں کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ کوئی تھوڑا سا پڑھا لکھا بھی ہوگا تو شاہنامہ کے شعر اسے جابجا سے حفظ ہوں گے۔ سبب یہ ہے کہ جب چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں تو ایک شخص شاہنامہ ضرور پڑھتا ہے۔ سب سنتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہتھیاروں اور جنگی استعاروں میں اکثر خیالات ادا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بچّوں کے ہاتھوں میں مہندی لگاتے ہیں تو اس میں تیر کمان کے نقش بناتے ہیں اور تیروں سے فالیں دیکھتے ہیں۔ تیر اَمان بھاگے ہوئے مجرم کے لیے جب قتل کا حکم دیا ہوا ہو اور وہ خود حاضر ہو کر امان حاصل کرلے تو اُسے بادشاہ اپنے ترکش سے ایک تیر دیتا تھا۔ اُس پر بادشاہ کا نام لکھا ہوتا تھا۔ مجرم اسے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ وہ تیرِ امان کہلاتا تھا کہ کوئی دیکھتے ہی نہ مار ڈالے۔ بہت قسم کے تیر ہیں اور ان کے بہت نام ہیں۔ اس سے بہت سی اصطلاحیں نکالی ہیں۔ تیر آہ اور تیر تظلّم اور تیر سحر (آہِ پُر اثر)۔ تیر باران سے کثرت مراد رکھی ہے اور اس طرح کی اصطلاحیں بہت ہیں۔

اسی طرح پانی میں شمشیرِ موج اور پہاڑ پر تیغِ کوہ اور تیزیِ کوہ اور تیغ خورشید یعنی طلوع صبح۔ تیغ افراسیاب، تیغ بہرام اور تیغ فلک (شعاعِ آفتاب) تیغ شدن (مقابل ہونا)۔ تیغش می بُرد (اس کا کام بنا ہوا ہے)۔ دیدم تیغم نمی بُرد (میری کوشش میں اثر نہیں) بینم شمشیرت تاکجا می بُرد (دیکھیں تمھاری کوشش کہاں تک کام کرتی ہے۔ تیغ بخاک کردن (خونریزی کو موقوف کرنا) کیونکہ شائقانِ شکار کا دستور تھا کہ جب ہزار شکار مار لیتے تھے تو تلوار کو خاک پر رکھ دیتے تھے (کہ اب شکار موقوف)۔ آنکھ کو ترکِ چشم اور نظر کو ترکِ نگاہ وغیرہ وغیرہ۔

ایران کے بازاروں میں اور اکثر قہوہ خانوں میں ایک شخص نظر آئے گا کہ سروقد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اور لوگوں کا انبوہ اپنے ذوق شوق میں مست اُسے گھیرے ہوئے ہے۔ وہ ہر مطلب کو نہایت فصاحت کے ساتھ نظم و نثر سے مرصّع کرتا ہے اور صورتِ ماجرا کو اس تاثیر سے ادا کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے۔ کبھی ہتھیار بھی سجے ہوتا ہے۔ جنگ کے معرکہ یا غصہ کے موقع پر شیر کی طرح بِکھر کھڑا ہوتا ہے۔ خوشی کی جگہ اس طرح گاتا ہے کہ سننے والے وجد کرتے ہیں۔ غرض کہ غیظ و غضب، عیش و طرب یا غم و الم کی تصویر فقط اپنے کلام سے نہیں کھینچتا

بلکہ خوداس کی تصویر بن جاتا ہے۔ اسے حقیقت میں بڑا صاحبِ کمال سمجھنا چاہیے کیونکہ اکیلا آدمی اُن مختلف کاموں کو پورا پورا ادا کرتا ہے جو کہ تھیٹر میں ایک سنگت کر سکتی ہے۔

اُمرا اور اہلِ دول کے مکانات کیا تعمیر اور کیا سامان میں رنگ رنگ کے تکلفوں سے سجے ہوتے ہیں۔ آبِ جاری تو گھر گھر میں خدائی رحمت ہے۔ خانہ باغ اُس میں نہر جاری۔ نہر میں فوارے جاری۔ مکان کی طرح ایسے انداز سے رکھتے ہیں کہ جاڑے میں ٹھنڈی ہوا سے محفوظ رہیں۔ بہار یا گرمی میں ہر طرف سے ہَوا کا لطف لے سکیں۔ بادگیر اکثر مکانوں میں ہیں اور روشن دان بغیر کوئی گھر نہیں۔ امرا کے مکانوں میں اور حماموں میں عہد قدیم کے بادشاہوں کی اور ان کے درباروں کی اور ان کے مشہور مشہور معرکوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ جن کا دیکھنا ہر وقت انقلابِ زمانہ کی تصویر پیش نظر رکھتا ہے۔ بابر جب بدیع الزمان میرزا سے ملنے ہرات میں گیا تو اپنی توزک میں اس کے مکان کی موزونیت اور ایجاد اور آرائشوں کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر مکان میں زمانِ قدیم کی سرگزشتوں اور معرکوں کی تصویریں اُن کے عہدوں کی یاد کو تازہ کرتی تھیں اور یہ رسم نئی نہیں، عہدِ قدیم کا قانون ہے۔ چنانچہ قصر شیریں اور کوہِ بے ستون اور سلاطین سلف کی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں اس کی گواہی دیتی ہیں۔ فردوسی نے ایک قطعہ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ مگر جزِ اعظم اس کی خوبی کا، اشارہ اس نکتے کا ہے :

فلک گر بزیر سحاب اندر است — دگر زیر پرِّ عقاب اندر است

مپندار کو از پئے کارِ تو — بہ بندِ خطاؤ ثواب اندر است

اگر بد کنی کیفر خود بری — نہ چشمِ زمانہ بخواب اندر است

در ایوان ہانام بیژن ہنوز — بزندان افراسیاب اندر است

چو بیژن داری اندر چہ مخسپ افراسیاب آسا — کہ رستم در کمین است و نہنگے زیر خفتانش

(خاقانی)

اُن کی مہمان نوازی جس پر غیر ملکوں کی تاریخوں اور جغرافیوں نے محضر شہادت لکھے۔ انشا پردازی کی گواہی اُس میں سب سے روشن ہے۔ فردوسی نے اکثر ایرانیوں کو مسافرت کی داستانوں میں جہاں اتارا ہے، پہلے دستر خوان پر بٹھایا ہے۔ اسی طرح نظامی و جامی وغیرہ شعرا نے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شیخ سعدی نے گلستاں میں ایک بادشاہ کو بحلت شکار سرگرداں کیا۔

رات کو کسی زمیندار کے گھر پہنچایا ہے۔ وہاں پہلی بات یہی ہے۔ ماحضرے کہ داشت حاضر آورد۔ ملا حسین واعظ کو دیکھو کہ انوار سہیلی میں جانوروں کی کہانیاں ہیں۔ ان میں اگر ایک چوہے کو کوے کے گھر مہمان لے جاتے ہیں، وہاں بھی پہلے ضیافت کھلاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضیافت، ملک کی عام رسم اور ایک معمولی بات ہے۔ اس لیے بات کہنے والا جب اس موقع پر آتا ہے خواہ مخواہ دستر خوان کا ذکر زبان پر آجاتا ہے۔ دیکھو امیر خسرو کیا مزہ سے کہتے ہیں :

اشکم بروں می افگند رازِ درونِ پردہ را
آرے شکا۔نہا بود مہمانِ بیروں کردہ را

یہی سبب ہے کہ جو شخص ان کے گھر آئے اسے تعظیمی لفظ سے تعبیر کیا ہے (یعنی مہمان) اور صاحب خانہ کا نام رکھا ہے میزبان[1]۔ گویا فرض اصلی کا دستر خوان سجانا ہے۔

اہلِ ایران اب بھی مہمان کا آنا برکتِ الٰہی سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مسافرت اُس ملک میں خوب نبھتی ہے۔ ان کے گھروں کی تعمیر کہتی ہے کہ بننے سے پہلے مجھ میں مہمانداری کی غرض مدِ نظر رکھی ہے۔ ذرا آسودہ حال ہو گا تو باہر دیوان خانہ مع خانہ باغ کے ہو گا۔ جس کے حوض میں فوارہ بھی چھٹتا ہو گا۔ اس سے اتر تا غریب ہو گا تو ڈیوہڑی سے ملے ایک دو حجرے اور اس کے آگے کچھ صحن ہو گا کہ مہمان کا اچھی طرح گزارہ ہو۔ دو تین کیاریاں پھولوں کی جن میں دوست آشناؤں کی ملاقات کا لطف حاصل ہو۔ اسے مہمان خانہ کہتے ہیں۔ کچھ نہیں تو گھر اس طرح کا ہو گا کہ جب کوئی آیا مستورات کو ایک طرف کر دیا۔ وہ وہاں اپنے سینے پرونے کا کام کرتی رہیں۔ یہ دوسرے کمرے میں بیٹھے۔ چائے پی، کھانا کھایا، باتیں کرتے رہے۔ جب وہ گیا تو پھر نکل بیٹھیں۔

اس مقام پر وہ الفاظ لکھتا ہوں جو مہمان اور صاحبِ خانہ کو ہمیشہ باہم کہنے پڑتے ہیں اور یہ گویا رسم ملکی میں داخل ہیں :

1۔ فارسی قدیم میں 'میز' دستر خوان کو کہتے تھے۔

صاحب خانہ

خوش آمدید۔ صفا آوردید۔ قدم بر چشم۔یا۔
خوش آمدید، خوش آمدید قدم شما بخیر۔یا۔
خوش آمدید، و صفا آوردید۔ قدم رنجہ فرمودید۔ بسیار خوب کردید کہ تشریف آوردید۔ شادماں کردید۔ مسرور کردید۔

مہمان کہتا ہے

عنایت شماست۔ مرحمت شماست۔ مدتے ست میخواستم مشرف خدمت شوم ولے بختِ نامساعد است کہ مانع شد۔

سرافراز کردہ اید۔ خیلے مشتاق دیدار شما بودم۔

از لطف شما۔ از مرحمت شما۔ از دولت شما۔ از محبت شما۔ از شفقت شما۔ سایہ شما از سر ما کم نہ شود۔ محبت شما زیاد۔ وغیرہ وغیرہ۔

احوالِ شما خوب است؟
مزاج مقدس؟ مزاج شریف؟
احوال شریف؟ وغیرہ وغیرہ

چلتے وقت مہمان کہتا ہے :

اجازت است؟ مرخص میشوم۔یا۔ دردِ سر کمتر میکنم۔یا۔ بسیار درد سر دادم۔ زحمت دادم۔

صاحبِ خانہ کہتا ہے

بایں زودی تشریف می برید؟ پس خدا حافظ مزیّن فرمودید۔ مشرف فرمودید۔یا فقط۔ مزیّن! مشرف! صفا آوردید۔ زحمت کشیدید۔ حقیقت کہ مجلس ما بے حضور شما صفائے نداشت۔

اتنی بات تو ان فقروں سے ہر شخص نے سمجھ لی ہوگی کہ صاحبِ خانہ کا دل مہمان کے آنے سے خوش ہوا جو یہ خوشی کے لفظ زبان سے نکلے لیکن دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ عرب کے گھر عرب آتا ہے تو صاحب خانہ کہتا ہے اَھلاً وَ سَھلاً۔ کبھی کہتا ہے کہ خیر مقدم خیر مقدم۔ پہلا فقرہ ظاہر کرتا ہے کہ سر زمین اس ملک کی دشوار گزار ہے۔ دوسرا فقرہ کہتا ہے کہ وہاں بھی مہمان کے آنے کو اچھا سمجھتے تھے۔

فارس میں مہمان آئے تو کہتے ہیں خوش آمدید صفا آوردید۔ معلوم ہوا کہ خوشی و خوش حالی اور شگفتگی اور جگہ کی صفائی زیبائی انھیں ہر وقت مدِ نظر ہے۔ سنسکرت میں کہتے ہیں۔ سُواگتو بھوان स्वागतो भवान् یعنی خوش آمدی۔ اس فقرہ نے پھر گواہی دی کہ دونوں کے خیال ایک اصل پر ہیں فقط زمانوں اور مکانوں کے انقلابوں نے لفظ بدل دیے ہیں۔

یہ گفتگو جو اوپر ہوئی فقط اوپری نہیں ہے۔ جب کسی کے گھر جاؤ کھانے کا وقت ہوگا تو بغیر کھانا کھائے ہرگز چھٹکارا نہیں۔ نہ کھاؤ تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص کسی معاملہ میں خفا ہے۔ اگر کھانے کا وقت نہیں تو غریب سے غریب آدمی بھی اوّل حقّہ سامنے رکھے گا۔ ایک روسی چائے دان میں چائے (اسے غوری کہتے ہیں) دو تین پیالیاں تشتریوں میں رکھی ہوں گی۔ کئی قسم کے میوؤں کے دو دو تین تین پھل ہوں گے۔ یہ سب سامان ایک کشتی میں لگائے گا۔ ایک پاکیزہ دستر خوان بچھائے گا۔ اپنی باسی روٹی کے کچھ ٹکڑے ایک دو کلچے رکھے گا۔ پہلے تمھیں کھلائے گا۔ پھر جو باتیں کرنی ہوں گی وہ ہوں گی۔

یہ دستر خوان بھی قابل دیکھنے کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہیں کی چھیٹ کے چھپے ہوتے ہیں مگر حاشیوں میں ایک دو حدیثیں تعظیم مہمان یا تعریف سخاوت کی۔ ایک دو فارسی کے فقرے۔ ایک دو شعر اسی مضمون کے مثلاً

شکر بجا آر کہ مہمان تو   روزیِ خود می خورد از خوانِ تو

کسی اور کا شعر ہے :

بر سرِ ہر دانہ بنوشتہ عیاں   کز فلاں ابنِ فلاں ابنِ فلاں

جب دوست سے دوست سر راہ مل جائے تو باہم بڑے تپاک سے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہے اور اسی طرح رخصت کے وقت۔ تم نے دیکھا ہوگا شیخ سعدی نے بھی 'گلستاں' میں جابجا لکھا ہے۔ بر سر و چشمش بوسہ داد۔ بر روئے ہم بوسہ دادیم و گفتیم۔ وغیرہ وغیرہ۔ فردوسی نے بھی کہا ہے :

بہ پدرود کردن گرفتش بہ بر   بسے بوسہ دادش بہ چشم و بہ سر

ان کے گھر پنجاب کے گھروں سے بالکل برخلاف ہیں۔ دہلی آگرہ اور لکھنؤ کے گھروں سے کچھ ملتے ہیں۔ سو اتنی بات میں کہ ہندستان میں ذرا صحن کی رسم ہے۔ اُس ولایت کے اشراف اگرچہ غریبی کی حالت میں ہوں مگر اتنا صحن ضرور رکھتے ہیں کہ دو دو تین تین درخت سیب بہی ناشپاتی انار انگور وغیرہ کے اور دو تین کیاریاں گلکاری کی ہوں۔ اس میں خانہ بخانہ نہر کا گزر ہوتا چلا آتا ہے کہ ہر چیز کی صفائی کا مطلب اچھی طرح حاصل ہوتا ہے۔ ہندستان کے گھروں میں دالانوں کے در کشادہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ انھیں کمروں کی طرح دروازوں سے قبضہ میں رکھتے ہیں کہ برف اور ہوا سے بچاؤ رہے۔ ان بند حجروں میں تابدان،

باد گیر، کھڑکیاں رکھتے ہیں۔ دیواروں میں بخاریاں آتشدان بناتے ہیں اور گرم جوشی میں کبھی جی چاہتا ہے تو چائے سے بڑھ کر پلاؤ بھی وہیں دم دے لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس قوم کے بزرگ اچھی طرح جانتے تھے کہ صحت، آرام اور سلیقہ کیا چیز ہے اور کیونکر اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

آداب محفل کے بہت سے قواعد اور اصول رکھے ہیں۔ مثلاً جب کوئی پانی پیے گا دوسرا آدمی کہے گا :

کہنے والا	پینے والا
سقاکم اللہ شراباً طہوراً۔ یا سقاکم اللہ۔ یا۔ ہنّاکم اللہ۔ یا۔ انشاء اللہ عافیت باشد۔ یا۔ عافیت باشد	خدا شما را بیامرزد۔ یاخدا والدین شما را بیامرزد۔ اگر کہنے والا بزرگ ہو اور پینے والا خورد تو جواب میں کہے گا۔ سلّمکم اللہ۔

محفل میں باادب بیٹھتے ہیں اور دوزانو بیٹھتے ہیں۔ کسی کو بٹھانا منظور ہو تو کہیں گے۔ بفرمائید۔ بسم اللہ بفرمائید۔ چائے یا شربت یا حقّہ وغیرہ کچھ کھانے پینے کو کہتے ہیں کہ میل بفرمائید۔ بفرمائید بسم اللہ۔ طرف ثانی کہتا ہے۔ بعداز شما۔ پھر کہتے ہیں نمیشود۔ یا کہتے ہیں۔ امکان ندارد۔ شما میل بفرمائید۔ طرف ثانی شکریہ میں کہتے ہیں۔ لطف شما زیاد۔ اگر کسی کو ایک لفافہ یا قلم بھی اس پہلو سے اُس تک اٹھا کر دو تو وہ لیتے وقت کہے گا۔ الطاف شما کم نشود۔ یا مرحمت شما کم نشود۔ اِن ادب آداب کے اصول و قواعد میں 70 برس کا بڈھا اور 7 برس کا بچّہ برابر ہوتا ہے۔

طبیعتیں عموماً لطافت اور ظرافت کے عنصروں سے بنی ہیں۔ اس لیے خوش پوشاکی اور نفاست کو تہذیب کا جُزِ اعظم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ کام کے وقت ادنیٰ مزدوروں سے زیادہ عرق ریزی کرتے ہیں اور جی توڑ کر کام کو لپٹ جاتے ہیں۔ مگر جہاں فارغ ہوئے اور نہا دھو کر کپڑے پہن عمامہ سر پر رکھا چغا یا عبا کندھے پر لی اور آغا صاحب بن کر بیٹھ گئے۔ حقّہ سامنے دھرا ہے، چائے دم ہورہی ہے، گرمجوشیوں سے جلسہ گرم ہے۔ غریب سے غریب آدمی ہوگا مگر جھاڑا بُہارا فرش کیا ہوا۔ ایک طرف قالین یا نہالچہ یا توشک سے نشست کی جگہ نمودار معلوم ہوتی ہے۔ طاقوں میں ایک ایک دو دو سیب، ناشپاتی، بہی کے دانے۔ ایک طاق میں چھوٹا سا گلدستہ۔ ایک کھونٹی پر انگور کا خوشہ بھی لٹکتا ہوگا۔ طاقوں میں فرش۔ آگے ننھے ننھے ریشمی جھالر ٹانکتے ہیں۔ بعض پر ننھے ننھے پردے لٹکتے ہیں اور ان میں ریشمی ڈورے بندھے ہیں۔ ان سب باتوں کی

نباہ کی صورت یہ ہے کہ صاحب خانہ اگر چار روز کا مزدور ہو، پھر بھی جب باہر سے آتا ہے۔ روٹی بازار سے لیتا آتا ہے۔ وہ ایسی ہوتی ہے کہ یہاں فرمائش سے نصیب نہیں ہوتی۔ دوسرے تیسرے دن کچھ میوہ بھی لاتا ہے۔ تازہ طاقوں میں رکھ دیتا ہے، باسی آپ کھاتا ہے، بی بی بچّوں کو کھلا دیتا ہے۔ بیبیوں کا پکانے میں کم وقت خرچ ہوتا ہے۔ سینے پرونے میں مزدوروں سے زیادہ کمائی کر لیتی ہیں۔ اسی واسطے جب دیکھو اس سجے ہوئے گھر میں بیگم بنی بیٹھی ہیں۔ آغا باہر سے آئے، بیوی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کپڑے اتروا کر کھونٹیوں پر ڈالے۔ حقّہ تازہ کیا ہوا تھا وہ بھرا۔ آفتابہ میں گرم پانی بھر دیا۔ انگیٹھی سامنے روشن تھی۔ چائے جوش دھر دیا۔ آغا ہاتھ منہ دھو، ترو تازہ ہو، ڈاڑھی میں کنگھی کر، تکیہ سے لگ بیٹھے۔ وہ بیٹھے حقّہ پیتے ہیں۔ بیوی سامنے بیٹھی سی رہی ہیں۔ چائے تیار ہوئی۔ جنابِ آغا نے پیالی بھری ایک بیوی کے سامنے رکھ دی۔ ایک آپ پی۔ کوئی بچّہ ہوا تو وہ پاس آبیٹھا۔ آپ کھایا، اُسے کھلایا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ دن بھر کی کلفت بھول گئے۔

وہ لوگ گھروں میں کھانا بہت کم پکاتے ہیں۔ بازار سے بھی لاتے ہیں اور اپنے تنوروں میں خمیری روٹیاں پکار کھتے ہیں۔ غلّے اور آب وہوا کی خوبی ہے کہ جوں جوں باسی ہوتی ہے اُور مزے کی ہوتی ہے اور کلّہ پائے کی تو جان ہے۔ بازاروں میں بھی رنگ برنگ کی روٹیاں قسم قسم کے کباب، کلّے پائے وغیرہ پکتے ہیں۔ اس میں خرچ کی بھی تخفیف رہتی ہے اور عورتوں کو اپنے دستکار ہاتھ اور قیمتی وقت چولھا پھونکنے میں نہیں لگانا پڑتا۔

رموزِ سخن کے پہچاننے والوں نے جان لیا کہ قوم کی زبان اس کی رسم ورواج سے کس طرح آگاہ کرتی ہے۔ اب یہ دیکھیں کہ وہ ان کے لباس کا انداز کیونکر دکھاتی ہے۔ کوہ بے ستون اور طاق بستان کی عمارتوں پر بادشاہی درباروں اور سواریوں کے مرقّع دیے ہیں۔ اُن میں نئی تراش کی ٹوپیاں اور خوشنما قبائیں نظر آتی ہیں اور تم خیال کرو تو ملک کی انشاپردازی ہمیں اس سے پہلے خبر دے چکی ہے۔ پھر دیکھو، کلہ دارِ ایران، خورشید کلاہِ ایران، کلہ دار توران، شاہ کجکلاہ حسن، کلاہِ خسروی، کلاہ تتری گواہ ہیں۔ ایسے مقاموں میں عمامہ یا دستار کہیں نہیں آیا۔

دیکھو! کلاہ کج نہادن، کلاہ بر ابرو شکستن، باد در کلاہ داشتن، کلاہ ہوا انداختن اور کلاہِ رعونت از سر نہاد۔ اور کلاہ ارادت بپائش نہاد اور ع

بازی چرخ بشکندش بیضہ در کلاہ

بہتیری اصطلاحیں آئی ہیں۔ عمامہ بہوا انداختن، دستار برابر و شکستن نہیں آیا۔

کلہ گوشہ بر آسمانِ بریں ہنوز از اردات سرش بر زمیں

دیکھنا عرفی نے تہنیت عید کے قصیدہ کو کیا شاندار مطلع سے تاج دیا ہے۔

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم گدا کلاہِ نمد کج نہاد و شہ و یہیم

تصاویر مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی قباؤں کے دامن بڑے ہوتے تھے۔ انشاپردازی نے بھی بجائے خود اس کا ذکر کیا ہے۔ عرفی کہتے ہیں :

کردہ از عرفاں لباس عجز را دامن دراز کوتہی در جیب عقل نکتہ داں انداختہ

دامن کشاں رفتن۔ فخر و ناز سے چلنا۔ شیخ علی حزیں فرماتے ہیں :

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گزشتی گو مشتِ خاک ماہم برباد رفتہ باشد

ظاہر ہے کہ جس کے دامن ہی نہ ہوں وہ 'دامن کشاں' کیونکر چلے گا۔ شیخ سعدی نے غضب کیا ہے۔ گفت اے درویش دامن بدار۔ گفت۔ دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔ جس نے ٹھنڈے ملکوں میں جاڑا گزارا ہو گا وہ جانے گا کہ 'پابدامن پیچیدن' میں کیا مزا ہے اور اُسی سے استعارہ نکالا۔ پابدامن صبر پیچید۔ بھلا کوٹ کے دامن میں پاؤں لپیٹ کر کیونکر بیٹھ سکتے ہیں۔ جس نے اس ملک میں گزران کی ہو گی وہی جانے گا کہ دامن بر آتش زدن سے آگ سلگانے کی اصطلاح کیونکر نکلی ہے اور اس کے لیے بڑا دامن کام دیتا ہے۔ یا چھوٹا۔ اگر بڑے دامن نہ ہوتے تو 'چراغ زیر دامن' کی اصطلاح کیونکر پیدا ہوتی۔

ملک کی زبان تمھیں یہ بھی آگاہ کرتی ہے کہ ان کی آستینیں کیسی ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ بڑی اور فراخ ہوتی تھیں۔ جبھی آستین افشاندن بمعنی رد کردن و انکار کردن آیا۔ آستین بہ چشم کشیدن۔ اشک بآستین پاک کردن اور آستین بر چراغ افشاندن۔ اس کا بجھانا اور 'یک آستین گل'۔ جتنے پھول آستین میں سمائیں، آستین برزدن۔ آستین چڑھانی۔ اگر آستینیں تنگ ہوتیں تو یہ محاورے اور اصطلاحیں کیونکر پیدا ہوتیں کہ بیسیوں ہیں اور کوتہ آستین برخلاف اس کے ہے۔ خواجہ حافظ :

بزیر دلق طمع کمندہا دارند درازدستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں

خسرو :

آہ ازیں طائفہ زرق ساز آستیِ کوتہ و دست دراز

دیکھو انشا پردازی نے لباس ملک پر کیونکر اشارہ کیا۔ اکثر امرا و شرفا کو دیکھا ہے کہ جب کسی عالم، حاجی، زائر، یا اہل ضرورت کو کچھ دیتے ہیں تو مصافحہ کے لیے اس سے ہاتھ ملاتے ہیں اور آستین کے پردہ میں جو دینا ہو دیدیتے ہیں تاکہ طرف ثانی شرمسار نہ ہو۔ سعدی:

بر د خواجہ کوتاہ کن دست آز چہ میبایدت آستین دراز

عورتوں کی پردہ داری کا وہاں یہ حال ہے کہ ہندستان کے لوگ برسوں اس ملک میں رہ کر آئے ہیں۔ شاید کبھی گلی کوچہ میں کوئی عورت منہ کھلی نظر آئی ہو گی۔ نقاب، برقع، موزے وغیرہ پہن کر اس طرح پھرتی ہیں کہ پائو کا ناخن اور پوست کا رنگ تک نہیں معلوم ہوتا۔ اس پاکیزہ رسم نے ان کے دلوں پر مستقل اثر کیا ہے۔ اگر اتفاقاً کسی کوچہ میں عورت سامنے آجائے اور کوئی شخص اس کی طرف دیکھنے لگے تو فوراً کہتی ہے۔ "چشمت کور شود بمادرت مے بنی یا بخواہرت؟ از خدا شرم نداری؟" برقع وہاں اسلام کے ساتھ آیا ہے اسی واسطے فارسی کا لفظ بھی اس کے لیے نہیں ہے۔ لفظ مذکور کی بدولت بہت سے لطیف استعارے کلام میں پیدا ہو گئے ہیں۔ مثلاً برقع حیا از رخ برانداختہ پیش آمد و گفت اور بہ بیان حال برقع از روئے معنی کشود۔ برخلاف اس کے رخ در پردۂ اختفا کشید وغیرہ وغیرہ اور گل برقع از رخ برگرفت اور سبزہ سر از برقع خاک بر آورد یعنی بہار آئی سبزہ نکلا اور پھول کھلے اور پنجہ خورشید برقع شب بردرید۔ یعنی سورج نکلا۔ وغیرہ وغیرہ۔

خصوصیاتِ ملک کے ذکر میں اگر وہاں کے حماموں کا ذکر نہ کیا تو کچھ کہا ہی نہیں۔ بڑے بڑے کمرہ در کمرہ اور حجرہ در حجرہ لداؤ کی عمارتیں، چونہ گچ کی دیواریں۔ زمین بھی اسی سے پختہ یا سلوں کا فرش۔ نامی بادشاہوں کے دربار اور ملاقاتوں کے جلسے۔ ان کے جنگی معرکے سب عالم تصویر میں عیاں ہوتے ہیں۔ 'بوستاں' میں شیطان کی تصویر اور شیطان کی گفتگو کی حکایت پڑھ کر میں حیران تھا۔ جب وہاں جابجا ایسی تصویریں دیکھیں، اُس حکایت کا مزا آگیا۔ حمام میں اکثر دوست آشنا مل کر جاتے ہیں۔ پہلے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ساوارچی چائے تیار لیے بیٹھا ہوتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر ایک حقّہ پیا۔ ایک ایک پیالی چائے کی پی۔ مزاج میں گرمی آئی۔ دوسرا کمرہ 'جامہ کن' کہلاتا ہے۔ وہاں جاکر کپڑے اتارے۔ ایک حقّہ اور پیا اور طبیعت گرمائی۔ پھر حمام کے کمرے میں داخل ہوئے۔ طبیعت میں عجیب فرحت اور مستی پیدا ہوتی ہے کہ بغیر شعر خوانی اور ترنم کے رہا نہیں جاتا۔ تماشا یہ ہے کہ ان کمروں میں معمولی آواز سے بھی باتیں کرو تو ایسی

گونجتی ہے کہ پہچانی نہیں جاتی۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ سکندر نامہ میں ع

سرودے بگرمابہ در گفتہ گیر

کا یہ مطلب ہے۔ ایک ایک آدمی کو کئی کئی حمامی لپٹ جاتے ہیں۔ کوئی پانی ڈالتا ہے۔ کوئی کیسہ کر کے ملتا ہے۔ کوئی مُشتمال کرتا ہے۔ کبھی بٹھا کر اور کبھی لٹا کر۔ کبھی دائیں کروٹ اور کبھی بائیں کروٹ۔ اِس اِس طرح کل کل دباتے ہیں کہ عمر بھر کی کلفتیں اتر جاتی ہیں۔ نہانے کے بھی کئی کئی کمرے ہوتے ہیں۔ سب میں ٹھنڈے اور گرم پانی کے حوض بھرے ہوئے۔ ہر کمرہ میں 5 5 6 6 آدمی بیٹھے نہارہے ہیں اور سب کے سر منڈے، گول گول، یکساں ہانڈیاں، عجب بہار دیتی ہیں۔ پہر بھر سے کم نہانے کا لطف نہیں۔ نکلتے ہیں تو پھر اسی طرح کمرہ بہ کمرہ ٹھہرتے ہوئے اور دم لیتے ہوئے نکلتے ہیں۔ دفعتاً نکلیں تو خدا جانے لقوہ، فالج، ذات الجنب، کیا بیماری ہو جائے۔ نکلتے ہوئے بھوک کا یہ زور ہوتا ہے کہ پیٹ میں آگ لگ اٹھتی ہے۔ وہیں کسی دُکان میں چلے گئے۔ روٹی، کلّے پائے، کباب، شبدیگ لے کر کھائی اور لمبی لمبی ڈاڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے گھر چلے آئے۔

جو سخن شناس دور دراز کے ملکوں میں قرائن کی دُوربین لگائے بیٹھے ہیں انھیں یہ الفاظ اور ان کی ہزاروں ترکیبیں دکھارہی ہیں کہ وہ ملک کیسا اور وہاں کی سر زمین کیسی ہے۔ کس قسم کی چیزوں کی وہاں بہتات ہے۔ کیسے اہلِ ملک ہیں جو کہ ان چیزوں سے ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ عاقلوں کو نکتہ کافی ہوتا ہے اس لیے جو کچھ لکھا گیا کم نہ ہوگا۔

ساتواں لکچر

ہر ایک سرزمین اور اُس کے موسموں کی بہار انشاپردازی پر کیا اثر کرتی ہے

عزیزانِ وطن! میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہر ایک انشاپردازی اپنے ملک کی سرزمین، آب و ہوا اور پیداواری بلکہ اس کے جغرافیہ کو آئینہ کی طرح دکھاتی ہے۔ کیونکہ جو چیزیں انشاپرداز کو آس پاس نظر آتی ہیں، انہی کو وہ ادائے مطلب کے سامان میں خرچ کرتا ہے۔

ایک خوش رنگ خیال ہے۔ ذرا غور کر کے دیکھو۔ ہر ملک میں جو رنگ رنگ کی اشیا، مختلف اجناس اور مخلوقات ہیں وہ حقیقت میں مختلف کیفیتیں ہیں کہ اس سرزمین کی طبیعت یا مزاج نے باہر نکالی ہیں۔ اسی طرح ہر ملک کی زبان ایک سرزمین ہے کہ بیان کو وہیں کے اجناس و اشیا کے استعاروں میں جلوہ دیتی ہے۔ دیکھو، جس طرح کسی سرزمین کی طبیعت مجبور ہے کہ قدرتی پیداواروں کو باہر نکالے بغیر نہیں رہ سکتی اسی طرح اس کی زبان کی طبیعت مجبور ہے کہ وہیں کے تشبیہ و استعاروں میں مطلب کو رنگ دیتی ہے۔ ہر سرزمین اپنی تاثیر میں مجبور ہے۔ اس کی زبان اپنی خاصیت میں مجبور ہے۔

اس خیال کو میری تقریر نے پیچیدہ کر دیا۔ اچھا اب یوں سمجھو کہ کسی ملک کا انشاپرداز جب کوئی مطلب بیان کرنے لگتا ہے تو وہاں کے اشیا و اجناس وغیرہ جو آس پاس، اِدھر اُدھر

سامنے ہیں وہ ہجوم کر کے اس کے دل و زبان پر اُمنڈ کر آتے ہیں اور مجبور کرتے ہیں کہ جو کہنا ہے ہمارے استعاروں اور ہماری ہی تشبیہوں میں ادا کرو۔ چنانچہ اسے مجال نہیں ہوتی بجز اس کے کہ انہی کو اپنے ادائے مطلب کا سامان بنائے۔ جب بیان میں صفائی کے ساتھ لطف آئے۔

لطیفہ۔ تین شخص ہم سفر تھے۔ سُنار۔ پنیر والا۔ نان بائی۔ شام کو ایک جگہ جنگل میں اترے۔ بستر ایسے مقام پر ہوئے کہ سامنے کوسوں تک کھلا میدان تھا۔ منہ ہاتھ دھوئے۔ کھانے کھائے۔ جب کچھ رات گئی، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی، دل شگفتہ ہوئے۔ 13-14 تاریخ تھی۔ چاند نے سامنے سے سر نکالا۔ سنار نے کہا۔ آہا کُندن ڈلک ڈلک کرتا ہے۔ ابھی کٹھالی سے نکالا ہے۔ پنیر والا بولا۔ ثابت چکتی ہے، ابھی چاقو تک نہیں چھوایا۔ نان بائی نے کہا۔ یہ تو میرے تنور سے پھڑ پھڑاتی روٹی نکلی ہے۔

دیکھو جو شخص جس جس حال میں تھا ویسے ہی خیال اس کے دل میں پیدا ہوئے :

گر خیالت گلشن است تو گلشنی　　　　در خیالت گلخن است تو گلخنی

ہر ایک ملک کی سرزمین میں اکثر پیداواریں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے دوسرا ملک محروم ہے۔ اسی واسطے ہر ایک زبان میں ادائے خیالات کے انداز جُدا جُدا ہوتے ہیں۔ بلکہ اشیائے مذکورہ صاحب زبان کو مجبور کرتی ہیں اور اپنے ہی خیالات زبان پر لاتی ہیں۔ اکثر چیزیں دوسرے ملکوں میں مشترک ہیں اس لیے اکثر خیالات بھی مشترک ہیں۔ بعض ایسے خیالات ہیں کہ غیر ملکوں سے آئے ہیں مگر اپنی خوبی یا دوسری قوم کے شدّت ارتباط سے زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔

بہر حال مناسب ہے کہ آج فارس کی ملکی حالت بیان کروں اور دکھاؤں کہ یہ خیالات، یہ ترکیبیں، یا اصطلاحیں یا محاورے جو اُس کی انشا پردازی میں ہیں، کیونکر اپنے قدرتی زور سے انشا پرداز کی زبان پر آئے ہیں اور ان کی نزاکت، لطافت اور رنگینی جو اور زبانوں سے سفید و سیاہ کا امتیاز رکھتی ہے، یہ حقیقت میں اصل سرزمین کی حالت اور اس کی لطافت اور نفاست کا نقشہ کھینچتی ہے۔

عرب کا ملک ریگستان اور کوہستان ہے۔ پتھریلی، خاکی، مخلوط، ہموار، ناہموار، سہل، دشوار گزار، بادرخت، بے درخت وغیرہ وغیرہ اقسام کی زمینیں تھیں۔ جن میں رات، دن، رہنا سہنا، خانہ بدوش پھرنا ان کا کام تھا۔ اس واسطے ہر ایک کے لیے جدا جدا لفظ تھے۔

درخت تھے تو اسل، طلح، کھجور کے اور اکثر سوکھی روکھی قسم کے درخت نظر آتے تھے۔ اونٹ، شتر مرغ، جنگلی گائیں، پہاڑی بکرے، ہرنیاں، بکریاں، بھیڑیں وغیرہ جانور آنکھوں کے سامنے پھرتے تھے۔ چنانچہ اونٹوں اور کھجوروں کے متعلق بہتیرے لفظ ہیں۔ بادشاہت اور امارت کی شان و شکوہ سے وہ ملک محروم تھا۔ پس عیش و عشرت اور تکلف کے سامان بھی اسی حیثیت بموجب سمجھ لو۔ لوگ بیاباں گرد اور صحرا نشین تھے۔ لطافت اور نزاکت کے تکلفات کا وہاں کچھ کام نہ تھا۔ پھر بھی طبیعت میں قدرتی فصاحت کا جوش تھا۔ جن چیزوں کی وہاں بہتات تھی اور ہر وقت آنکھوں کے سامنے نظر آتی تھیں انہی کی تشبیہوں اور استعاروں میں بے تکلف طور سے اپنے مطالب ادا کرتے تھے اور فصاحت کے زور اور کلام کے سحر کا پورا اثر دلوں پر پہنچاتے تھے۔

فصیح عرب معشوق کی تعریف کرتا ہے تو آنکھ کو ہرن یا گاؤ دشتی کی آنکھ کہتا ہے۔

زلف کو 'کولا' یعنی 'زغال' کہتا ہے اور جب بالوں کی رنگ و بو کو زیادہ چمکاتا ہے تو لونگیں بھی پیس کر ڈالتا ہے۔ مگر مشک و عنبر کی خوشبو سے بھی غافل نہیں ہے۔

ہونٹوں کا سیاہی مائل ہونا قابل تعریف سمجھتا ہے۔ ملک گرم ہے۔ رنگ کالے ہیں۔

دانتوں کو کبھی اولا کبھی گل بابونہ کہتا ہے۔ انھیں چمکاتا ہے مگر مسوڑھوں پر سرمہ چھڑک کر سیاہ کرتا ہے۔

گردن کو بُت کی گردن سے تشبیہ دیتے تھے۔ پیغمبر صاحب کے حلیہ میں لکھتے ہیں جیدہ کجید میۃ۔

ہند کا انشا پرداز 'زلف' کی تشبیہ میں بھونرے اڑاتا ہے اور سانپ کے پھن بھی لہراتا ہے۔ مگر پہلی تشبیہ خاص ہندستان کی ہے اور ملک کے لوگوں کو خبر ہی نہیں۔ وہ کیونکر کہتے اور کہتے تو سننے والے کیا مزا لیتے۔

آنکھ کے لیے کنول کے پھول دکھاتا ہے۔ مولے کی اچپلاہٹ دکھاتا ہے کہ ہندستان کے لیے خاص ہیں۔ جی چاہتا ہے تو ہرن سے بھی آنکھ لڑا لیتا ہے۔

دانت موتی کی لڑیاں ہیں۔ یہ تشبیہ مشترک ہے۔

ناک کو طوطے کی چونچ سے تشبیہ دیتا ہے کہ خاص ہند کا جانور ہے۔

رفتار میں کبھی ہنس، کبھی ہتھنی کی چال دکھاتا ہے۔ یہ بھی خاص ہند کا حسن ہے۔

بدن کی نرمی اور صفائی کو کیلے کے گابھے اور نیلوفر کے پھول سے تشبیہ دیتا ہے۔ یہ بھی یہیں کی لطافت ہے۔

رنگ سانولا ہو تو 'سیکھ برن'۔ کھلا ہو تو 'چمپئی'۔ یا کندن کا سا رنگ۔ پہلے دونوں رنگ خاص ہندوستان کا حق ہیں۔ ملک کی گرمی پر خیال کرو۔

خوش آوازی کے لیے کوئل، کوکلے، پپیہے کی کوک سناتا ہے۔ یہ جانور ہندوستان کے سوا کہیں نہیں۔

رنگ کی صفائی کے لیے ابٹنا ملتے ہیں کہ سانولے رنگ کا یہی بناؤ ہے۔ فارس والے گلگونہ ملتے ہیں کہ گوری رنگت کا سنگار ہے۔ یہاں کاجل لگاتے ہیں وہاں سرمہ۔ غرض ہر ملک کا انشاپرداز اپنی اپنی چیزوں سے اپنے کلام کو سنوارتا ہے اور چونکہ مطلب ان استعاروں میں ادا ہوتا ہے جو ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہیں اور ہر جگہ عام ہیں۔ اس لیے ان کے استعارے کلام میں مزہ اور سمجھنے میں آسانی اور صفائی پیدا کرتے ہیں نہ کہ کلفت یاد شواری۔

قد کی خوبی کو بان اور اسل اور ارنڈ کی لچکتی ٹہنی سے تشبیہ دیتا ہے۔ معشوق کا گندمی یا چمپئی رنگ عام تعریفی رنگ ہے۔ وجہ اس کی یہ کہ گرمی کے سبب سے ملک کالا ہے۔ وہاں ذرا سا اجالا بھی غنیمت ہے اور گوری رنگت کا تو کیا کہنا۔ اس کی سبحان اللہ کیوں نہ ہو۔ تم نے دیکھا ہوگا بعض ہونٹوں پر ایک قدرتی تحریر سیاہی کی ہوتی ہے اور خوشنما ہوتی ہے۔ وہ عرب کے جمال کا مجزِ اعظم ہے۔ یہ بھی ملک کی گرمی کا سبب ہے۔ حقائق زبان کا ماہر صفحہ کو الٹ کر دیکھے گا تو اور مضمون نظر آئے گا وہ ان خیالات کو دیکھ کر صاف کہہ دے گا کہ یہ ملک گرم ہوگا جو وہاں کے لوگ ان وصفوں کو غنیمت سمجھتے ہیں اور ان ہی کی تعریفیں کر کے خوش ہوتے ہیں۔

عرب کا شاعر گھٹا گھنگور کو بہت پسند کرتا ہے۔ مینہ کی پھوار سے خوش ہوتا ہے اور بجلی کے کوندنے کو کہتا ہے گویا سخی کے ہاتھ سیاہ چادر سے نکل کر بخشش کر رہے ہیں۔ ہائے تہی دست ہی جانتا ہے کہ سخاوت کی کیا قدر کرنی چاہیے۔

اونٹ، کھجوریں، میدان، میدانی پہاڑیاں، ہرنیاں، شتر مرغ، قطا وغیرہ وغیرہ ان کے معمولی مضمون ہیں۔ مثالی اشعار کہاں تک لکھوں۔ مُنخّل شاعر کے قصیدہ میں سے چند شعر لکھتا ہوں :

وَاِذَا سَکِرْتُ فَاِنَّنِیْ رَبُّ الْخَوَرْنَقِ وَالسَّدِیْرِ وَ اِذَا صَحَوْتُ فَاِنَّنِیْ رَبُّ الشُّوَیْھَۃِ وَالْبَعِیْرِ
جب میں مست ہوتا ہوں تو خورنق اور سدیر کا مالک ہوتا ہوں ہوش میں آؤں تو بکریوں والا ہوں اور اونٹ والا

وَلَقَدْ دَخَلْتُ عَلَی الْفَتَا ۃِ الْخِدْرِ فِیْ یَوْمِ الْمَطِیْرِ
میں اس ابل کے کجاوے میں گھس گیا اور اس دن بدلی چھائی ہوئی تھی

اَلْکَاعِبِ الْحَسْنَاءِ تَرْ فَلُ فِی الدِّمَقْسِ وَ فِی الْحَرِیْرِ
وہ جوبن والی اس کی چھاتیاں ابھری ہوئیں اطلس کے کپڑوں اور ریشم کے لچھوں میں لہراتی ہوئی

فَدَفَعْتُھَا فَتَدَافَعَتْ مَشْیَ الْقَطَاۃِ اِلَی الْغَدِیْرِ
میں نے اسے دھکیلا اس نے مجھے جیسے قطا تلاؤ کی طرف جائے

وَلَثِمْتُھَا فَتَنَفَّسَتْ کَتَنَفُّسِ الظَّبْیِ الْغَرِیْرِ
میں نے اسے لپٹا لیا تو ہانپنے لگی جیسے کوئی پیاری ہرنی ہانپتی ہے

وَاُحِبُّھَا وَ تُحِبُّنِیْ وَ یُحِبُّ نَاقَتَھَا بَعِیْرِ
میں اسے چاہتا ہوں وہ مجھے چاہتی ہے اور میرا اونٹ اس کی اونٹنی کو چاہتا ہے

مسافرت میں استعارہ کرتا ہے تو کہتا ہے اِقْتَعَدْتُ سَنَامَ الْغُرْبَۃِ سوار ہوا میں کوہان غربت پر۔

اللہ کی شان دیکھو، اس کا عظمت و جلال دیکھو اور ان صنائع قدرت کو دیکھو جن میں عقل عاجز ہے باوجود اس کے فرماتا ہے۔ اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ۔

فارس میں گدھوں کی سواری اور بارداری بہت ہے اس لیے انشا پردازوں کے بوجھ بھی وہی اٹھاتے ہیں۔

ایک قصیدہ کی تمہید میں متنبی کہتا ہے کہ یارانِ قدیم کے گھر ویران پڑے ہیں۔ وہ چلے گئے اور غیر آن بسے۔

خَلَا وَ فِیْهِ اَھْلٌ وَ اَوْحَشَنَا وَ فِیْهِ صَرْمٌ وَ مُرَوَّحٌ اِبِلُهٗ

وہ گھر یاروں سے خالی ہیں۔ حالانکہ رہنے والے موجود ہیں کیونکہ اونٹوں کے گلے شام کو چرا کر آتے ہیں۔ مگر ہمارے دل کو اچاٹ کرتے ہیں (کہ ہمارے یار نہیں)

اب طبیعت کی لطافت دیکھو اسی مضمون کو شاعر فارس کہتا ہے :

سراغ یک نگاہ آشنا در کس نمی یابیم جہاں چوں نرگستاں بے تو شہر کور می باشد

فصیحِ فرنگ ایک پہاڑی جزیرہ کا رہنے والا ہے۔ وہ جب بہار کا سما اور صبح کی بہار دیکھتا ہے تو اَور رنگ سے لطف اٹھاتا ہے۔ سمندر کا کنارہ، پانی پر ہَوا کا لوٹنا، موجوں کا لہرانا۔ جہاز دور سے نمودار ہوتا ہے۔ بادبان ہوا میں فرّاٹے لیتے ہیں۔ پاس پاس کشتیاں دوڑتی پھرتی ہیں۔ دام دار جال پھینک رہے ہیں۔ مچھلیوں کے شکار ہوتے ہیں۔

پھر شفق میں سورج کا کنارہ افق سے نمودار ہوتا ہے۔ اس کی کرنوں سے پانی جگمگاتا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھوپ سنہری رنگ دکھاتی ہے۔ کہیں دھوپ ہے کہیں چھائو ہے۔ سبزے لہلہاتے ہیں، چشمے بہتے ہیں، پانی لہراتے چلے جاتے ہیں۔ دیکھو! سمجھنے والے اِنہی اشاروں کو دیکھتے ہیں اور انشاپردازی سے ملک کی جغرانی کیفیت دریافت کر لیتے ہیں۔ یہ اختلاف ضرور ہے کہ حسن میں ہمارے ہاں سیہ چشم کی تعریف ہے۔ ان کے ہاں کبود چشم۔ یا سبز چشم تعریف ہے۔ ہمارے ہاں بالوں کی سیاہی پسند ہے۔ وہاں سرخی یا بھوراپن۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ ملک کا شاعر جو اپنی تشبیہیں اور استعارے کام میں لاتا ہے اسے اس کا قصد اَارادہ نہ سمجھو۔ بلکہ اشیاوہاں کی جو ہر دم سامنے ہیں، مجبور کرتی ہیں کہ ہم ہی کو کام میں لا اور ہم ہی میں مطالب ادا کر۔ اور وہ بھی جانتا ہے کہ اسی طرح اپنے مطلب پر جلد کامیاب ہوگا۔ کیونکہ اشیاے موجودہ کے پیرایہ میں جو باتیں ادا کی جاتی ہیں، سننے والوں کے دلوں پر فوراً اثر کرتی ہیں۔ طبیعتیں لطف اٹھاتی ہیں۔ اسی کے چٹخارے زبانوں سے واہ وا کے غل مچواتے ہیں۔ جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کا دل کیا مزا اٹھائے اور زبان کیا واہ وا کرے۔

فارس میں گوری رنگت عام ہے۔ سستی چیز کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ اسی واسطے اس کی انشاپردازی میں تعریف نہیں۔ ہاں اس کی سرخی و صفائی پر مرتے ہیں کہ آئینۂ رخسار کے صدقے اور گلِ رخسار کے قربان۔ اُن میں جو کہیں سانولا رنگ ہوتا ہے تو غضب ہی ہوتا ہے۔ اس کے لیے نظربازوں نے حسن سبز اور حسن سبزینہ کے الفاظ رکھے ہیں۔ ہندستان کی سانولی رنگت کا خیال کرتے ہیں اور مزے لیتے ہیں ع

کشتہ ہندم و سبزان گلابی پوشش

کشمیر کا نازک خیال کہتا ہے :

حسن سبزے بہ خطِ سبز مرا کرد اسیر　　　دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

آنکھوں کی خوبیاں جو ہند میں ہیں وہی وہاں ہیں کیونکہ ایک دادا کی اولاد ہیں۔ البتہ ترکوں کے

حسن نے جب انداز دکھایا تو چشم تنگ کی بھی تعریف ہونے لگی :

مے و مرغ و ریحان و آواز چنگ بُتِ تنگ چشم اندر آغوش تنگ

اس کا کیا سبب؟ وہی اصولِ عام یاد کرو۔ انشا پرداز جو سامنے دیکھتا ہے اسی کو سامان انشا پردازی میں داخل کرتا ہے۔

عزیزانِ وطن! حقیقت یہ ہے کہ زمین مذکور قدرت کا گلزار ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ روئے زمین پر جو ہوا کا اختلاف اور موسموں کا فرق ملکوں میں ہوتا ہے وہ فرق اس کے قطعہ قطعہ میں آشکارا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ سخت گرم ہے، بعض جگہ معتدل ہے یا سرد ہے۔ اضلاع جنوبی میں کرمان، یزد، لارستان وغیرہ اضلاع گرم ہیں اور بعضے عرب کی طرح ریگستان ہیں۔ گرمی میں سخت گرمی ہوتی ہے اور اوّل کے دو مہینوں میں آندھیاں چلتی رہتی ہیں۔ جنگل کے جنگل ریت کے اڑتے ہیں۔ مگر جاڑہ اور بہار ایسے شگفتہ ہیں کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔

فارس یعنی شیراز اور اس کے تمام متعلقات میں نہایت لطیف اور شگفتہ آب و ہوا ہے۔ نہ سخت گرمی ہے نہ سخت سردی۔ چھوٹی چھوٹی نہریں جاری ہیں۔ یاد کرو خواجہ حافظ کے کلام میں چشمۂ اللہ اکبر اور آب رکناباد کا کنارہ۔ پہاڑوں کے دامن ہرے ہیں اور پھولوں سے بھرے۔ سعدی اور حافظ جیسی بلبلیں جہاں زمزمے کریں، وہ خدائی باغ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ سرسبز پہاڑ اور لہلہاتے مرغزار۔ صحرا نشین مخلوقات کو پالتے ہیں اور ان کے مویشی کو فربہ کرتے ہیں۔ ان علاقوں میں غلے اور میوے دانے کی بہتات ہے۔ جوں جوں شمال کو چڑھتے جاؤ آب و ہوا اچھی ہی ہوتی جاتی ہے۔

اصفہان ایک زمانہ میں پایۂ تخت سلاطین صفویہ کا تھا۔ اب ویران کہلاتا ہے مگر سب آبادیوں سے زیادہ رونق دکھاتا ہے۔ گرمی شیراز سے نرم ہے اور جاڑا زیادہ ہے۔ سال بھر میں فقط کئی ہفتہ برف ہے باقی آسمان صاف۔ برف بھی ایسی نرم کہ پڑی اور پانی ہوئی۔ مینہ بھی کچھ سخت نہیں۔ ہوا دیکھنے میں صاف اور اثر میں خشک۔ صیقل دار چیز کو جہاں چاہو رکھ دو، زنگ نہیں لگتا۔ چاروں فصلیں شگفتہ بہار۔

آذر بایجان اور اس کے متعلقات مثلاً تبریز وغیرہ میں ایسا جاڑا پڑتا ہے کہ تھرمومیٹر 14 درجہ پر آجاتا ہے۔ اکتوبر میں شدت سے برف پڑنے لگتی ہے۔ جنوری میں یہ عالم ہوتا ہے کہ ابھی کٹورے میں پانی ڈالا، ابھی جم گیا۔ بخاری کے پاس لکھنے پڑھنے کا سامان رکھتے ہیں۔ اس پر

بھی دمبدم دوات جم جاتی ہے۔ شیشوں کے منہ بند ہوتے ہیں اس پر شربت اور عرق جم جاتے ہیں۔ انڈے ہانڈیوں اور قُطّیوں میں رکھتے ہیں مگر مارے سردی کے پھٹ پھٹ جاتے ہیں۔ تانبے کا آفتابہ رات کو باہر رہ جائے تو صبح کو ترق جاتا ہے۔ کھیتی کا یہ حال ہے کہ ہندستان میں فروری میں کٹ جاتی ہے پنجاب میں آخر مارچ اور اپریل میں۔ وہاں 15 جولائی کو کٹتی ہے۔ ہمدان میں بھی برف بہت ہے۔ کردستان اگرچہ جنوبی ملک ہے مگر زمین بلند ہے اس لیے سرد ہے۔

شمالِ ایران میں مازندران، گیلان وغیرہ گرم بھی ہیں اور سیراب بھی ہیں (جیسا ہند میں بنگالہ)۔ خراسان نہایت سرد ہے مگر جو علاقہ سیستان سے ملا ہوا ہے وہ نہایت گرم ہے۔ گرمی میں کئی کئی دن بادِ سموم کے ڈر سے باہر نہیں نکلتے۔

ممالک مذکور کا ہر شخص بلکہ حیوان بھی بالطبع سردی کو پسند کرتے ہیں اور سردی ہی ان کی طبیعت کے موافق ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زمانِ قدیم میں کبھی بلخ کبھی اصفہان دارالسلطنت تھا۔ وہ برفانی ملک ہے اور رؤسا اور اہلِ دَوَل اور ان کے سبب سے فرقہ فرقہ کے لوگ دارالسلطنت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اہلِ ملک سیاحت پسند اور اکثر تجارت پیشہ ہیں اس لیے گرم ملکوں کے رہنے والے بھی اگر کچھ قدرت رکھتے ہیں تو اپنے کاروبار کی تقسیم اس طرح کر لیتے ہیں کہ گرمی ان کی سرد ملکوں میں کٹتی ہے۔ اب کہ 40 50 برس سے طہران دارالسلطنت ہے۔ 1885 کا جاڑا میں نے وہیں بسر کیا۔ سردی موذی نہیں۔ تمام فصل میں 3 4 دفعہ برف پڑی۔ لوگ کہتے تھے کہ گرمی زیادہ ہوتی ہے اس لیے 4 5 مہینے بادشاہ طہران کو چھوڑ دیتا ہے۔ دامن کوہ الوند میں کئی کوس تک برابر باغستان اور قدرتی سبزہ زار چلے جاتے ہیں وہ ان کا شملہ اور کوہ مری ہے۔ جب تک گرمی رہتی ہے، شاہ، ارکان دولت اور خاندان شاہی سمیت وہیں رہتا ہے۔

جیسی ہمارے ملک کے لوگوں کو سردی کی برداشت نہیں ویسی ہی انھیں گرمی کی برداشت نہیں۔ سردی میں خوش رہتے ہیں اور جو ایرانی کہلاتے ہیں ٹھنڈے ہی ملک کے لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ گویا ٹھنڈا ہی ملک ان کا وطن ہے۔ یہی سبب ہوگا کہ مزاج پُرسی کے فقروں میں کہتے ہیں۔ مزاج مقدس؟ احوال بخیر؟ دماغ چاق؟ کیونکہ سردی میں رہنے سے زکام وغیرہ عوارض کی شکایتیں رہتی ہیں۔

ہندُستان میں حکمائے ہند نے دو دو مہینے کا ایک ایک موسم کر کے سال کے 6 موسم کیے ہیں[1]۔ بسنت، گریکھم، برکھا، سَرَت، ہَمِنت، سِسِیر۔ ایران میں 4 موسم ہیں :

1 بہار	21 مارچ سے	اپریل۔ مئی۔ 21 جون تک	حمل	ثور	جوزا
2 تابستان	21 جون سے	جولائی۔اگست 21 ستمبر تک	سرطان	اسد	سنبلہ
3 پائیز	21 ستمبر سے	اکتوبر۔نومبر 21 دسمبر تک	میزان	عقرب	قوس
4 زمستان	21 دسمبر سے	جنوری۔فروری 21 مارچ تک	جدی	دلو	حوت

بہارِ نوروز

آفتاب آخر حوت پر پہنچا اور موسم میں تبدیلی نظر آئی۔ دل گھبرانے لگتے ہیں۔ آمدِ بہار کی تاثیر سے زمین سانس لیتی ہے۔ در و دیوار کے مسامات سے گرمی نکلتی معلوم ہوتی ہے۔ اسے کہتے ہیں کہ "زمین نفس دزدہ میگیرد۔" پھر چند روز کے بعد کچھ اس سے زیادہ ہوتا ہے کہ در و دیوار میں پسینا سا بہتا ہے۔ تب کہتے ہیں کہ "زمین نفس آشکار میگیرد۔" ساتھ ہی بہار کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ 21 یا 22 مارچ کو نوروز ہوتا ہے۔ یا تو درختوں پر پتّوں کا نام نہ تھا، سب شاخ بلور بنے کھڑے تھے اور زمین آسمان برف ہی برف نظر آتے تھے، یا برف باری موقوف ہو جاتی ہے۔ 8 10 دن کے بعد کبھی ایک آدھ دفعہ کوئی ہلکا سا جھالا پڑ گیا پڑ گیا۔ ورنہ برف برطرف، زمستان موقوف، جہاں ہوتی ہے پانی ہوتی جاتی ہے۔ نہریں، حوض، تلاؤ وغیرہ بلکہ

---

[1] ہند کی انشاپردازی میں جب کوئی مہمان یا مسافر کہیں پہنچتا ہے تو اس کی تعظیم و تواضع کے سامانوں میں 'کھٹ رس بھوجن' یا 'شٹ رس بھوجن' ضرور کھلایا جاتا ہے۔ میں حیران تھا کہ اگر ایک کھانے میں چھ مزے دیں تو وہ کھانا کیا کھانا ہوگا؟ بہت لوگوں سے پوچھا مگر خاطر جمع نہ ہوئی۔ ایک دن استاد مرحوم سے ذکر آیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہندُستان میں سال بھر کے 6 موسم ہیں۔ ہر موسم اپنی بہار کا لطف الگ رکھتا ہے اور اس کے میوے دانے بھی الگ الگ لطف و لذّت رکھتے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ صاحب خانہ نے اپنی محبت یا اعتقاد یا صفائی دل کے کمال سے مہمان کو وہ لطف دکھایا کہ اُسے چھوں فصلوں کی لذّتیں حاصل ہو گئیں۔ اور حقیقت میں عمر انسان کی انھی چھ فصلوں میں گزرتی ہے۔ پس گویا لطفِ زندگی سے کامیاب کر دیا۔ اب خیال کرو ملک کی موسمی تقسیم نے یہ خیال ہند میں پیدا کیا۔ جن ملکوں میں یہ تقسیم نہیں وہاں یہ خیال پیدا کیونکر ہو سکتا ہے اور لوگوں کو اُس سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔

اکثر دریا کہ جم کر آئینہ ہوگئے تھے، وہ پگھلنے لگتے ہیں۔ نہروں کی نالیوں میں چپکے چپکے پانی سر سرانے لگتا ہے۔ پھر حوضوں کے اوپر کا تختہ کنارے کنارے سے پگھل جاتا ہے۔ گویا حوض نے دہن کھول دیا۔ کناروں پر سبزہ اور سبزہ میں کلیاں آجاتی ہیں۔ نظامی :

دہن ناگشادہ لبِ آبگیر کہ آید لبِ غنچہ را بوے شیر

میرے دوستو! جب تک ایسے ملکوں میں جاکر حالت مذکورہ کو آنکھوں سے نہ دیکھے تب تک شعر مذکور اور اس قسم کے اشعار کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔ اکثر شارح اور محشیوں نے صفحے سیاہ کیے ہیں اور اصل مطلب کے سایہ تک نہیں پہنچے۔ پھر دیکھ لو! انشاپردازی نے اپنے ملک کی حالت اور موسم کی کیفیت کو کیونکر ظاہر کیا ہے۔

زمیندار اپنے کھیتوں پر آتے ہیں . باغ والے باغوں میں پہنچتے ہیں۔ باغچہ سب کے پاس ہیں۔ بعض کے گھروں میں چھوٹے چھوٹے خانہ باغ ہیں۔ غریب اپنے دوست آشناؤں کو لے کر انگوروں کی دار بستیں باندھتے ہیں، درختوں کو چھانٹتے ہیں، کیاریاں صاف کرتے ہیں۔ درخت جو سوکھی جھاڑیاں نظر آتے تھے ان میں پھر جان آتی ہے۔ اس طرح کہ آج صبح کو دیکھا ٹہنیوں پر برف نہیں رہی۔ کل صبح کو دیکھا تو سبزی کی تحریر معلوم ہوئی۔ دوسرے دن دیکھا تو ہری ہری کونپلیں۔ مگر سبزی بھی ایسی صاف شفاف کہ آنکھوں میں طراوت آئے۔ جس درخت کی طرف دیکھو زمرّد کی ٹہنیاں بن گئیں! 8 10 دن میں ہرا بھرا درخت لہلہا رہا ہے۔ باغ و گلزار میں بلکہ گھر گھر کی کیاریوں میں گلاب کھل گیا ہے۔ در و دیوار پر سبزۂ خودرو بھی اگا تو ایک گلِ خودرو لیے اگا۔ لوگ گھروں میں سکڑے بیٹھے تھے، نکل کھڑے ہوئے۔ بند کام جاری ہوگئے۔ آسودہ حال لوگ گھوڑوں پر چڑھے۔ دوست آشناؤں کو لے کر باغوں میں گئے۔ بہاریں منائیں۔ عورتیں بھی باغوں اور کھیتوں میں گئیں اور دل خوش کرنے لگیں۔ جس شخص کے دل پر یہ خیال چھائے ہیں، خاقانی کے بہاریہ قصیدہ کا اُسی کو مزہ آئے گا۔

نوروز برقع از رخِ زیبا برافگند برگستواں بہ دُلدُلِ شہبا برافگند

نوروز اپنے رخِ رنگیں سے برف کا برقع الٹ دیتا ہے۔ یا پری رویوں کے رخِ زیبا سے کہ جو برف کے سبب سے لحافوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ہر طرح لطف زیاد بر زیاد ہے۔

اِدھر گلاب کھلا، اُدھر بلبلِ ہزار داستان اُس کی شاخ پر بیٹھی نظر آئی۔ بلبل نہ فقط پھول کی ٹہنی پر بلکہ گھر گھر درختوں پر بولتی ہے اور چہچہے کرتی ہے اور گلاب کی ٹہنی پر تو یہ عالم

ہوتا ہے کہ بولتی ہے، بولتی ہے، بولتی ہے۔ حد سے زیادہ مست ہوتی ہے تو پھول پر منہ رکھ دیتی ہے اور آنکھیں بند کر کے زمزمہ کرتے رہ جاتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں نے جو اس کے اور بہار کے اور گل و لالہ کے مضمون باندھے ہیں وہ کیا ہیں اور کچھ اصلیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ وہاں گھروں میں نیم، کیکر کے درخت تو ہیں نہیں۔ سیب، ناشپاتی، بہی، انگور کے درخت ہیں۔ چاندنی رات میں کسی ٹہنی پر آن بیٹھتی ہے اور اس جوش و خروش سے بولنا شروع کرتی ہے کہ رات کا کالا گنبد پڑا گونجتا ہے۔ وہ بولتی ہے اور اپنے زمزمے میں تانیں لیتی ہے اور اس زور شور سے بولتی ہے کہ بعض موقع پر جب چَہہ چَہہ چَہہ کر کے جوش و خروش کرتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ اہل درد کے دلوں میں سن کر درد پیدا ہوتا اور جی بے چین ہو جاتے ہیں۔ میں ایک فصل بہار میں اُسی ملک میں تھا۔ چاندنی رات میں صحن کے درخت پر آن بیٹھتی تھی اور چہکارتی تھی تو دل پر ایک عالم گزر جاتا تھا۔ کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ کئی دفعہ یہ نوبت ہوئی کہ میں نے دستک دے دے کر اڑا دیا۔ یہ موسم دلوں میں جوش پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ جب چاندنی رات ہوتی ہے تو چند آشنا ہم طبع، ہم نفس، زندہ دلی کی امنگ میں آکر کہتے ہیں: ”بیائید امشب شب گل کنیم۔“ باغ جاتے ہیں۔ رات کو وہیں رہتے ہیں۔ بہار مناتے ہیں اور زندگی کی بہاریں لوٹتے ہیں۔

نگار خانۂ قدرت کے دیکھنے والے دیکھیں گے کہ ہمارے ہندُستان کی بہار کا موسم برسات ہے۔ جو لطف وہاں بہار میں ہوتے ہیں یہاں برسات میں ہوتے ہیں۔ ہندُستان میں بلبل کا زمزمہ نہیں۔ کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک دلوں پر آفت لاتی ہے۔ تلاؤ بڑے چھلکتے ہیں، جھیلیں موجیں مارتی ہیں، دریاؤں کے چڑھاؤ مستیاں دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ گل اور لالہ ان دنوں میں نہیں پھولتا۔ مگر چنپا موتیا رائے بیل وغیرہ وغیرہ پھولوں کی خوشبو سے عالم مہک جاتا ہے۔ دلوں پر بھی جو اثر شگفتگی کے برسات میں ہوتے ہیں بہار میں نہیں ہوتے۔ گھٹا گھنگور چھائی ہے۔ کبھی مینہ برس رہا ہے، کبھی پھوار پڑتی ہے، بادل گرجتے ہیں، بجلیاں چمکتی ہیں، مور بولتے ہیں، باغوں میں جاتے ہیں، پنگھے چڑھتے ہیں، آموں کی سیریں ہو رہی ہیں، ٹپکا لگا ہوا ہے، درختوں میں جھولے پڑے ہیں۔ شاعروں نے بھی جو برسات کے گیتوں میں مزے لیے ہیں وہ بسنت میں نہیں لیے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ قدرتی بہار بسنت کی ہندُستان میں سوائے سرسوں کے اور کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ عمر بھی تھوڑی ہے۔ دو تین ہفتہ میں گرمی آتی

ہے اور سارا لطف خاک میں ملا دیتی ہے۔ ہند کے انشا پردازوں نے جب کسی باغ کا لطف یا عیش کا سماباندھا ہے تو اکثر برسات ہی کا موسم لیا ہے۔

ایران ایک قدرتی بہشت ہے۔ وہاں جن چیزوں کی بہتات ہے وہی اس کی انشاپردازی کا سامان ہے۔ گل، بلبل، سبزہ، شبنم، برف، اولے، مرغزار، آبِ رواں، گلشن، چمن، درخت، جوانانِ چمن، مرغانِ چمن، نغمہ سنجان چمن ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ ان ترکیبوں میں ہزاروں نازک اور لطیف خیالات ادا کرتے ہیں۔ گلاب کے پھول میں جو زردی ہے اسے 'زرِ گل' کہتے ہیں۔ گُل اپنا خزانہ لٹاتا ہے اور ہنستا ہے۔ مگر غنچہ مٹھی بند کر کے اپنی زرداری پر خوش ہوتا ہے اور مسکراتا ہے۔ شبنم بے ثباتی پر روتی ہے۔ جس طرح بُلبُل گل کی عاشق ہے قمری 'سرو' کی شیدا ہے۔ اس کا گیروا لباس ہے۔ نغمے لالہ زار میں، مگر سبزہ بیگانہ ہے۔

زمزموں کی کثرت سے اس کا نام ہزار، ہزار داستان، ہزار آواز رکھا ہے۔ بیسیوں صفتیں خوشنما و خوش آئندہ نکالی ہیں۔ مرغِ شب خواں، خوش آہنگ، آتش نوا وغیرہ وغیرہ ایک ایک ترکیب سے کئی مضمون شاعرانہ جداگانہ پیدا کیے ہیں۔ کوہ، صحرا، مرغزار، چشمے، آبِ رواں کہ قدرت کے عجائب خانے ہیں ان سے ہزار در ہزار خیالات زبان میں پرواز کرتے پھرتے ہیں۔

اہلِ عرب نے کھجور سے۔ انھوں نے شراب و انگور سے بلکہ اس کی تازگی، کہنگی، مستی، سیہ مستی، بدمستی، سرخوشی، خُمار، سرگرانی میں، خندۂ جام، گریۂ شیشہ، قُلقُل مینا، قہقہۂ مینا وغیرہ وغیرہ سے سرور کیے ہیں۔ انہی کی بہتات ہے کہ انشا پرداز کو اپنے رنگین مضمونوں اور استعاروں سے نکلنے نہیں دیتی۔ ایک گُل کو دیکھو کتنی عمدہ عمدہ اصطلاحیں رنگی ہیں۔ گُل کردن (ظاہر ہونا)۔ گلگشت (گلزار میں پھرنا)۔ گل زمین (قطعہ زمین) گُلک (طنز کی بات) وغیرہ سیکڑوں اصطلاحیں ہیں کہاں تک سنوگے۔ آبِ رواں کی کثرت اور زمین کی شادابی اور سرسبزی نے صدہا نہیں، ہزاروں اصطلاحیں اور کنایے سرسبز کیے ہیں۔ فقط آب کی ترکیب سے جو سیراب اور خوشنما معنی پیدا ہوئے ہیں، اگر لکھوں تو ایک رسالہ بنتا ہے۔ سبزہ کی خوشنمائی نے اپنی فراوانی کے سبب سے مختلف ترکیبوں میں لہلہاتے معنی پیدا کیے مثلاً گنبدِ سبز، پلِ سبز، دریاے سبز (آسمان) سبز آخور (خوشحالی میں رہنے والا گھوڑا) سبز بخت (خوش نصیب) سبز کار، سبز گر (جو اچھے کام کرے) آغاز سبز کردۂ شماہستیم (تمھارے پرورش کیے ہوئے ہیں

ہم) سبزہ رنگ (سانولا معشوق)، سبز تہ گلگوں، ان کا تعریفی رنگ اور ایک راگ کا بھی نام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا کیا کہوں۔ شیخ نے کہا :

برومند بادش درختِ اُمید سرش سبز و ریش برحمت سفید

اب تم عرب، فارس اور ہند کی انشاپردازی کو پہلو بہ پہلو ترتیب دے کر دیکھو۔ ہر ملک کے محاورے اور اصطلاحیں تمھیں بتا رہی ہیں کہ اُس ملک کی کیا حالت ہے۔ سرزمین کی کیا کیفیت ہے، آب و ہوا کا کیا عالم ہے، پیداواروں کی کیا صورت ہے اور لوگوں کی طبیعتوں پر اس کا اثر کیا ہے۔ جو زبانوں سے ظاہر ہوا ہے۔

تابستان

گرمی کا موسم آیا، رستے برف سے بند پڑے تھے، سب کھل گئے۔ کاروان تیار ہوئے۔ سوداگروں نے دساور باندھے، کاریگروں کے کارخانے جاری ہوئے۔ درختوں پر میوے دانے ہرے دکھائی دینے لگے۔ پہاڑوں پر برفیں پگھلتی ہیں۔ جہاں باقی ہیں، سبز مخمل پر سفید چادریں بچھی ہیں۔ چشمے بہہ نکلتے ہیں۔ دریا چڑھاؤ پر آکر زور شور دکھاتے ہیں اور موجیں مارتے چلے جاتے ہیں۔ نہریں بہتی ہیں۔ پانی کی چادریں اس زور سے گرتی ہیں کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ جگہ جگہ پن چکیاں چلنے لگتی ہیں۔ پانی آگے بڑھ کر آبادیوں میں آتے ہیں۔ گھر گھر گنگا بہتی ہے۔ کھیتیاں دھوپ کی گرمی سے روز بروز زرد ہوتی ہیں۔ ہوا کی قدرتی خشکی دنوں کی جگہ گھڑیوں میں سکھاتی ہے اور جھٹ پٹ کاٹنے کے قابل کر دیتی ہے۔ باہر کسان کھیت کاٹ اناج نکال کر ٹھکانے لگاتے ہیں۔ آپ چند روز دم لیتے ہیں اور زمین کو بھی دم لینے دیتے ہیں کہ آئندہ فصل کے مسافروں کے لیے تازہ دم ہو جائے۔

باغوں میں میوے پک کر تیار ہو جاتے ہیں۔ بازاروں میں باسلیقہ دُکاندار ایسی خوبصورتی سے دُکانیں سجاتے ہیں گویا نعمتِ الٰہی کا نگارخانہ کھلا۔ سیب، ناشپاتی، بِہی، انگور، رنگارنگ بوقلموں۔ گھروں میں کوئی گھر خالی نہیں دو دو چار چار قسم کے درخت موجود ہیں۔ آپ میوے توڑتے ہیں، کھاتے ہیں کھلاتے ہیں۔ باغ والوں کے گھروں میں باغوں سے کٹ کر میوے آتے ہیں۔ میوہ خانے کے حجروں میں انگور، خربوزے، تربوز لٹکاتے ہیں کہ قندیلیں قمقمے

نظر آتے ہیں۔ سیب، بہی، ناشپاتیاں اتنی ہوتی ہیں کہ دنبے اور بکریاں بھی نہیں کھا سکتیں۔ زمین کھود کھود کر ایک ایک تہ بھس کی دیتے جاتے ہیں اور تہ بہ تہ جماتے جاتے ہیں۔ ہوا کی لطافت اور پاکیزگی یہ ہے کہ سڑنے نہیں دیتی بلکہ پرورش کرتی ہے۔ گرم ملکوں کے لوگ اپنے اپنے اجناس لے کر ٹھنڈے ملکوں کی طرف بیچنے کو نکل جاتے ہیں۔ کیونکہ سیاحت وہاں کی فقط رسم ملکی ہی نہیں، باعثِ زندگی ہوگئی ہے۔ شہروں میں بازار گرم ہوتے ہیں۔ بھیڑ بھاڑ سے رونق ہو جاتی ہے۔ جابجا مرزا منش خوش پوشاک۔ خوش وضع خوبصورت خوبصورت لوگ پھرتے ہیں۔

گرمی کا موسم اُس ولایت میں بند کاموں کو کھولتا ہے۔ منافع کو پھیلاتا ہے او . عموماً گرمی آسائش اور آرام کا سامان ہے۔ دیکھو! اسی واسطے لفظِ گرم نے مختلف لفظوں کے ساتھ ترکیب پاکر خوبی و خوشنمائی یا تیزی اور شوخی پیدا کی ہے۔ مثلاً حسن گرم، شعر گرم، گرم نفس (صاحب تاثیر آدمی)، گرم صحبت (جوش محبت والا)، گرمی ہنگامہ، گرمیِ بازار، گرمیِ صحبت، گرمیِ اختلاط، گرم کردنِ نظر (حسن یا خوشنما چیز سے نظر کا لطف اٹھانا)، گرم کردن دماغ، گرمیِ گفتار، گرمیِ رفتار وغیرہ بیسیوں محاورے پیدا ہوگئے ہیں کہ معنوں میں لطف، شوخی یا زور بڑھاتے ہیں۔

اگرچہ وہاں کی گرمی ایسی ہے جیسے یہاں کا گلابی جاڑا۔ لیکن اکثر گرم میوے اور دُنبوں کے گوشت کھاتے ہیں۔ یخنیاں اور چائے پیتے ہیں اس لیے مزاجوں کو گرمی کی برداشت نہیں۔ تھوڑی دیر چلتے پھرتے ہیں، پسینے پسینے ہو جاتے ہیں۔ دُکاندار پہاڑوں سے برف کے ڈھیمے کے ڈھیمے کاٹ کر لاتے ہیں، فالودہ کی دُکانیں سجاتے ہیں۔ تم نے پیسا دو پیسے دیے، اس نے کٹورے میں تھوڑا شربت، انگور، تھوڑا برف کا لچھا ڈالا اور حوالہ کیا۔ جام از دستش گرفتیم و بسر کشیدیم۔ شکر خدا کردیم و راہ خود گرفتیم۔

بہر حال الفاظ مذکورہ کی ترکیبوں کو دیکھو اور سمجھو کہ وہ کیونکر ملک کی حالت بتاتے ہیں۔ یا یہ کہو کہ ملک کی حالت نے محاورات مذکورہ پیدا کر دیے۔

پائیز

آفتاب میزان میں آیا جاڑے کا پیام لایا۔ یخ بندیاں شروع ہو گئیں۔ پہاڑوں پر چشمے بند ہو گئے۔ دریا اترنے لگے۔ نہریں سوکھنے لگیں۔ کہیں پانی ہے تو اتنا کہ اوپر انگل دو انگل برف کی پپڑی، نیچے پانی بہتا چلا جاتا ہے۔ اوّل اوّل پپڑی کو مُنگا مار کر توڑا، پانی بھر کر لے گئے۔ پھر محلّوں میں حوض بھر لیتے ہیں۔ وہ سب یخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان سے اور آب انباروں کے پانی سے کام چلتے ہیں۔

یخ بندیاں دیکھتے ہی کسان زمینیں جوت کر بیج بو دیتے ہیں۔ اسی عرصہ میں برف کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ سب کھیتوں اور باغوں کو چھوڑ گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ جو بیج بوئے تھے، خدا کے سپرد دیا برف کے حوالے۔ وہ قدرتی دائی آپ ہی بچّے نکالے گی، آپ ہی پالے گی۔ فردوسی نے اسی خیال میں بڑھاپے کی آمد دکھائی ہے :

بگسترد کافور بر جاے مشک　　　　گلِ ارغواں شد بہ پائیز خشک

عزیزانِ وطن! جب تک ممالک سردسیر میں رہ کر موسموں کی حالتیں آنکھوں سے نہ دیکھی ہوں اکثر کتابوں کے خاص خاص مقاموں کا مزا نہیں آتا بلکہ سمجھ میں نہیں آتے۔ کوئی کیا جانے ع

کدیور شد از باغ برخاستہ

کا کیا مطلب ہے اور موسمِ خزاں میں کھیتوں اور باغوں میں اداسی کا کیا عالم ہوتا ہے۔ غرض باہر کے کام والے شہروں میں آئے پوستین، لحاف، توشک، انگیٹھیاں، آتش دان گھر گھر میں موجود ہیں۔ ضروری سامانوں کے ذخیرے بھرے ہیں۔ میوہ خانوں میں تر و خشک میوے دھرے ہیں۔ دُنبے کے دُنبے بلکہ کیے ہیں اور نمک سود کر کے لٹکا دیے ہیں۔ گوشت قاق تیار ہیں۔ یخنیاں اور شبدیگیں پکائیں گے۔ پلاؤ دم دیں گے اور گھروں میں بیٹھے کھائیں گے۔

اتنے میں ہوا جاڑے کی سواری لائی۔ سنّاٹے چلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے کیا باغ کیا جنگل تمام درخت زرد ہو گئے اور زردی بھی وہ کہ گویا عالم زعفرانی ہو گیا اور بعض درختوں کے پتّے تو سر تا پا ایسے سرخ ہو جاتے ہیں جیسے تپایا ہوا تانبا۔ میں ایک دن دیوانِ انوری پڑھ رہا تھا۔ ایک قصیدہ کے دعائیہ میں دو شعر آئے:-

تا ہوائے خزاں بہ بہمن و دے — زرگرِ باغ و بوستاں باشد
باغ ملکِ ترا بہارے باد — نہ چناں کز پیش خزاں باشد

ایک طالب علم نے پوچھا کہ خزاں کو زرگر کیوں کہہ سکتے ہیں۔ جب میں نے اس کے سامنے کیفیتِ مذکورہ کا رنگ دکھایا تو اُس کے چہرے پر سمجھ کا رنگ چمکا۔ خاقانی نے بھی اسی مضمون کا رنگ دیا ہے۔

سخا ہنگامِ درویشی فزوں تر کن کہ شاخ رز
چو درویش از خزاں گردد فزوں گردد زر افشانش

پہلے مصرع میں شاخ رز، شاخِ انگور ہے اور زر افشانی، اس کی برگ ریزی ہے فصل خزاں میں۔

بہر حال ایسے مضامین بار بار میرے اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ کسی زبان کا شائق جب تک برس دو برس تک خود اس ملک میں جاکر نہ رہے گا تب تک نہ رمز سخن کو پاسکے گا نہ زبان کا لطف حاصل کر سکے گا۔

زمستان

دفعتاً ہوا بند ہوئی، ابر سا گھر آیا، دُنیا دھواں دھار ہوگئی۔ پھر سفید غبار سا برستا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر، کوٹھوں، پر دیواروں اور منڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا اور پڑا۔ رات گزری صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک جھکولا اَور، اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں۔ جو درخت ہفتہ بھر پہلے پتوں سے بھرے تھے اب خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں جیسے کسی نے کپڑے اتار لیے۔ وہ بھی سیاہ رنگ جیسی بجلی مارا لوہا۔ ایک دو دن بعد برف برسنی شروع ہوئی مگر کس طرح؟ جیسے کوئی آسمان پر بیٹھا روئی دھنک رہا ہے۔ ایک دن رات جو برف کا تار لگا تو در و دیوار، زمین آسمان تمام سفید۔ وہ سیاہ جھاڑیاں برف جم کر بلور کے درخت اور شیشہ کی شاخیں ہوگئیں۔ دیکھنا انشاپردازی نے کیونکر جغرافیہ ملک کا نقشہ کھینچا ہے:

برآمد کوہ ابرِ کافور بار — مزاج زمیں گشت کافور خوار

اور شیخ سعدی نے ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ دیا۔ چہ حرامزادہ مردمانند کہ سنگہارا بستہ اند وسگہا را کشادہ۔

پہاڑوں پر برف کے پہاڑ چڑھ گئے۔ جنگلوں میں برف سے رستے رُک گئے۔ سوداگر جہاں کے تہاں بیٹھ رہے۔ میدان، کھیت، گلی، کوچہ میں گھر گھر قد آدم برفیں چڑھ گئیں۔ بازاروں میں سناٹا، کارخانے بند۔ غریب کاریگروں کے کاروبار، اُن کے ہاتھوں سے بھی سوا ٹھنڈے۔ کوٹھوں پر برف کے انبار ہیں۔ جلدی گراؤ! نہیں تو گھر بیٹھا۔ اُمرا کے غلام، نوکر، مزدور، لکڑی کے پنج شاخے اور پھاوڑیاں لیے ہیں، برف گرا رہے ہیں۔ غریب غربا اپنا کام آپ ہی کرتے ہیں، پھر گھروں میں آگھستے ہیں۔ آگ بغیر گزارہ نہیں۔ انگیٹھی بیچ میں لے بیٹھتے ہیں۔ جن کو خدا نے دیا ہے ان کے ہاں آتشدان اور بخاریاں روشن ہوتی ہیں[1]۔ کمروں کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ وہ گھروں میں دُنبے کاٹتے ہیں، مرغ ذبح کرتے ہیں۔ نہیں تو گوشت قاق کے پلاؤ دم دیتے ہیں۔ اس کی یخنیاں پیتے ہیں۔ کلے پائے اور شبدیگیں پکا پکا کر کھاتے ہیں اور چائیں اڑاتے ہیں۔ لیکن باہر تمام عالم ویرانہ ہے، کھیت اور باغ سب سنسان۔ گیدڑ، لومڑی، خرگوش بلکہ چوہا تک جنگل میں نظر نہیں آتا۔ اپنے اپنے بھٹوں اور بلوں میں گھس رہتے ہیں۔ اُس وقت نظامی کا دیباچہ اور اُس کے خزاں کے مضمون مزا دیتے ہیں۔

گرگ آشتی۔ بھیڑیوں کو اس موسم میں سخت مشکل ہوتی ہے۔ وہ گوشت کے سوا اور کچھ کھاتے نہیں اور کسی قسم کا ذخیرہ رکھتے نہیں۔ باہر برف کی کثرت سے کتا تک نہیں نظر آتا۔ گلے سب بند ہو جاتے ہیں۔ یہ دس دس بیس بیس جمع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر ہر بھیڑیا اس طرح بیٹھتا ہے کہ اس کی آنکھ سب پر پڑے۔ ہر چند بھوک، پیاس، تھکن سے تنگ ہوتے ہیں مگر ایک کو دوسرے پر اعتبار نہیں اس لیے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ آخر نیند تو ظالم ہے کسی کی ذرا آنکھ جھپکی اور جتنے بیٹھے تھے جھٹ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فوراً پھاڑ چیر تکہ بوٹی کر کے کھا ہی جاتے ہیں۔ اسی سے اہلِ ملک نے اصطلاح نکالی ہے گرگ آشتی یعنی اس بدذات جانور کے ملاپ کا بھی اعتبار نہیں۔

ملک کے لوگ اسی برف کے کیڑے ہیں۔ انھیں یہ سردی کچھ بہت دکھ نہیں دیتی،

1۔ آتش دان کے سامنے آتشگیر (دپناہ)۔ آتش کش۔ فُمر۔ خاکریز وغیرہ کئی چیزیں موجود رہتی ہیں۔

اس لیے بازار چلتے رہتے ہیں۔ حاجتمند بچارے یا اکثر مصیبت کے مارے سفر بھی کرتے ہیں۔ ان کے نمدی چغوں پر برف پڑی ہوئی، پلکوں پر برف جمی ہوئی، مونچھیں اور داڑھی میں گویا شیشہ کی سلائیاں لٹکتی ہیں۔ اس عالم میں پرند جانور بھی کم نکلتے ہیں۔ البتہ خاص قسم کے کوّے اور بعض بعض جانور اڑتے پھرتے ہیں۔ ان کے پیٹھ اور بازوؤں پر برف جمی ہوتی ہے۔ اس وقت نظامی کی تشبیہ کا مزا آتا ہے کہ ع

مرا برف بارید بر پرّ زاغ

اور انہی لوگوں کو مزا بھی آتا ہے جن کی آنکھوں کے سامنے یہ سب چیزیں ہیں کیونکہ تشبیہ اور استعارہ جتنا قریب کا ہو اتنا ہی قریب الفہم ہوتا ہے۔ اسی واسطے زیادہ مزا دیتا ہے۔ اس حالت میں کبھی جھکّو چلنے لگتا ہے اور جو برف پڑی ہوئی تھی وہ خاک کی طرح اڑتی ہے۔ بدن اور چہرے پر چھرّے کا کام کرتی ہے اور کوئی ذرّہ آنکھ میں پڑ جاتا ہے تو بڑی تکلیف دیتا ہے۔ اسے بادروبہ کہتے ہیں۔

ایک سال یہی جاڑے کا موسم تھا اور میں اُسی ملک میں تھا۔ برفیں پڑ رہی تھیں۔ دو مہینے برابر سفر کرنا پڑا۔ دریائے سیحون رستہ میں ملا۔ اس پار سے اُس پار تک ایک تختہ آئینہ کا تھا۔ شتری اور اپسی قافلے پیادہ اور سوار برابر چلے جاتے تھے۔ میں ایک بلند کنارہ پر کھڑا دیکھتا تھا۔ چیونٹیوں کی سی قطار عجب بہار دیتی تھی۔ رستہ میں کئی منزلیں ایسی ملیں کہ جہاں سرا یا مکان کچھ نہ تھا کہ جس میں ذرا سر تو چھپا بیٹھیں۔ زمین پر کمر کمر برف چڑھی تھی اور اِدھر اُدھر پہاڑ برف سے سفید دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے ایک پتھر کی آڑ میں برف ہٹا کر زمین نکالی۔ اِدھر اُدھر سے دو چار لکڑ گھسیٹ لائے، ان میں آگ سلگالی۔ بستر کر کے پڑے اور گٹھری ہو کر سکڑ رہے۔ غنیمت یہ ہے کہ رات کو ہوا بند ہوتی ہے۔ ہم گھنٹے دو گھنٹے بعد اٹھ کر چائے بناتے۔ ایک ایک پیالی پی کر سینے گرم کرتے اور پھر پڑ رہتے تھے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اس وقت شاہ ناصر خسرو کی رباعی سمجھ میں آئی کہ ایسے ہی موقع پر کہی پڑی ہوگی۔ رباعی

دوشینہ شبے کہ برف تا دوشم بود ۔۔۔ زانو چو عروسِ نو در آغوشم بود
پوشیدنی نہ بود غیر از چشمم ۔۔۔ چیزے کہ بزیر سر نہم گوشم بود

لطیفہ۔ جاڑے کا موسم زور پر تھا۔ ایک قلندر مشرب کے پاس جاڑے کا کپڑا کچھ نہ تھا۔ سردی کے مارے مرنے لگا۔ کسی سے پوچھا کہ غضب سردی ہے آفتاب کس برج میں ہے؟ اُس نے کہا

"عقرب میں" قلندر نے کہا کہ "خدا کی لعنت عقرب پر۔ زمین پر بھی دُکھ آسمان پر بھی دُکھ" تم نے دیکھ لیا جب آفتاب عقرب میں ہوتا ہے تو عین جاڑے کی جوانی ہوتی ہے۔ وہاں ہاتھ پاؤں باہر نہیں نکال سکتے۔ یہاں اُن دنوں میں ایک چادرے کا جاڑا ہوتا ہے۔ اس خیال کا لطیفہ پیدا ہوگا تو اسی ملک میں پیدا ہوگا۔ اس ملک کے لوگ سنتے ہیں چپکے ہو رہتے ہیں۔

زبان اپنی اصطلاحوں یا استعاروں کے علاوہ ادائے مطالب میں بھی ملک کے موسم سے آگاہ کرتی ہے۔ دیکھو فصیح فارس اپنی مضمون آفرینی میں ملک کی سردی کو کس طرح دکھاتا ہے:

عجب جائیست ایں کاخِ دل آویز   کہ چوں جا گرم کردی گفت برخیز

جب تم تھوڑی دیر کہیں بیٹھتے ہو تو جگہ گرم ہو جاتی ہے۔ گرم ملک میں ٹھنڈی جگہ پر بیٹھنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ٹھنڈے ملک میں گرم جگہ پر بیٹھنے سے آرام آتا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ دنیا عجب مقام ہے۔ جہاں ذرا آرام سے بیٹھنے کا موقع آیا اور حکم ہوا کہ اٹھ کھڑے ہو۔

آگ ایسے موقع پر فقط باعثِ آرام نہیں بلکہ چشمہ بہت سے منافع کا ہوتی ہے۔ نہیں، نہیں، اکثر موقع پر باعثِ زندگی ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انشائے فارسی نے اُس سے بیسیوں لفظ ترکیب دیے ہیں جن سے تیزی، چستی، رونق، قدر و مرتبہ وغیرہ کے خیالات روشن ہوتے ہیں۔ مثلاً آتش زبان، آتش بیان، آتش سخن (تیز کلام آدمی)، آتش مزاج (تیز مزاج)، آتش کار (چالاک)، آتش لباس (سرخ لباس)، آتش و آب، آتش آب پرور، آتش مجسّم (تلوار)، آتش پُر آب، آتش بے باد، آتش توبہ سوز، آتش سرد (شراب)، آتشِ بے دود (سورج، شراب یا غصہ)، آتش پیکر، آتش زمزم، آتش بید، (سورج)، آتش ہندی (تیغ ہندی) وغیرہ وغیرہ بیسیوں لفظ ہیں کہ خوبیِ معنی سے مختلف کاموں اور مختلف چیزوں میں رونق اور خوبی پیدا کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ گائے وغیرہ بہت سی مفید چیزیں ہیں جو انسان کی آسائش اور زندگی میں مدد دیتی ہیں ہندوؤں میں واجب التعظیم ہوئیں۔ یہاں تک کہ لوگ رفتہ رفتہ انھیں دیوتا ماننے لگے۔ کیا عجب ہے کہ آگ سے ان ملکوں میں بہت سی تکلیفیں رفع ہوتی تھیں اور اکثر قسم کے فائدے حاصل ہوتے تھے۔ شاید اوّل تعظیم کے لیے حکم ہوا ہو پھر رفتہ رفتہ عبادت ہونے لگی۔

برخلاف اس کے سردی سے لوگوں کے کاروبار رُک جاتے ہیں۔ فوائد میں نقصان آتے ہیں۔ پھرتے چلتے بیٹھتے اٹھتے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جن الفاظ سے سردی ترکیب پاتی ہے معنوں میں بھی کمی، بے لطفی اور خرابی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً وعدۂ سرد، گریۂ سرد، آہ سرد، نازخنک، نوائے خنک، گفتار خنک، سرد شدن اختلاط (کی محبت)، سرد حرف، سرد بیان، سرد گوے، سرد مہر، سرد نفس، سرد درد، خنک طبع، خنک ادا، خنک گفتار، خنک روے وغیرہ وغیرہ بہت سے الفاظ ہیں۔

برخلاف اس کے عرب کا ملک گرم ہے۔ اسی واسطے سردی سب کو عزیز ہے۔ جب کہتے ہیں وَكَانَ الْهَوَاءُ بَارِدٌ تو ہوا کی خوش آئندگی مراد ہوتی ہے اور پانی کی برودۃ سے اس کی لطافت و گوارائی مراد لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ خوش بیان فصیحوں نے عَيْشٌ بَارِدٌ آرام کی زندگی اور غَنَمٌ بَارِدٌ یعنی عمدہ نعمت بھی کہہ دیا اور بَرَدَ اَمْرُنَا یعنی ہمارا کام بن گیا۔

تم ضرور کہو گے کہ فارس میں بھی خنکی چشم بمعنی راحت و آرام بولتے ہیں نہ کہ بے آرامی۔ آزاد کہتا ہے کہ یہ درست ہے لیکن اگر میرا قیاس غلط نہیں تو یہ محاورہ عرب سے آیا ہے اور ترجمہ ہے قَرَّةُ الْعُيُون کا۔ ایران میں بہت محاورے عرب سے آئے ہیں۔ انہی میں یہ بھی آیا ہوگا۔ (دیکھو صفحہ 234)۔

تم کہو گے کہ اس محاورہ کی خصوصیت نہیں خنکی زبان فارسی میں اور جگہ بھی لطف و خوبی پیدا کرتی ہے۔ شیخ سعدی نے کہا ہے :

خنک روزِ محشر تنِ دادگر　　　که در سایۂ عرش دارد مقر

میرے دوستو! غور کرو یہ محاورہ نہیں بلکہ ایک مذہبی روئداد کا بیان ہے۔ تم جانتے ہو کہ قیامت کے دن گرمی کی شدت کس درجہ پر ہوگی۔ تابشِ آفتاب سے سر کا بھیجا پگھل کر ناک سے ٹپک جائے گا اور زمین تانبے کی طرح تپے گی۔ شاعر کہتا ہے کہ جس دن گرمی کا یہ عالم ہوگا، اس دن دادگر کا تن بدن خنک ہوگا اور وہ عرش کے سایہ میں ہوگا۔

زبان ایران یہ بھی کہتی ہے کہ میری سرزمین تمام کوہستان ہے جو بے شمار خلقت سے آباد ہے۔ یہی سبب ہے کہ پہاڑ کے متعلق بہت سے محاورے، استعارے اور خیالات ان کی انشاپردازی میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کوہ پشت (کوز پشت کو کہتے ہیں اس کے کُب کی شباہت کے

سبب سے)۔ کوہ جگر (شجاع)۔ کوہِ آب (موجِ آب۔ اِسے اپنے دریا یا نہروں کی لہر نہ سمجھو۔ سمندر اور اس کے طوفانوں کی طرف خیال کرو) اور عموماً بلندی کا اشارہ بھی اسی لفظ سے کرتے ہیں مثلاً کوہِ زمین۔ یا پیش کوہ۔ اور پس کوہ یعنی اس کے آگے کی بلندی اور پیچھے کی بلندی۔ فصیح فارس اپنے سرور میں آتا ہے تو کہتا ہے۔ "در عالمیکہ کوہِ بنگ از سر پریدہ بود"۔ کبھی کہتا ہے "کوہ تا کوہ بنگ از سر پریدہ بود" اور "کوہ کوہ کیف از سر میگزشت" یہ استعارے بھی ملک کی سر سبزیوں نے زبان کو دیے ہیں۔ کمر اور چوٹیوں کی تعریف میں شاعر نے کہا۔ کوئی معشوق سے پوچھو! ع

کوہ را با تار موئے بستیِ آخر چہ ساں؟

اور جلد پھر آنے کے موقع پر کہا۔ "چوں صدا از کوہ برگشت" اور "چوں سیلِ از کوہ بزیر آمد"۔

پہاڑ کے مختلف حصّوں کے نام اس کی صورتِ حال کے بموجب تراشے ہیں اور ضرور ایسا ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہیں کا رہنا سہنا ہے۔ کام کاج، آنے جانے میں اور ہر موقع کا اتا پتا بتانے میں جدا جدا جگہ کے واسطے جدا جدا نام چاہیے ہیں۔ اس سے زبان کی وسعت معلوم ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کاروبار میں ہرج ہوتے۔ مثلاً کمرِ کوہ، دامنِ کوہ، تیزیِ کوہ، تیغِ کوہ، بینیِ کوہ، قُلّۂ کوہ، درہ کوہ، کوہ پایہ۔

اسی صورتِ حال کو اور موسم کی کیفیت کو دیکھ کر ملک کے شاعر نے کہا:

برآمد ز کوہ ابر کافور بار　　　مزاجِ زمیں گشت کافور خوار

سعدی:

آفتاب از کوہ سر بر میزند　　　ماہ من انگشت بر در میزند

مُلا محتشم کاشی نے مرثیہ میں کہا:

چوں شد بہ نوکِ نیزہ سر آں بزرگوار　　　خورشید سر برہنہ بر آمد ز کوہسار

دیکھو وہ ایک صاحبِ زبان کا خیال تھا جو کہ خالص خیال بند تھا۔ میر انیس مرحوم ہند کے شاعر تھے انھوں نے اسی خیال کو رنگین کیا:

تھا بسکہ روز قتلِ شہِ آسماں جناب
نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرہ پہ آفتاب

اور کسی اہل زبان نے بڑھاپے کے سر کو دیکھ کر کہا۔ آفتاب بر سر کوہ است۔ یاد کرو شعر مذکورۂ بالا ع

مرا برف بارید بر پرِّ زاغ

تم نے دیکھا اس طرح ایک زبان بتاتی ہے کہ میرے بولنے والے کن خیالات کے لوگ ہیں؟ اور میں کس ملک کا سبزۂ خودرُو ہوں؟

اگرچہ چار موسم اپنا اپنا لطف جدا جدا رنگوں میں دکھاتے ہیں مگر عموماً ہر موسم میں زمین سر سبز اور شاداب ہی دکھائی دیتی ہے۔ خشک یا شور زار قطعہ بہت کم نظر آتا ہے۔ جدھر دیکھو ہریاول لہلہاتی ہے اور سبزہ ہوا سے پانی کی طرح لہریں مارتا ہے۔ سبزی جتنی تیز ہے اس سے سوا گلریز ہے۔ درخت جتنے ہرے ہیں اُس سے زیادہ پھولے پھلے ہیں۔ جو ہوا آتی ہے صبا ہے یا نسیم ہے۔ بو آتی ہے تو نکہت ہے یا شمیم ہے۔ آسمان بھی یہ آسمان نہیں۔ جب دیکھو رنگ نکھرا ہوا ہے۔ اسی کو دیکھ کر کہتے ہیں، چرخ فیروزی، چرخ مینائی، فلک مینا رنگ، چرخ آئینہ فام، آبگون، آبگینہ رنگ، چرخ نیلی، چرخ نیلگوں، گوے لاجورد اور گنبدِ لاجوردی۔ حق پوچھو تو یہ الفاظ اسی آسمان کے لیے زیبا ہیں نہ کہ فلک ہند جس کے نیچے سدا خاک اڑے۔

بلبل ہزار داستان کا زمزمہ اور تدرو کا قہقہہ ناحق مشہور ہو گیا ہے۔ وہاں ہزاروں جانور ہیں۔ جو ہے اپنی اپنی ٹہنی پر بلبل اور آشیانہ پر ہزار داستان ہی ہے۔ خوش رنگ ایسے ہیں کہ شوخی آنکھوں کو قوت دیتی ہے۔ وہاں کی چڑیا کا رنگ بھی ڈبڈباتا ہے۔ نہ کہ ہندوستان کی چڑیا جس کے بھوسلے رنگ سے خاک جھڑتی ہے۔ چرندوں کو دیکھو تو غزال و آہو، ہرنیاں، گوزن، گورخر نیلہ گاو وغیرہ خوشنما جانور دامنِ دشت اور دامنِ کوہ میں قُلاچیں مارتے پھرتے ہیں۔ اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ نے کیا کہا ہے اور کس عالم میں کہا ہے :

صبا بہ لطف بگو آں غزالِ رعنا را　　　　که سر بکوه و بیاباں تو دادۂ ما را

پہاڑوں کے چشمے میدانوں میں نہریں بہاتے ہیں اور شہروں میں پانی پہنچاتے ہیں۔ گھر گھر گنگا بہہ رہی ہے۔ کوئی مکان ایسا نہیں جہاں پانی جاری نہ ہو۔ ان کی انشا پردازی سے ٹپکتا ہے کہ قدرتی خوشنمائیاں ہر وقت سامنے ہیں اور وہی لوگ ہیں کہ مزے لے لے کر ان پہاڑوں کے لطف اٹھاتے ہیں۔ شستہ الفاظ، عمدہ ترکیبیں، لطیف اشتقاق، نازک خیالات، پاک تشبیہیں اور استعارے تراشتے ہیں مثلاً 'آب رو' (عزّت)۔ 'اکنوں معاملہ اش آبے بر روے کار آوردہ'

(اب اس کے کام نے ذرا رونق بہم پہنچائی ہے) اور کہتے ہیں 'پیش فلانی رفتیم۔ دیدیم در عالم آبست۔ پشیماں شدیم و بر گشتیم' (یعنی شغل شراب خواری میں تھا یا مست تھا)۔ 'آبش از سر گزشتہ است' (خرابی حد تدارک سے گزر گئی ہے)۔ آب در دیدہ ندارد (بے حیا ہے)۔ 'آب در جوال می کوبد'۔ 'آب بہ غربال می پیماید'۔ 'آب در سبد می کند'۔ 'میخواہد آب بریسماں بندد' (بے فائدہ کام کرتا ہے)۔ تم جانتے ہو، پانی پر تیل ڈالتے ہیں تو اوپر آجاتا ہے۔ اسی بنا پر جب کوئی ظاہر میں دوستی دکھاتا ہے اور چکنی چپڑی باتیں بنا کر مطلب نکالنا چاہتا ہے تو کہتے ہیں۔ 'بازی نخوری آغا۔ ایں روغنے ست کہ برروے آب پاشیدہ۔ معاملہ اش آب درمیان دارد' (اس میں کچھ دغا ہے)۔ 'پر حذر باشی از فلانی کہ آبے ست در ریزہ کاہ' تم نے بھی اکثر برسات میں دیکھا ہوگا۔ میدان میں پانی پھیلا ہوتا ہے۔ تم ایک ہری گھاس پر قدم رکھتے ہو کہ نیچے زمین ہے۔ پاؤں رکھا تو غڑپ پانی میں جا پڑا۔ اسی واسطے جس شخص کا ظاہر خوشنما اور باطن خراب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔ 'آب زیر کاہ ست'۔ 'تنک آب' (کم ظرف)۔ دریا سے جلد عبور کر جانے کے موقع پر کہتے ہیں۔ 'ہمچو باد از روے آب گزشت'۔ پانی کی بہتات نے بہت سے عمدہ وصف اپنے موصوفوں کے لیے پیدا کیے اور انشاپرداز نے کہا۔ شعر تر، نغمہ تر (مزہ دار شعر یا نغمہ)، گوہر تر (آبدار موتی)، تردست (صنعت گرِ کامل یا سخی) تر زبان (فصیح) وغیرہ وغیرہ۔

پانی کی مختلف حالتوں اور کاموں کے سبب سے بہت کہاوتیں نکل آئیں مثلاً آب آمد تیمم برخاست۔ آب ندیدہ موزہ کشیدہ وغیرہ وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی کثرت نے انھیں قدرتی چشموں کی طرح زبان سے جاری کیا ہے جس سے ہماری طبیعتیں بالکل محروم ہیں۔ بابر نے اپنی توزک میں یہ نکتہ خوب کھولا۔ لکھتا ہے۔ "اہلِ ہند کے دل ان کیفیتوں سے ایسے بے مذاق ہیں کہ اگر سیر و سفر میں ہوں اور اتفاقاً آب رواں کے کنارے آن اتریں تو اُدھر خیمہ کی پشت کرتے ہیں۔"

وہ شگفتہ مزاج لوگ اپنے دلوں کو ہمیشہ انھی گلزاروں میں شگفتہ رکھتے ہیں۔ اسی واسطے طبیعت بات بات میں شگفتگی دکھاتی رہتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ خوشی نے اپنے اصلی معنوں سے بڑھ کر بہت سے معنوں پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ کہتے ہیں 'کباب خوش نمک' اور 'طعام خوش نمک' (جس میں اعتدال سے نمک ہو) اور خوب اور اچھا۔ 'خوش انگشت۔ خوش نواز' (اچھا ستار بجانے والا)۔ 'خوش خواہش'۔ 'خوش

کام'۔ 'معشوق خوش کنار'۔ 'گوہر خوش آب'۔ 'خوش نما'۔ 'خوش جلا'۔ 'خوش نظر'۔ 'خوش طینت'۔ 'خوش نہاد'۔ 'خوش رو'۔اسی طرح 'شاداب'۔ 'شاد بہر'۔ 'شاد کام' وغیرہ وغیرہ اس طرح کی بیسیوں کی ترکیبیں ہیں۔

لطیفہ۔ شاہ تہماسپ کے حضور میں حکیم حسن گیلانی اوّل روز باریاب ہوا تو نوجوان اور نہایت حسین تھا۔ بادشاہ نے حال پوچھا اور مسکرا کر کہا ع

خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم

اور کثرت کے معنی بھی پیدا کرتا ہے چنانچہ 'مرد خوش برگ' (بسیار سامان)۔ 'درخت خوش ثمر'۔ 'باغ خوش حاصل'۔ 'زمین خوش حاصل' اور 'سر خوش' اور 'دل خوش' میں اور ہی لطف پیدا ہوتا ہے۔ 'خوش سودا'۔ 'خوش حساب'۔ 'خوش معاملہ' اور ہی معنی دیتا ہے۔ خوش غلاف وہ تلوار کہ ذرا سے اشارہ میں میان سے نکل آئے۔

'خورّم' مرکّب ہے۔ خور۔ رَم۔ سے۔ اس کے معنی سر سبز و شاداب کے ہو گئے۔ اسی سے عہدِ قدیم میں 'خورّم روز' ایک عید کا نام تھا۔ پھر 'خورّم گاہ' اور 'مکان خورّم' اور 'فضاے خورّم' اور 'گلستان خورّم و دلکش' اور 'خورّم روے'۔ خوبصورت وغیرہ وغیرہ بہت سی ترکیبیں پیدا کیں اور اسی طرح 'شگفتہ رو'۔ 'شگفتہ مزاج'۔ 'شگفتہ طبع'۔ 'شگفتہ کلام' اور 'زمین شگفتہ' اور 'جبین شگفتہ' وغیرہ وغیرہ انھوں نے شہر شہر میں لطف و خوبی کی حالت اور وقت کی لطافت کو انتخاب کر کے صاد کیا ہے اور شعرا نے ضرب المثل کر کے نظم کیا ہے کہ زبان زدِ خاص و عام ہے :

علی الصباح نشاپور و خفتنِ بغداد نمازِ دیگرِ مرو و نمازِ شامِ ہرات

اور ہندستان میں اس کے مقابل صبحِ بنارس اور شامِ اودھ ہے۔ غریب سے غریب ہوگا، مگر گھر میں ہوگا تو گھر کو قدرتی سنگاروں سے سجائے گا۔ باہر جائے گا تو آب رواں کی سیر اور گلگشت سے جی بہلائے گا۔ لفظ گلگشت کی ترکیب دلالت کرتی ہے کہ ان کی چہل قدمی گلزاروں میں واقع ہوتی ہے۔ یہی شگفتگی ان کے مزاجوں کو شگفتہ رکھتی ہے کہ ہفتہ دو ہفتہ بعد مُلّا شاعر سوداگر پیشہ ور غرض اپنے اپنے ڈھنگ کے ہم طبع اور ہم نفس باغوں میں جاتے ہیں۔ گھروں سے سامان لے جاتے ہیں۔ درختوں کے نیچے آبِ رواں کے کنارہ چبوترے بنے ہوتے ہیں ان پر یا جہاں موقع کی جگہ پاتے ہیں فرش بچھاتے ہیں۔ سامنے مرغزار ہرے ہیں۔ دامن کوہ لالہ و گل سے بھرے ہیں۔ پہلو میں پلاؤ دم ہو رہا ہے۔ ایک طرف کباب لگے ہوئے۔ چائے کی پیالی

چل رہی ہے۔ شعر خوانیاں ہو رہی ہیں۔ زمزمے اڑ رہے ہیں۔ دو تین دن زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں اور چلے آتے ہیں۔ عرفی کہتا ہے :

فصلِ گل رفت عبث حیف شرابے نہ زدیم — بہ کبابِ جگر خود نمک آبے نہ زدیم

اشک خوں گشت سر چشمۂ چشمم بہ اُمید — خیمہ بر آبِ رواں ہمچو حبابے نہ زدیم

جن لوگوں نے دامنِ کوہ نہ دیکھا، اس میں چشمۂ کار ساؤنہ دیکھا، دامنِ صحرا میں بہاؤ نہ دیکھا انھیں کیا مزا آئے گا کہ اشک کا آنکھ سے بہنا اور چشمہ سے پانی کا رِسنا کیسی تشبیہ ہوئی۔

میووں کی آبداری اور شادابی کا یہ عالم ہے کہ منہ میں ڈالو تو شربت ہوئے جاتے ہیں۔ پھوگ کا نام نہیں، خربوزہ کاٹو تو شیرہ اور شربت پڑا بہتا ہے۔ نزاکت کا یہ حال ہے کہ پکی ہوئی فالیز کے برابر سے سوار گھوڑا مارے نکلتا ہے تو دہقان بچارا ہاتھ باندھے دوڑا آتا ہے کہ برائے خدا گھوڑا نہ دوڑاؤ دھمک سے میرے خربوزے پھٹ جائیں گے۔ انگور کے خوشے جب درخت سے کاٹتے ہیں تو دانے پھوٹ پھوٹ کر رس کے سرّاٹے بہتے ہیں۔ وہاں کے چقندر یہاں کے شلجموں سے بڑے ہوتے ہیں۔ جوش کر لیتے ہیں یا بھوبل میں دبا دیتے ہیں۔ صبح کو چنگیریوں میں رکھ کر گلی کوچوں میں پھانکیں کاٹ کاٹ کر بیچتے ہیں۔ مٹھاس کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے عرق کا قند بناتے ہیں۔ سفیدی میں برف اور لطافت میں ہمارے قند سے بہتر ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی کلہاڑیاں ہوتی ہیں اُن سے توڑتے ہیں۔ رات کے وقت اس پر چوٹ لگاتے ہیں تو آگ کے پتنگے اڑتے ہیں۔ اسی بنیاد پر صدہا محاورے اور اصطلاحیں شیرینی کی پیدا ہو گئی ہیں۔ ہر ایک نایاب اور خوشنما اور خوش آئند چیز کو شیریں کہتے ہیں۔ خوش حرکات اور خوش مزاج بچہ کو کہتے ہیں۔ عجب بچۂ شیر ینے ست اور خواب شیریں میٹھی نیند۔ معشوقہ کا نام شیریں۔ معشوقہ کی صفت میں شیریں حرکات۔ شیریں شمایل۔ شیریں کار۔ شیریں خرام۔ شیریں بہانہ۔ شیریں ادا۔ شیریں کلام۔ شیریں مقال۔ وغیرہ وغیرہ بہت سی ترکیبیں پیدا کی ہیں اور دہنش شیریں کن (یعنی کچھ رشوت دو)۔ شیریں کار (جو شخص اچھے اچھے کام کرے)۔ شیریں باف (ایک بہت اچھا کپڑا ہوتا ہے) شکر و قند می شکند (عجب میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے)۔ صحبت ہمہ گر شیر و شکر است (ان کی خوب مزے میں گزرتی ہے)۔ شکر خواب (خواب خوش)۔ شکر ریز (دُلھن کا نچھاور اور وہ اکثر شگون کے طور پر مٹھاس کی قسم سے ہوتی ہے) غرض کہ قند اور شکر کی ترکیب سے سیکڑوں

میٹھی میٹھی اصطلاحیں اور محاورے نکالے ہیں۔ زبان میں مہارت پیدا کرو اور اہل زبان کے کلام پر عبور کرو۔ پھر ان بیانوں کو اُن سے مطابقت دو تو لطف حاصل ہو۔

اُس ملک کو نگارخانۂ قدرت کہیں یا صنعت خانۂ الٰہی سمجھیں۔ قلمدان میں جس قدر آب و رنگ الفاظ و عبارت کے تھے اس کے نقشہ میں لگا دیے مگر دل کا ارمان نہیں نکلا۔ خیر۔ مجھے ملک کا زبانِ ملک سے تعلق دکھانا ہے اُس کے لیے اتنا کافی ہے۔ اب اس نقشہ کو لپیٹنا چاہیے اور اُس مضمون پر خیال لگانا چاہیے کہ اس رنگین زبان کی طرز کو اَور زبانوں کی طرز سے کیا نسبت ہے۔

آٹھواں لکچر

زبانِ فارسی کا انداز اور زبانوں کے انداز سے کیا نسبت رکھتا ہے

آج کا لکچر اس مضمون پر ہے جو فارسی کے عالم کا نفس ناطقہ ہے۔ جو لکچر اب تک دیے گئے وہ گویا فرش، میزیں، کرسیاں اور لیمپ تھے کہ ان پر آج کا مضمون جلوہ زیبائی دکھائے۔ اس زبان کی تعریف میں ایشیائی زبانوں کے اہلِ ذوق کبھی کہتے ہیں کہ "فارسی شیریں زبانیست۔" کبھی کہتے ہیں "فارسی شکر است، ترکی ہنر است، ہندی نمک است۔" لطف یہ ہے کہ یورپ کے زبان دانوں نے بھی اس کی طرز ادا کو مانا ہے اور لکھا ہے کہ چند اوصاف خاص نے اُسے دنیا کی زبانوں پر فوقیت دی ہے۔

(1) ایک اُن میں سے کہتا ہے کہ ایشیائی زبانوں میں اسے وہی رتبہ حاصل ہے جو یورپین زبانوں میں فرنچ کو حاصل ہے۔ اسے خدا نے الفاظ دیے اور الفاظ کی ترکیب میں ایسا اثر دیا ہے کہ جس مطلب کو ادا کرتی ہے دل کا ارمان پورا کر دیتی ہے۔

(2) ایک فرنچ صاحبِ زبان کہتا ہے[1]۔ "اس میں نہ شبہ ہے نہ مبالغہ کہ فارسی عمدہ

1۔ موسیو نکولا قنسل دولت فرانس مقیم طہران اپنے مکالمہ فارسی کے دیباچہ میں کہتے ہیں۔

زبانوں میں دلپذیر زبان ہے۔اس کے خزانے مجاز اور استعارات و کنایات اور عمدہ محاوروں سے مالامال ہیں۔ وہ اپنے سرمایہ سے ہر قسم کے مضمون کو ایسے قالب میں ڈھال لیتی ہے جو اس کے لیے ٹھیک مناسب اور زیبا ہے۔ اس کی لیاقت السنہ مشرقیہ میں شاعری اور انشاپردازی کے لیے بالطبع مناسب ہے اور ان پتلیوں کو ڈھالنے کے لیے نہایت قابل ہے۔ اس کی باتیں میٹھی ہیں اور صرف و نحو کے قاعدے سیدھے سادے ہیں۔"

(3) ایک دانائے فرنگ کہتا ہے۔ قدرت نے اُسے گلزار زمین، پُر بہار ہوا سے شگفتگی طبع کے لیے ایسے سامان دیے ہیں کہ انشاپردازی کے لیے قلم اور رنگ کا کام دیتے ہیں۔ فصیح فارس وہاں بیٹھتا ہے اور الفاظ و عبارت کی رنگ آمیزی سے بہار کی کیفیت، حسن کا جوبن، عشق کا غم، دل کی وحشت، فراق کی حسرت، طبیعت کی اداسی وغیرہ وغیرہ مضامین کو حد سے گزار دیتا ہے اور وہ خیالات مذکورہ میں مقید نہیں۔ شاہنامہ کو دیکھو۔ میدان جنگ میں قیامت آرہی ہے۔

(4) قدرت نے اس کے لفظوں کے جوڑ و بند اور ترکیب کے سلسلے ایسی لطافت سے مسلسل کیے ہیں کہ پڑھنے والا اگر ذرا بھی سلیقہ رکھتا ہو تو ناسمجھ کے کان بھی اس کی آواز سے مزا لے سکتے ہیں۔

(5) اصولِ زبان کے ماہر کہتے ہیں کہ ہر زبان اپنے الفاظ کے معنوں سے ادائے مطلب کرتی ہے۔ اس کے الفاظ فقط باہمی ترکیب سے عجیب اور لطیف معنی پیدا کرتے ہیں۔ یہ وصف اَور زبانوں میں بھی ہے، مگر بہت کم اور اس میں بہت زیادہ۔

(6) اس کے بیان میں استعارہ اور تشبیہ کے قبول کرنے کا قدرتی مادّہ ہے۔ فصیح فارس ان سے ایسے لطایف، ظرایف، نکیلے کنائے، چبھتے ہوئے اشارے پیدا کرتا ہے کہ نثر میں نظم کا مزا آتا ہے۔

(7) اُس کی پرانی تصنیفات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدرتی طاقت سے ہر مطلب کی اصلیت کو کم لفظوں میں، صاف عبارت میں، چھوٹے چھوٹے فقروں میں ادا کردیتی ہے۔ جسے سن کر ہر دل سے آواز آتی ہے کہ بے شک حسنِ خداداد کو بناؤ سنگار کی کچھ احتیاج نہیں ہے۔

آزاد کو فارسی زبان کا اور زبانوں سے امتیاز دکھانا ہے اس لیے اس میں گفتگو کرتا ہے اور فخر کے ساتھ کہتا ہے۔

(1) ہر زبان ضرورت کے وقت دوسری زبان کے لفظوں کو لیتی ہے اور کبھی بہ تصرف، کبھی بے تصرف کام لیتی ہے۔ لیکن فارسی میں جس قدر وسعت اس استعمال کی ہے، اور زبانوں میں نہیں۔ اس سے میری مراد تعریب و تفریس نہیں۔ وہ اور اس قسم کی تبدیلیاں الگ لکچر میں بیان کروں گا۔ یہاں مجھے دکھانا اس امر کا ہے کہ فارسی غیر زبان کے لفظ لے کر کیسے نئے معنی اور معنوں میں لطافت اور نزاکت پیدا کرتی ہے۔ دیکھو!

ذوق عربی لفظ ہے جس کا ترجمہ ہے 'چستیدن'۔ فارسی میں ذوق کردن سے جو کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے، کسی طرح لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً آزاد اپنے سیاحت نامہ میں کہتا ہے۔ در شیراز روزے بر قبر خواجہ حافظ رفتم فاتحہ میخواندم کہ مطلع خواجہ بخاطرم گزشت۔

در نمازم خم ابروے تو تا یاد آمد حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

کیفیتے طاری شد کہ شرح آنرا حوصلہ بیان بر نمی تابد لیقدر می دیدم کہ لب خندان است و دیدہ گریاں و دل از ہر دو بر کراں، تا کہ بمنزل رسیدم میخواندم و ذوقہا میکردم۔

اب خیال کرو اس محاورہ نے تمھارے دل پر کیا اثر کیا ہے اور اس کا ترجمہ کیا ہو سکتا ہے۔

کبھی اسی موقع پر کہتے ہیں: میخواندم و وجد میکردم۔ وجد کے معنی عربی میں ہیں یافتن۔ محاورہ میں آکر وہ بھی ایسے ہی گومگو معنی پیدا کرتا ہے۔

تماشا عربی میں کئی آدمیوں کا مل کر چلنا ہے۔ اب دیکھو اہل زبان کیا کیا تماشا دکھاتے ہیں۔

آنکہ دائم ہوسِ سوختنِ ما می کرد کاش می آمد و امروز تماشا می کرد
خوش گلشنے ست دہر کہ گلچینِ روزگار فرصت نمی دہد کہ تماشا کند کسے

ع تو نیز بر سر بام آکہ خوش تماشائیست

جلوہ عربی لفظ ہے، جس کا ترجمہ ہے؛ نمودن و عرض کردن خویشتن را۔ فارسی میں آکر اپنی ترکیب سے بڑائی اور خود نمائی اور خوشنمائی کے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کہنے والا کسی

کے کبر و غرور پر طنز کرتا ہے۔ چنانچہ ایک جلا بھُنا سائل کسی امیر سے انعام میں ایک چغہ لے کر کہتا ہے: مرد کہ بہ جامۂ کہنہ سخاوت خود را جلوہ داد۔

کبھی ایک خوش مزاج تمسخر سے دل خوش کرتا ہے اور کہتا ہے: در جلسۂ مشاعرہ رفتہ بودم۔ مردم غزلہا خواندند۔ ماہم بہ پنج شعر فصاحت خود را جلوہ دادیم۔

پری زادوں کے جلوہ میں جو خوش ادائی کے انداز ہیں، جاننے والوں کے دل جانتے ہیں۔

حاشا عربی میں کبھی بمعنی 'دور شد'۔ کبھی 'مگر'۔ کبھی 'خالی' وغیرہ آتا ہے۔ مگر فصیح فارس، اپنے جوش میں ایک بد معاملہ نادہند کی شکایت کرتا ہے، از من پول نقد گرفت۔ و بہ ہزار منت گرفت۔ قسمہا یاد کرد۔ و خدارا در میان داد۔ امروز کہ گفتم، مرد کہ حاشا زد۔ یعنی مُکر گیا۔

ان ترکیبوں کی گنجائش جیسی زبانِ فارسی میں ہے، دوسری زبان میں نہیں ہے۔

(2) زبان فارسی کے اسم بھی مختلف فعلوں کے ساتھ مل کر ایسے اوصاف، عجیب رنگ سے ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً :

خوش کردن	پسند کرنا۔ انتخاب کرنا
تر آمدن	شرماتا
گل کردن	ظاہر ہونا
سر کردن یا شدن	شروع کرنا اور ہونا
تن زدن	چپکا ہونا۔ در گزر کرنا
سر آمدن	تمام ہونا
دراز کشیدن	لیٹنا

(3) اُس کے فعل بھی ہر ایک اسم کے ساتھ مل کر نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔ 30۔ 40۔ 50۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچ جاتی ہے۔ دیکھو :

"کشیدن"۔ اصلی معنوں پر مختلف طور سے مستعمل ہوتا ہے ع کہ زر زر کشد در جہاں گنج گنج۔

کماں کشیدن۔ دانہ کشیدن۔ اسی سے ہے۔ مور دانہ کش۔ ارّہ کشیدن۔ کشتی کشیدن۔

"کبھی لکھنا" مراد ہوتا ہے۔ مثلاً خط کشیدن۔ صورت کشیدن۔ طغریٰ کشیدن۔

"کبھی اٹھانے" کے معنی پیدا کرتا ہے۔ (1) حقیقی۔ مثلاً بارکشیدن۔ بردوش کشیدن۔

(2) مجازی۔ ناز کشیدن۔ جفا کشیدن۔ شرم کشیدن۔

"کبھی کھانے" کے اور کبھی "پینے" کے معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً شراب کشیدن۔ کباب کشیدن۔ زہر کشیدن

"بمعنی کردن"۔ جیسے نظر کشیدن۔ مشق کشیدن۔ قیمہ کشیدن۔ اتو کشیدن۔

"بچھانا اور تاننا"۔ مثلاً خوان کشیدن۔ سفرہ کشیدن۔ دام کشیدن۔ فرش کشیدن۔

"بمعنی بر آوردن"۔ مثلاً طعام از دیگ کشیدن۔ بچہ کشیدن۔ خار از پا کشیدن۔

"بستن"۔ مثلاً کمر کشیدن۔ زین کشیدن۔ پردہ کشیدن۔ نقاب کشیدن۔

"پرونا"۔ مثلاً گوہر در گوش کشیدن۔

"بنا کردن"۔ مثلاً حصار کشیدن۔ دیوار کشیدن۔

"باندھ لینا"۔ بزنجیر کشیدن۔

"ترتیب دادن و آراستن"۔ انجمن کشیدن۔ بزم کشیدن۔ بازار کشیدن۔

"بلند کردن"۔ مثلاً خیمہ کشیدن۔ بارگاہ کشیدن۔ گردن کشیدن۔

"زدن"۔ مثلاً جاروب کشیدن۔ حرف کشیدن

"غوطہ دینا"۔ مثلاً جامہ در نیل کشیدن۔ آب کشیدن جسے ہندی میں کھنگالنا کہتے ہیں۔

"دراز کردن"۔ یا "شدن"۔ مد کشیدن۔ خط کشیدن۔ حرف کشیدن۔

"تولنا"۔ بہ ترازو کشیدن۔

"پہننا"۔ رخت در بر کشیدن۔ لیکن۔ از تن کشیدن۔ اُتارنا ہے۔

"باز کشیدن" عناں باز کشیدن۔ روک لینا۔

"کبھی انقضائے مدت" مراد ہوتی ہے۔ مثلاً چلّہ کشیدن۔ اور یک ماہ کشید و یک سال کشید۔

"رنگ کشیدن"۔ رنگ پھیرنا۔

بعض مصدر مثلاً زدن۔ وغیرہ ہیں کہ صدہا معنی دیتے ہیں اور 10 15 20 تو بہت پیدا کر دیتے ہیں۔

(4) اُس کے حرف بھی ایسی ہی خاصیت ظاہر کرتے ہیں۔ دیکھو :

برخوردن	سرِ راہ ملاقات ہو جانی	روساختن	شرمانا
درافتادن	لڑمرنا	روکشیدن	سامنا کرنا
برافتادن	گر پڑنا	نفس سوختن	دم چڑھنا

بادِ رد کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

برکردن چراغ روشن کرنا

"دررفتن"۔ گھسڑ جانااور "تفنگ دررفت" خود بخود چھوٹ گئی۔ "پالش دررفت" پھسل گیا۔

"برآمدن"۔ گھر سے نکلنا۔ "سربام برآمدن"۔ چڑھنا

"درگرفتن صحبت" اس کا دلچسپ اور موافق ہونا۔ "درگرفتن آشنائی" تپاک اور گرم جوشی محبت "درگرفتن سودا" یعنی سودا بن گیا اور خوب نفع ہوا وغیرہ وغیرہ۔

شیخ سعدی ایک جلسہ میں وعظ کہتے کہتے فرماتے ہیں "دیدم کہ نفسم در نمی گیرد" یعنی میری بات ان کے دل میں اثر نہیں کرتی۔

"درگرفتن آتش"۔ آگ کا جل اٹھنا۔ "درگرفتن چراغ"۔ اس کا بھڑک اٹھنا۔

اور مجازاً۔ "در آتش شوق درگرفتن"۔ "بہ آتش قہر درگرفتن"

دوسرا وصف۔ زبانِ فارسی میں اکثر الفاظ ہیں جو ناواقف آدمی کو مفرد یا جامد معلوم ہوتے ہیں، درحقیقت مرکب ہوتے ہیں اور باعتبار مناسبت معنی کے انھیں اصل شے کے ساتھ عمدہ تعلق ہوتا ہے مثلاً مردمک۔ تصغیر ہے مردم کی۔ اصل میں آدمی کو کہتے ہیں اور آنکھ کی پُتلی کو بھی کہتے ہیں۔ وجہ یہ کہ جب تم اسے دیکھو تمھاری تصویر تمھیں دکھائی دیتی ہے اور وہ بھی تمھاری طرح ہر ایک چیز کو جو سامنے آئے، دیکھتی ہے۔ اس لفظ میں عجیب لطف یہ ہے کہ عرب نے اسے انسان کہا۔ ہند نے پُتلی کہا۔ فرنگ نے اسے Pupil کہا

زمین۔ اہل لغت کہتے ہیں کہ زم بمعنی خنک ہے۔ چونکہ جوہر زمین خنک ہے اس لیے ی ن نسبت کا لگا کر کرۂ خاک کا نام 'زمین' رکھا اور سنسکرت میں 'جیا' T;k زمین کو کہتے ہیں کہ جیتی جانوں کا مقام ہے۔ کیا عجب ہے کہ فارسی میں بھی 'زی' زیستن سے ہو۔ 'ی ن' نسبت کا لگایا۔ زیوین۔ ہو کر زییمن اور پھر زمین ہو گیا۔

بیزار۔ بیز + آر۔ بیز۔ فارسی قدیم۔ سیری یعنی دل بھر جانا ہے اُس پر آر لگا کر 'بیزار' بنالیا۔

پشیمان۔ پشیم۔ لغت قدیم مین بمعنی برکندگی و جدائی تھا۔ اان لگا کر پشیمان کرلیا اور

یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کام کر کے انسان پچھتاتا ہے تو اُس سے دل اکھڑ جاتا ہے۔

آباد۔ لغت قدیم میں بمعنی ستائش۔ آفرین۔ بارک اللہ ہے اور مقابل ویران اور خوش اور خوب اور نیک اور پیغمبرانِ عجم میں سے پہلے پیغمبر کا نام بھی آباد تھا، مرکب ہے۔ آب + آدہ سے۔ آدہ حرف نسبت ہے۔ جیسے پیادہ (پے آدہ) وغیرہ میں۔ چونکہ آب خمیر مایہ رحمت الٰہی کا ہے اور اس کے معنی رونق اور قدر و منزلت کے بھی ہیں۔ اس لیے شہروں اور بسے ہوئے مقاموں کا نام آباد ہوا کہ بارونق ہیں اور اسی واسطے اہل معنی کے لیے مظہر ہیں رحمت و برکات کے، بلکہ محرک ہیں ستائش اور نیائش ں کے اور مورد ہیں تحسین و آفرین کے۔ یہ لفظ مستعمل ہوا اور طریق تمدن گواہی دیتا ہے کہ ابتداے آفرینش میں جبکہ اولاد آدم بڑھی ہو گی اور بہ سبب کثرت کے اطراف عالم میں پھیلی ہو گی تو سرسبز اور شاداب زمینوں میں سکونت اختیار کی ہو گی اسی بنیاد پر مکاناتِ معمورنے، آباد، نام پایا ہو گا اور اسی سے ہے بیابان (بے آبان) یعنی بے آب و گیاہ اور غیر آباد جنگل۔ اسی طرح بنیاد۔ پیادہ وغیرہ اور مرغزار اور بازار۔

(2) اکثر الفاظ مشتق ہیں۔ مثلاً :

"کمان"۔ مبدل ہے خمان کا اور یہ نام اس لیے ہوا کہ خمدار ہے۔

"کمند"۔ مبدل ہے خمند کا کہ اصل میں خم وند یا خمندہ تھا۔ سبب یہ ہے کہ اسے اسی طرح لپیٹ کر زین کے پیچھے لٹکاتے ہیں جس طرح سقّے ڈول کی رسّی کو لچھیاتے ہیں۔

"کودک"۔ نجاست کے ڈھیر کو کود کہتے ہیں۔ اسی سے ہے کودک کہ بچّہ بھی نجاست کے نکالنے میں بے اختیار ہوتا ہے۔

"ریدک"۔ مشتق ہے۔ ریدن سے۔ وہی سبب اس نام کا ہے جو اوپر ظاہر ہوا۔

"نوش"۔ حاصل بالمصدر ہے نوشیدن سے۔ چونکہ شہد و شربت اور آب حیات اور ہر قسم کی شیرینی طبیعت کو کھانے پر راغب کرتی ہیں۔ اس لیے شیرین کو 'نوش' کہا گیا۔

"تیغ"۔ مبدل ہے تیز کا۔ تلوار کو اس لیے کہتے ہیں کہ تیز ہے۔

(3) کبھی یہ زبان دو اسموں کی ترکیب سے معنوں میں لطافت مذکورہ پیدا کرتی ہے مثلاً

"سبک روحی"۔ لطافت طبع اور ترقیات معنوی کی لیاقت۔

"گراں جانی" اس کے برخلاف۔

"دل تنگی"، غمگینی۔

"پامردی"۔ استقلال ہمت و مروّت۔

"پاداری" استقلال۔

"خاکساری"۔ فروتنی۔ عجز و انکسار۔

"رگِ گردن"۔ اہلِ زبان کہتا ہے۔ فلانی رگ گردنے دارد کہ ہیچ خنجرش نتواں برید۔

"سبک سری"۔ بے وقوفی۔

"سر گرانی"۔ دردسری۔ غصہ۔ ناراضی۔

(4) اکثر افعال کے لیے مصدر موجود ہیں مگر وسعت زبان نے کئی لفظ ملا کر وہی معنی پیدا کیے اور یہ لطافت طبع اور نزاکت خیالات کا نتیجہ ہے کہ اَور زبانوں میں کم ہے۔ مثلاً :

"پریدن"۔ پرواز کرد۔ رو بہوا نہاد۔ سَر دَر ہوا شد۔ بال در ہوا کشاد۔ بہ ہوائے شوق بال کشاد۔ رو بَہوا آورد۔ سر در ہوا کشید۔ پرِ پرواز کشاد۔ سر بہوائے شوق نہاد۔ بال طیراں کشاد۔

"اطاعت کردن"۔ سر تسلیم نہادن۔ گردن نہادن۔ سر برخطِ فرماں نہادن۔ فرماں بُردن۔ حکم برداشتن۔ بجا آوردن۔

"برہم شدن"۔ برخود پیچیدن۔ برخویش پیچیدن۔ خشم گرفتن۔ دماغ سوختن۔

"رفتن"۔ راہ طے کردن۔ گام زدن۔ قدم زدن۔ چالش کردن۔ مسافت پیمودن۔ راہ پیمودن۔ پابرداشتن۔ حرکت کردن۔ راہ نوردیدن کو دیکھنا گویا قدم بر قدم کپڑے کا تھان تہ کرتا چلا جاتا ہے۔

"سفر کردن"۔ رخت کشیدن۔ راہ غربت گرفتن۔ قدم بہ وادیِ غربت نہادن۔ سر بصحرا کشیدن۔ سمند سفر را زین نہادن۔ راہ نوردیدن۔ راہ سفر پیمودن۔ سفر گزیدن۔ غربت گزیدن۔ دل از وطن برداشتن۔ دل از خانہ برکندن۔ راہِ غربت پیمودن۔

(5) زبان فارسی بے مدد 'استعارہ' و 'تشبیہ' کے بھی اکثر مطالب کو ایسے خوشنما رنگوں میں دکھاتی ہے کہ ہر مطلب ایک خوشنما نکتہ نظر آتا ہے۔ حقیقت میں دیکھو تو کچھ بات ہی نہیں۔

"روغن از کدوے خشک برے آرد"۔ "روغن از سنگ میکشد" یعنی اپنی محبت اور ہمت سے ایسی جگہ سے مطلب حاصل کرتا ہے جہاں سے ممکن نہ ہو۔

"ریگ بیاباں پیمودن" امر بے حاصل مراد ہوتا ہے مگر دیکھو اسے کس کس طرح کام میں

لاتے ہیں :

مجنوں بہ ریگ باد بہ غمہاے دل شمرد   یاد آں زمانہ کہ غم دل حساب داشت

'باد پیمودن۔ "آہن سرد کوفتن"۔ "دام بر ہوا انداختن"۔ وغیرہ اصطلاحوں کو عجیب عجیب لطف سے استعمال کرتے ہیں۔

"امریست پیش پا افتادہ"۔ امر سہل و کار آسان۔ "آب در جگر داشتن"۔ "آہے در جگر داشتن"۔ کم وبیش طاقت یا ہمت۔ مثلاً تا کہ آہے در جگر داشتم رفاقت کردم۔ یا تا کہ آبے در جگر داشتم دست وپاے زدم۔ یعنی جب تک طاقت رہی اس کا ساتھ دیا۔

"چوں کار دبا ستخواں رسید خود را بر کنار کشیدم" جب جان پر آبنی تو مجبور الگ ہو گیا۔

"سر بر سنگ زدن"۔ سعی بیہودہ کرنا۔ "بر یخ زدن"۔ "برروے آب نوشتن"۔ ایسی ہی تقریروں میں بولتے ہیں مگر استعمال میں زبان پر قدرت ہونی ضرور ہے۔

"ہر چند انگشت بر لبش زدم۔ حرفے از زبانش بر نیامد"۔ ہر چند میں نے تحریک کی مگر کچھ نہ بولا۔

"بخیہ از روے کارش افتاد"۔ اس کا بھرم کھل گیا۔ جو اس کا اصلی حال تھا ظاہر ہو گیا۔

"پردہ از روے کارش افتاد" اس کا پردہ کھل گیا۔

"پاک فروخت۔ پاک سوخت"۔ کوئی بد نصیب سارا گھر برباد کردے یا برباد ہو جائے اس موقع پر کہتے ہیں۔

"کیسہ بہ صابون زدہ" یعنی بالکل مفلس ہو گیا کوڑی پاس نہیں رہی۔

غرض اس قسم کے ہزاروں محاورے ہیں کہ باتیں کرتے ہیں اور شکر پارے توڑتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی کہاں تک لکھے۔

تیسرا وصف وہ ہے جس کے کہنے میں لب مسکراتے ہیں اور عقل شرماتی ہے۔ شرمانا اس افسوس پر ہے کہ استعارہ اور تشبیہ وغیرہ صنائع مختلفہ وصف ہو کر آئے اور ایسے چھائے کہ عیب ہو گئے۔ حقیقت میں استعارہ اور تشبیہ رنگ تھے۔ رنگ جوہر شے کو خوشنما دکھاتا ہے۔ صنائع مذکورہ عبارت میں مطلب کو روشن کرتے تھے کہ خوبی و لطافت سے سمجھ میں آتا تھا۔ کئی سو برس سے رنگوں کی شدت نے اصلیت کو پیچ در پیچ پردوں میں دبایا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ مطالب عبارت سے جلاوطن ہو گئے۔ قباحت مذکور کے سمجھانے کو اتنا کہنا کافی نہ ہوگا اس لیے زیادہ توضیح سے کہنا چاہیے۔

خیال کرو! فصیح فارس اگر کسی چیز کا ذکر خوبی یا زشتی کے ساتھ کرنا چاہتا ہے تو اسے ایک اَور شے قرار دیتا ہے، جو حسن و قبح میں اس سے کچھ تعلق رکھتی ہے۔ پھر اپنے حسبِ ضرورت اُس کے اچھے اچھے لوازمات کے بیان سے اصل مطلوب کی بھلائی برائی ظاہر کرتا ہے۔

مثلاً حمد کے موقع پر اس کے الفاظ کو موتی اور جواہر قرار دیتا ہے جن کے لیے چمک اور آبداری ضرور ہے اور اس لیے چمکیلے الفاظ کا لانا بھی ضرور ہوتا ہے۔ ان کی کمی زیادتی کی مقدار کے لیے ترازو بھی درکار ہے۔ پھر ترازو کے لیے پلّے اور تولنے کے لیے دست و بازو بھی چاہئیں۔ اس لیے یہ سامان بھی سمیٹنا پڑتا ہے۔ اب عبارتِ ذیل کو دیکھو کہ حمد کے الفاظ کو جواہر کہہ کر اس کے لیے اور لوازمات کس کس طرح تیار کیے ہیں :

جواہر زواہر نیایش پیش از قیاس۔ ولآلی متلالی ستائش لا تناہی اساس کہ کفۂ زبان و میزان بیان از کشیدنِ آں قاصر۔ و بازوے تواں از تعقل آں فاتر باشد۔ نثار سرائے کبریائے مالک الملکے کہ مقرنس چرخ کبود از شہرستان عظمت و جلال او کاخے۔ و شجرہ بدیع الازہار وجود از گلشن وسیع الفضاے قدرت او ساخیست۔ دیدۂ دقیقہ شناس رموز آفرینش۔ روز نیست بصحراے بے منتہاے قدرتش کشادہ۔ وروشنیِ اذہان دانشمندان چراغیست در راہ معرفتش نہادہ۔

یہ موقع ہے کہ ہندی کی عبارت سے اس عبارت کا مقابلہ کروں اور دونوں کے فرق دکھاؤں۔ دیکھو ہند کا انشا پرداز جب کسی چیز کا بیان کرتا ہے تو جو کچھ کہتا ہے اُس کے اور اُسی کے لوازمات کے بیان سے کہتا ہے۔ مثلاً مطلبِ مذکورۂ بالا کو وہ کہے گا تو اس طرح کہے گا : اعلیٰ سے اعلیٰ الفاظ اور روشن سے روشن عبارتیں، اُس پروردگار کی حمد پر قربان ہیں کہ آسمان کی بلندی اس کے آگے خاک سے کم ہے اور سارے جہان کے دریا شبنم۔ داناؤں کی آنکھیں اس کی قدرت کو دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں۔ گویائی دم بخود ہے اور عقلیں سوچ میں گم۔

انصاف یہ ہے کہ فصاحت فارس نے استعارہ اور تشبیہ کے خیالات میں لطافت اور نزاکت سے پھولوں کے عطر نکالے ہیں اور بلند پردازی میں آسمان سے تارے اتارے ہیں۔ مگر اس قدر افراط کی ہے کہ بدنام ہوگئے۔ ورنہ استعارہ ہر زبان میں ہے۔ تقدیری اتفاق ہے کہ جو وصف اوّلیت کا درجہ لینے کو اختیار کیا تھا اسی نے سب سے پیچھے پھینک دیا۔

ظہوری اپنی سہ نثر میں بادشاہ کے عرفان کی کس زور سے تعریف کرتا ہے :

از صدمۂ توحیدش دوئی در یکی گریختہ و بہ علاقۂ تجریدش خودی در توئی آویختہ۔

(اس کی قدردانی کی تعریف کرتا ہے) از علم نکتہ بہ کتابے و گلے بہ گلزارے قبول۔

(اس کی انشاپردازی کے باب میں کہتا ہے) خوشا ذوق چمن طبعے کہ بہ درک نکات رنگینیش رنگ فہمیدن بر چہرہ تواند بست۔

(اسی تعریف میں اپنی راست بیانی پر قسم کھاتا ہے) بہ نگارندۂ کہ بہ ریحان خط خوباں مشک را بر نسریں برات دادہ۔

چوتھا جوہر زبان فارس کے مضامین بہاریہ ہیں۔ تم جانتے ہو جو کچھ سامنے ہوتا ہے۔ اس کی تصویر آئینہ میں پڑتی ہے اور اُسے خوش رنگ، بدرنگ، رنگین، یا بے رنگ کرتی ہے۔ زمین مذکور سبزہ و گل کا وطن ہے۔ خصوصاً فصلِ بہار میں کہ جب سبزہ فرشِ خاک پر تختِ زمرد سجاتا ہے۔ پھول سبزہ کے سر پر تاج رکھتا ہے۔ در و دیوار سے بہار برستی ہے۔ شادابی ہوا میں موجیں مارتی ہے۔ شیراز کے گلزار، خاک مصلّی، چشمۂ رکناباد، اصفہان کے مرغزار، کوہ الوند کی چوٹیاں اور دامن پھولوں سے بھرے۔ ان کے اتار چڑھاؤ، ہیر پھیر، پانی کی چادریں گرتی ہیں اور گھاٹیوں میں گرجتے بادلوں کی طرح گڑگڑاتی چلی جاتی ہیں۔ انہی میں سے لہراتی نہریں نکلتی ہیں۔ لہکتی مہکتی ہوائیں کبھی ابر، کبھی بادلوں کی بہار، کبھی مینہ کی پھوار۔

بدہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت
کنار آب رُکنا باد و گلگشتِ مصلّی را

جب فصیح فارس اس خاک پر اپنے شگفتہ و خورم دل اور رنگین و شاداب طبیعت کو لے کر بیٹھتا ہے تو سا باندھ دیتا ہے۔ وہ قصیدہ کے سر پر بہاریہ خیالات کا تاج رکھتا ہے۔ رنگین طرّے گوندھ کر مطالب کی کلاہ میں ٹانکتا ہے اور یہی ہونا چاہیے کیونکہ جو سامنے ہو، وہی دل میں، جو دل میں ہو وہی زبان سے نکلتا ہے۔ جو شیشہ میں ہو وہی جام میں آتا ہے۔ رنگینی اُن کے قلم میں کونپلوں کی طرح پھوٹتی ہے اور طبیعت سے شبنم کی طرح برستی ہے۔

البتہ یہ افسوس ہے کہ ان خیالوں میں اصلی مطالب کا رستہ بھول گئے۔ فقط وہی باتیں رہ گئیں۔ بہار کے الفاظ۔ استعاروں اور تشبیہوں کے اینچ پیچ میں آکر رنگین خیالی کے خطاب سے نامور ہوئے اور کل تحریریں اسی رنگ میں ڈوب گئیں۔ تم غور کر کے دیکھو۔ جتنی بہاروں کی کمائی اس زبان کے سنگار میں صرف ہو رہی ہے، جہان کی زبانوں کے لیے کافی ہے۔ ذرا قلم پر

زور ڈالا اور اِک باغ بھر رنگ ٹپک پڑا۔

حق یہ ہے کہ جوہر مذکور وہاں کے متقدمین میں وصف تھا جو سادہ نویس کہلانے لگے۔ پھر جو رنگین نگار ہوئے، وہ بد نقش و بد نگار ہو گئے۔ جو مطلب لکھتے ہیں، ایک ہی ضلع کی جگت بازی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ غمگین بھی ہوتے ہیں تو غنچہ کی صورت میں دل تنگی دکھاتے ہیں۔

گرفتہ بود دلِ من برنگِ غنچۂ گل   شگفتہ روئیِ صہبا شگفتہ کرد مرا
پیشِ ما اے باغباں گلدستہ گلہا مبند   صحبتِ یارانِ رنگیں یاد مے آید مرا

دوست ایک امر ضروری کے لیے دوست کو دو سطر کی بات لکھتا ہے۔ پہلے رنگین الفاظ میں اِک عریض آداب و طویل القاب لکھتا ہے۔ پھر انہی خیالات میں اک پیچ در پیچ تمہید اٹھاتا ہے۔ پھر دو سطریں مطلب کی لکھتا ہے اور خاتمہ کی ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔

لطف یہ ہے کہ حمدِ الٰہی میں بھی رنگ ہی اڑاتے ہیں۔ مُلّا ظہیرا نے باغ کی تعریف میں ایک رسالہ لکھا۔ حمد کا فقرہ سر دیباچہ ہے :

شبنم شاداب ہر گونہ ستائش و ثنا کہ از ہوائے روح پرور بستانِ بیاں۔ بر گلبرگِ زبانِ سخنوراں نشیند۔ بجذب استحقاق ذاتی۔ راجع بہ جنابِ آفتاب نقابِ بہار پیرائیست کہ در بیت المقدسِ گلشن۔ غنچۂ مریم مسیح دم را۔ دہانِ روز دارِ صمت۔ بہ کلمہ طیبہ ہو کہ اسم اعظم اوست۔ کشودہ۔

شاعروں نے فقط بہار کے مضمون پر کتابیں مجلد کیں۔ جو نظم میں لکھیں ان کا نام "ساقی نامہ" رکھا۔ اسی عالم میں کبھی باغ و بہار کی کیاریوں کو دیکھو گے کہ میدانِ کارزار ہو رہی ہیں اور یہ انداز ثابت کرتا ہے کہ قوم مذکور، بغیر دلاوری اور سپاہگری کے انسانیت کو ناتمام سمجھتے تھے۔ دیکھو تمام کہانیوں کی بنیاد صید افگنی اور شہسواری پر ہے۔ اسی بنا پر تیغ اور خنجر کے لیے سبزہ رنگ، گند ناگون وغیرہ عمدہ صفتیں پیدا کیں۔ موجِ رواں کو تیغ تیز، گرداب کو سپر تعبیر کیا۔ معشوق اور اس کی آنکھ کو تُرک اور صید افگن۔ نگاہ کو خدنگ و شمشیر۔ مژگان کو تیر۔ سرمہ کو سنگ فساں۔ کبھی زبانِ طرّار کو خنجر یا تلوار، زبان آور۔ یا جس شخص کی دعا اکثر قبول ہوتی ہو اُس کو 'سیف زبان' کہتے ہیں۔ حسن کے عالم میں فردوسی نے رستم کی بی بی کی تعریف میں کیا خوب کہا ہے :

دو ابر و کمان و دو گیسو کمند زبانش چو خنجر دہانش چو قند
سر زلف و جعدش چو مشکیں زرہ فگند است گوئی گرہ بر گرہ
بہار بے سپر جام بارے گزرد نسیم ہمچو خدنگ از کنارے گزرد

اگر آں ترکِ شیرازی بدست آرد دلِ مارا بہ خالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
فغاں کیں لولیانِ شوخ وشیریں کار وشہر آشوب چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما[1] را

اِن مضامین سے نظم و نثر کے شہر آباد ہیں اور خوش آئندہ اور دلپذیر محاوروں کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ ملک کی زبان کس خوبی سے بیان کرتی ہے کہ جو قومیں وہاں رہتی ہیں ان کے عادات واطوار کیا ہیں۔

دیکھو! دو ملا بھی اپنے شاگردوں اور طرفداروں کے جتھے کو لے کر مباحثہ کا جلسہ گرم کریں تو کہنے والا کہے گا۔ ملا جعفر کہ در میدان مباحثہ شمشیر خوش غلاف بود۔ اوّل سرِ سخن آمد مگر بہ دو حرف سپر[2] انداخت۔

بیرم خاں خانخاناں اپنی فوج کو لے کر میدان میں صف آرا ہوا ہے۔ مورخ کہتا ہے۔ سبحان قلی ترک کہ تیر روے[3] ترکش بود۔ در اوّل حملہ بر قلبِ دشمن زد و چپقلشہاے مردانہ کردہ از دست راست سر بر آورد۔

پانچواں وصف زبان فارس کا۔ ادا کرنا ہے کیفیت حسن و عشق کا۔ ان خیالات کو اس لطافت ونزاکت اور ظرافت کے ساتھ ادا کرتی ہے گویا اُسی کے واسطے پیدا ہوئے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ سامانِ خدا ساز ہاتھ آئے ہیں۔ عالم سبزہ زار، ہرے بھرے پہاڑ، بہتے پانی، گرتے ہوئے آبشار، موسمِ نوبہار، بلبل کے چہچہے، چکور کے قہقہے، سامنے پریزاد صورتیں۔ فصیح فارس جب اس طلسم قدرت میں بیٹھ کر اپنے پُر اثر الفاظ و عبارت سے حسن کا جلوہ دکھاتا ہے تو پرستان کی تصویر کھینچ دیتا ہے:

---

1 ترکستان کی رسم قدیم ہے کہ نوروز کے دن دستر خوان سجاتے ہیں اور سب مل کر لوٹتے ہیں کھاتے ہیں۔ خوشیاں مناتے ہیں اور اسے سالِ آئندہ کے لیے نیک شگون سمجھتے ہیں۔ 2 سپر انداختن سے اظہار اور اقرار مغلوبی مراد ہے۔
3 جو تیر کہ ترکش بھر میں عمدہ ہو اُسے 'تیر روے ترکش' کہتے ہیں۔ جیسے ٹوکرے بھر میں جو عمدہ پھول ہو اُسے 'گل سر سبد' کہتے ہیں۔

ابر است و نوبہار و زمینے شگفتہ　　　ساقی تو ہم بیا بہ جبینے شگفتہ

اور بات فقط وہی ہے کہ جو لطف آنکھوں سے دیکھتے ہیں، الفاظ ہو کر زبان سے ٹپکتے ہیں۔ پھر جب عشق کی منزل میں آتے ہیں تو درد کے پُتلے اور غم واندوہ کی مورت نظر آتے ہیں۔ انصاف یہ ہے کہ ایسے حسن کا عشق بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

نشترِ عشق فرو رفتہ مرا در رگ و پے　　　عشق می گویم و جاں میدہم از لذّتِ وے

لیکن مشکل یہ ہوئی کہ آب و ہوا کا نشو و نما، دلوں کی آسودگی تھی۔ اس پر قومی سلطنت، گھر کی دولت، دل بڑھے ہوئے، دماغ بلند، گویا باروت میں چنگاری پڑ گئی۔ یا شراب میں آگ لگ اٹھی۔ جو مطالب و مقاصد تھے سب بھول گئے۔ ہر چیز میں حسن اور ہر شے میں عشق نظر آنے لگا۔ الٰہی تری اَماں۔ ہر ذرّۂ آفرینش کے دل میں عشق ہے کہ شوق میں اُڑ رہا ہے۔ بُلبُل گل پر، قمری سرو پر، پروانہ شمع پر عاشق۔ لوہا مقناطیس پر عاشق۔ کاہ کہربا پر عاشق۔ شبنم آفتاب پر عاشق۔ چکور چاند پر عاشق۔ لیلائے شب، زلف مشکفام کھولتی ہے۔ صبح گریبان چاک کرتی ہے۔ آسمان کے دل پر بھی داغ عشق ہے۔ وہ کیا؟ آفتاب۔ آفتاب خود وحشت میں سرگرداں ہے۔ مجنونِ اندیشہ، شاہدِ مضمون کی تلاش میں حیران ہے۔ پتھر کے دل میں اس آگ کا چنگا ہے۔ ہر نَے میں آتش عشق ہے کہ نیستان کو پھونک دیتی ہے اور نَے معشوق حقیقی کی یاد میں نالہ و زاری کرتی ہے۔ ایسے ایسے مضامین زبانِ مذکور میں ایسے عام ہو رہے ہیں کہ جہاں چاہتے ہیں ایک اشارہ کر جاتے ہیں۔ سمجھنے والے بے قصد سمجھ جاتے ہیں۔ مزے لیتے ہیں اور وجد کرتے ہیں۔ غیر زبان والے حیران منہ تکتے ہیں کہ یہ کیا باتیں ہیں اور معاملہ کیا ہے۔

یہ فساد نظم سے شروع ہوا۔ نظم فارسی کی تاریخ میں دیکھو گے کہ 6 سو برس سے یہ مضامین آئے اور ایسے آئے کہ زبانِ مذکور پر جاگیر کی طرح قبضہ کر لیا۔ عاشقانہ اشعار پہلے بھی ہوتے تھے مگر نہ اس فضیحت و رسوائی کے ساتھ جو کہ اب ہیں۔ حسن و عشق کی غزل خوانی کا مزا کانوں اور زبانوں میں شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی خوش آوازی سے پہنچا۔ پھر ہر کہ آمد براں مزید کرد۔

عاشقانہ خیالات ایسے دور پہنچے کہ حمد الٰہی بھی انھیں میں ادا ہونے لگی۔ خدا کو معشوق بنایا، آپ عاشق بنے۔ اس کا حسن حقیقی، ان کا عشق حقیقی۔ نعت پیغمبر بھی انہی مطالب میں ادا ہونے لگی۔ خیال در خیال پھیلنے لگے۔ کبھی خدا کو عاشق اور آنحضرت کو معشوق ٹھہرا لیا۔

کبھی بالعکس۔ پھر آپ حضرت کے عاشق بنے اور خدا سے رقابت نکالی۔ :

دل از عشقِ محمدؐ ریش دارم　　　　رقابت باخدائے خویش دارم

یہ درست ہے کہ جب ہم تسبیح و تقدیسِ الٰہی بجالائیں تو چاہیے ایسا مزا آئے جیسے پیارے معشوق سے باتیں کرتے ہیں۔ جب پیشانی سجدہ میں رکھیں تو وہ ذوق شوق دل میں پیدا ہو جو معشوق سے لپٹنے میں ہوتا ہے اور اسی طرح حضراتِ عالی درجات کی یاد میں۔ یہ ایک مثال کم فہموں کے سمجھانے کو دی تھی۔ افسوس کہ نافہموں سے پالا پڑا اور وہ کہیں کے کہیں جا پڑے۔

چھٹا وصف زبانِ فارس کا مبالغہ کلام ہے۔ جس نے صَرافانِ زبان میں اسے بے اعتبار اور کھوٹا کر دیا ہے۔ اکثر سامان طبعی بیان ہوئے جو طبیعتوں میں جوش پیدا کرتے ہیں اور قومی اور ملکی خروش ہیں جو بات کو دل سے اچھال کر زبان پر پھینک دیتے ہیں۔ جس قوم کے نشان نے ہزاروں برس کسی میدان میں سر نہ جھکایا ہو اور علوم، فنون، صنائع بدائع ان کے ہر ولایت میں نمونہ رہے ہوں۔ اگر اُن کا جوش و خروش کلام میں مبالغہ پیدا کرے تو عجب کیا ہے، اور یہاں سے سیکھو کہ کسی زبان کے انداز سے قوم کی گرم خونی، یا سرد مزاجی، ہمت یا بے ہمتی وغیرہ وغیرہ کیونکر معلوم کر سکتے ہیں۔ خیال کرو۔

(1) گھوڑے کے لیے بادپا، تگادر، یکران وغیرہ صدہا اصطلاحیں ہیں۔ تلوار کے لیے برق دم، نہنگ وغیرہ صدہا نام اور صفتیں ہیں اور اسی طرح اور چیزوں کے لیے۔

(2) ہندی کہے گا۔ آرزو ہے کہ ایک دفعہ ایران دیکھوں۔ ایرانی کہے گا۔ داغ ہمیں حسرت ام، بخونِ خودم۔ مے غلطم۔ چہ کنم کہ دستم نمی رسد۔ زمیں سخت است و آسماں دور۔

ہندی عالم مجبوری میں دق ہو کر کہے گا۔ کیا کروں تن بہ تقدیر بیٹھا ہوں۔ ایرانی کہے گا۔ دست از جان شستہ ایم و نشستہ ایم۔ از جان گزشتہ ایم، تن بکشتن دادہ ایم۔

(3) سخت بات پر تحمل نہ کر سکے گا اور کہے گا: چہ گفتی مرد کہ اگر مرد ہستی یکے باز گو۔ گوز بانت کہ از قفا بر کشم (ایک دفعہ پھر تو کہو۔ تیری زبان کہاں ہے کہ گدی میں سے نکال لوں)۔ پیش قبض پر ہاتھ رکھے گا اور کہے گا: حالا زبانت مے برسم۔ طپنچہ پر ہاتھ رکھے گا اور کہے گا: اگر بار دگر گفتی واللہ کہ شکمت پُر آتش میکنم۔ قزلباشانِ کابل نوکر یا غلام پر خفگی میں کہتے ہیں: اے! بزنم گردنت را بہ درۂ خیبر۔

(4) امرِ دشوار کو آسان ظاہر کریں گے تو کہیں گے: آسان کاریست، بے پیچ

است۔ ہیچ حقیقت ندارد۔ ایک ایرانی سے سفرِ حج کے باب میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ہندی نے کہا۔ بڑی دشواری اس سفر میں جہاز کی سواری ہے۔ ایرانی نے کہا: من جہاز را بہ پر کاہے نمگیرم۔ جان شما کہ بہ جوے نمگیرم۔

(5) کسی چیز کو بے قدر و قیمت کہنا ہو تو کہیں گے: بہ جوے نمے ارزد۔ بہ ہیچ نمے ارزد۔ بہ کنجدِ شکستہ نمے ارزد۔ بہ لعنتے نمے ارزد۔

(6) دو چیزوں میں ایک کو ترجیح دیں گے تو کہیں گے: استغفر اللہ ایں چہ نسبت دارد باو۔ ایں بخاکش نمیرسد۔ بہ خاکش نمے ارزد۔ دریں ہر دو از زمین تا آسمان فرق است۔ تمام زبان میں یہی پھول برس رہے ہیں۔ کہاں تک کہوں گا اور کہاں تک سنو گے۔

ساتواں وصف۔ ہر بات کو ظرافت و نزاکت کے رنگ میں ادا کرنا اس زبان کا جوہر طبعی ہے۔ خاص و عام، زن و مرد، بچے سے لے کر بوڑھے تک فصاحت کی مچھلیاں ہیں کہ بیان کے دریا میں تیرتی پھرتی ہیں۔ گلے میں تکلف کی ذرا کھرکھراہٹ نہیں معلوم ہوتی۔

(1) مثلاً ایک دُکان دار سے خریدار نے روٹی مول لی اور کہا۔ کم است آغا۔ دُکاندار کے آگے ترازو ہے۔ چوٹی ایک رسّی میں بندھی جس کا سرا چھت کے قلابہ میں بندھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ اینک (لو دیکھو) اگر جنس کا پلہ جھکتا ہے تو دُکاندار کہتا ہے۔ ترازو سلام میکند آغا (دیکھیے ہم سچے یا آپ؟) اگر برابر ہے تو کہتا ہے نگاہ کنید، عدل است (برابر ہے! اور اشارہ میزان عدل کا ہے کہ میدان قیامت میں کھڑی ہوگی)۔

(2) کئی دن سے گرمی بشدت تھی۔ مینہ برسا اور کھل گیا۔ میں نے ایک ایرانی سے کہا: امروز آبے بر آتش زدند۔ اُس وقت ہوا بند تھی اور گرمی زیادہ ہو گئی تھی اُس نے کہا: بلے۔ مگر آتش بلند تر شد (اور بھڑک اٹھی)۔

(3) ایک ولایتی سے اُس کے لڑکے کے باب میں گفتگو تھی کہ کیا پڑھتا ہے؟ اس نے کہا: سوادے روشن کردہ است۔ گویا پہلے آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ اب ذرا آنکھیں روشن ہوئی ہیں کہ عبارت پڑھنے اور مطلب سمجھنے لگا ہے۔

آٹھواں وصف زبان مذکور کا یہ ہے کہ عیب بھی ہو تو خوبی کے پردہ میں ادا کرتی ہے چنانچہ 'بہرے' 'کوڈر' نہیں کہتے۔ کہتے ہیں: گوشش سنگین۔ گوشش گران است۔

کانڑیں کو یک چشم نہیں کہتے۔ کہتے ہیں: یک چشمش معذور است۔ کبھی کہتے ہیں:

یک چشمش گل دارد۔

بڈھے کو نہیں کہتے کہ مرنے والا ہے۔ کہتے ہیں: آفتابش بر سر کوہ است۔ چراغ سحر یست۔

نواں وصف۔ ایہام کے طور پر عام محاورہ میں سے ایک مضمون شاعرانہ پیدا کرنا اس زبان کا جوہر ہے اور یہ یورپ کی اَور زبانوں میں کم ہے۔ تم جانتے ہو 'سواد شہر'۔

(1) 'سواد لشکر'۔ 'سیاہی لشکر' کثرت اور جمعیت کے معنی پیدا کرتی ہے دیکھو شاعر نے اس میں سے کیا نازک مضمون نکالا ہے :

در نامۂ زمانہ بجز حرف جنگ نیست　　　گویا کہ از سیاہیِ لشکر نوشتہ اند

(2) 'یار فروشی' دوست کی خوبیاں اور کمالات مشہور کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی بنیاد پر فصیح فارس کہتا ہے :

بہر کجا کہ روم وصفِ دوستاں گویم　　　برائے یار فروشی دکاں نمی باید

اسی لحاظ سے خان آرزو کے مقطع کو دیکھو کہ آرزؔو نے کیا لطف پیدا کیا ہے :

بہ یمنِ عشق تو مقبولِ عالمے شدہ ام　　　کدام دل کہ دروے جاے آرزوے تو نیست

بیدؔل کے تخلص کو دیکھو اس رباعی میں کیا کیفیت دکھاتا ہے :

از جرأت اگرچہ منفعل گردیدم　　　و ز شوخی اظہار خجل گردیدم
صد شکر گرفت نامہ ام رنگِ قبول　　　بیدل بودم ہزار دل گردیدم

خاتمہ۔ تقریر کا میدانِ وسیع سامنے ہے اور مطالب کے کاروان قطار قطار چلے آتے ہیں۔ نہ زبان کا چشمہ خشک ہوا ہے، نہ دل کا جوش فرو ہوا۔ جو تھوڑا بہت لکھا گیا، آئندہ خیالات کے پھیلانے کو کافی ہے۔ لطفِ زبان کے طلب گاروں کے لیے رستہ نکل آیا۔ دیکھنے والے دیکھیں گے اور سننے والے سنیں گے۔ اسے پھیلائیں گے اور آپ پھیلیں گے۔ اب کلام کے پھیلاؤ کو سمیٹنا چاہیے کیونکہ وقت مہلت دینے میں بخیل ہے اور سخت زبردست ہے۔ اس کا پھیلا لینا کسی کے اختیار میں نہیں۔

نواں لکچر

زبانِ عربی سے مل کر زبانِ فارسی نے کیا کیا رنگ بدلے

ہر زبان میں بعض حروف ایسے ہوتے ہیں کہ اختلافِ مخارج کے سبب سے ان کا صاف بولنا دوسرے ملک کے لوگوں کو کبھی دشوار اور کبھی ناممکن ہوتا ہے اس کے علاوہ ہر زبان کی ساخت اور اُس کے لفظوں کی حرکات وسکنات اور باہمی ترکیب قدرت نے ایسی رکھی ہے کہ ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں مسلسل کریں تو منہ میں کنکر سا کھٹکتا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ جب دوسری زبان کے قادرالکلام اس کے بعض حروف و حرکات کو اپنے طور پر اُلٹ پلٹ کرلیں تو وہ بھی اُن میں کھپ جاتا ہے۔ اس کو اہلِ عرب تعریب کہتے ہیں۔ عرب میں جب غیر زبان کا لفظ جاتا ہے تو اوّل وہ دیکھتے ہیں کہ اُس میں کوئی حرف اُن کے حروفِ تہجی سے باہر تو نہیں۔ اگر ہوتا ہے تو فوراً بدل لیتے ہیں۔ بعد ازاں دیکھتے ہیں کہ ثلاثی ورباعی وغیرہ میں اُن کے اوزان مخصصہ کے موافق ہے یا نہیں۔ جو فرق ہوتا ہے اسے گھٹا بڑھا کر تراش ڈالتے ہیں۔ فارس کی ملنساری اور مہمان نوازی کو دیکھنا چاہیے کہ عرب کے مہمانوں کے ساتھ اُن کے لفظوں کو کیسی جگہ دی اور کس بے تکلفی سے شیر و شکر ہو گئی۔ اسے ایرانی اُردو کہنا چاہیے۔

ظرافتِ فارس نے یہ لطیفہ بہت خوب کہا۔ مگر فلسفۂ زبان اس موقع پرچُپ رہنا جائز نہیں سمجھتا اور اُس کی گفتگو بھی قابل سننے کے ہے۔ وہ کہتا ہے: "تم جان چکے ہو فارس میں۔ ب عرب کی زبان آئی تو دین، آئین اور دربار سلاطین، بلکہ گھر گھر میں عربی زبان کی عملداری تھی۔ ملک کے اصلی علوم وفنون فنا ہوگئے تھے اور جو علمی خزانے لوگوں کی قسمتوں میں تھے، اس کی کنجی عربی ہی زبان تھی۔ اس لیے ہر شخص کو اس کا سیکھنا واجب تھا۔ اور صحت کے ساتھ اس کا تلفظ نہ ہو تو کلام بے معنی تھا۔ یہی سب ہوا کہ 'قرأت' تعلیم عربی کا ایک فنِ خاص ٹھہر گیا اور اس میں کتابیں تصنیف ہوئیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ عرب کے الفاظ پر عجم کی زبان بے تکلف پھرنے لگی اور اس کے لفظ باوجود بعض حرفوں کے تنافر کے فارسیوں کی زبانوں پر پانی کی طرح رواں ہوگئے۔ نہیں یوں کہو کہ اسبابِ مذکورۂ بالا نے ملک کی زبان کو ایسا مجبور کیا کہ وہ اَور زبانوں کی طرح عربی الفاظ پر اپنی تراش و تبدیل کی قینچی نہ چلا سکے اور جو کچھ کیا بہت کم ہے۔ بعض بعض مقاموں میں اہلِ زبان نے شوخیِ طبع کی جولانیاں بھی دکھائی ہیں۔ چنانچہ میں آج کے لیکچر میں وہ باتیں بھی بیان کروں گا۔

سب جانتے ہیں کہ فارسی میں عربی کے لفظ بہت ملے ہوئے ہیں۔ مگر قاعدہ ہے کہ جو چیز ہر وقت کام میں آتی رہتی ہے۔ اُس کے ذرہ ذرہ سے فرق پر خیال اٹکتا نہیں اور اگر اُس کے نکتہ نکتہ پر خیال کریں تو عجب لطف حاصل ہوتا ہے۔

(1) سب سے پہلے یہ کہ اُس نے اپنے حروف تہجّی کو اور اپنی تحریر کو یک قلم دل سے بھلا دیا۔ جس میں اعراب بھی حرفوں سے ظاہر ہوتے تھے۔

ء ا ع۔ اور۔ ت ط۔ اور۔ ث س ص۔ اور۔ ذ ز ض ظ کے فرق اگرچہ تلفظ میں نہ دکھا سکے مگر ان کی املا میں ایک جگہ بھی چوکنا گناہِ خدا اور جرمِ حاکم سے سخت تر سمجھا۔

تم جانتے ہو کہ عربی زبان کے تلفظ میں فارسی کے تلفظ سے مشرق ومغرب کا فرق ہے۔ اوّل تو عربی میں 8 حرف ایسے موجود ہیں جو فارسی میں آتے ہی نہیں۔ اسی طرح مشدّد لفظ فارسی میں نہیں آتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ باوجود اس کے دیکھو کہ اس نے عربی کے لفظوں کو جوں کا توں لیا اور صحیح سلامت امانت رکھا۔

(2) عربی لفظ کو بجنسہٖ اور اس طرح اپنا مضاف کرلیا گویا اپنے ملک کا مال ہے مثلاً حکمِ شاہ۔ مرادِ دل۔ واقفِ راز۔ اہلِ نیاز وغیرہ۔

(3) مضاف الیہ بنالیا مثلاً دانائے اسرار۔ کارِ خیر۔ روشنیِ طبع وغیرہ۔

(4) دو عربی لفظوں میں اپنی اضافت پیدا کی مثلاً بشارۃِ فتح۔ تائیدِ غیب وغیرہ

(5) عربی لفظ کو فارسی لفظ کی صفت ڈالا مثلاً کارِ خیر۔ شاہِ عادل۔ بندۂ مطیع۔ بلکہ مرکبات کو بھی مثلاً فرمانِ واجب الاذعان۔

(6) عربی لفظ کو موصوف اور فارسی کو صفت ڈالا مثلاً ثمرِ شیریں۔ بنائے بلند۔ سفرِ خجستہ۔ سفرِ سعادت اثر۔ سفرِ محمود العاقبۃ۔

(7) دو عربی لفظوں کو فارسی طور پر صفت ڈالا مثلاً تاکیدِ تمام۔ دولتِ وافر۔ منشورِ لامع النور۔ وغیرہ۔

(8) کتابت میں بھی عربی الفاظ پر فارسیانہ تصرف کیے۔ مثلاً

(اضافت میں) روضۂ جنت۔ سلسلۂ خاندان جس طرح فارسی لفظوں میں ہے مختفی پر "ہ" لکھتے ہیں

(صفت میں) نکتۂ برجستہ۔ لطیفۂ نمکین اسی طرح یہاں لکھ دیا)

(9) عربی الفاظ کو فارسی میں ترکیب دے کر تشبیہیں اور استعارے پیدا کیے مثلاً۔ شاہدِ گل۔ رامشگر بلبل۔ شاہد شمع۔ توسن دولت۔ بیکران اقبال۔

(10) جن عربی الفاظ کے اخیر میں الف تھا ان پر اضافت میں الفاظ فارسی کی طرح 'ے' زیادہ کر دی مثلاً بلائے آسمان۔ غذائے روح۔

(11) فارسی کے دو لفظوں کو باہم ترکیب دے کر صفتِ تالیفی بنایا کرتے تھے۔ اُسی طرح عربی و فارسی لفظوں کے ارتباط سے بنانے لگے مثلاً اقبال نشان۔ فصیح زبان۔ بے نظیر۔ باتدبیر۔

دو عربی لفظوں کو اسی طرح ترکیب دیتے ہیں مثلاً صاحب کمال۔ یوسف جمال۔ حمیدہ خصال۔

(12) عربی لفظوں میں حروف فاعلی۔ صفتی۔ ظرفی۔ تصغیری اس طرح لگاتے ہیں گویا فارسی لفظ ہیں مثلاً دولت مند۔ غمگین۔ طربناک۔ جفاکار۔ عدل پرور۔ کافر کیش۔ صنمکدہ۔ طفلک۔ ابوالفضل نے کہا ہے۔ بفہمک ناقصک خود چناں سنجیدہ ام۔

(13) عربی لفظوں میں اس طرح یائے مصدری لگاتے ہیں گویا فارسی ہیں۔ مثلاً زیادتی۔ سلامتی۔ صفائی۔ انتظاری۔ (مرکبات میں بھی)۔ خوش اخلاقی۔ دولت مندی۔

اقبال بلندی۔

(14) اکثر الفاظ عربی کے معنوں میں تصرف کر کے استعمال کیا۔ مثلاً :

سیر۔ عربی میں بمعنی رفتار ہے۔ اب فقط دیکھنے کے معنوں میں بولتے ہیں۔ شیراز میں اس کا بہت استعمال ہے۔ کہتے ہیں۔ سیر کنید (یعنی نگاہ کنید۔ ادھر دیکھو) ایں خانہ را سیر کردید؟ قابل سکونت نیست۔ امروز اسپ شکار اسیر کردم خیلے چاق شدہ۔

شمۃ۔ شم۔ عربی میں بمعنی 'شمید' ہے۔ یعنی سونگھنا۔ یہ ایسی ذری سی چیز کو کہتے ہیں جو سونگھنے کے لیے کافی ہو۔ شیخ سعدی نے کہا ع وزیر اندریں شمۂ راہ برد۔ (فقرہ) شمۂ از احوال خود باز نمود۔

ارتفاع۔ عربی میں بلندی۔ فارسی میں آمدنِ سالانہ کو کہتے ہیں۔ گلستان میں ہے۔ ارتفاع ولایت نقصان پذیرفت۔

فلک۔ عربی میں آسمان ہے۔ اہلِ فارس ایک لکڑی میں چھید کر کے اونچا باندھتے ہیں اس میں گنہگار کے پاؤں ڈال کر الٹا لٹکا دیتے ہیں اور کوڑے مارتے ہیں۔ اسے 'فلک' کہتے ہیں۔

سبق۔ عربی میں سبقت اور گھوڑ دوڑ کو کہتے ہیں۔ فارسی میں وہی سبق ہے جو اُستاد سے پڑھتے ہیں۔

محو۔ عربی میں مٹانے کو کہتے ہیں۔ فارسی والے محو بمعنی عاشق استعمال کرتے ہیں۔

(15) عربی میں بعض الفاظ جمع ہیں۔ یہ انھیں واحد تعبیر کرتے ہیں مثلاً :

عسس عربی میں جمع 'عاس' ہے۔ یہ 'عسس' کو توال کو کہتے ہیں۔

وقایع جمع 'واقعہ' ہے۔ یہ واحد تعبیر کرتے ہیں۔

حقایق جمع 'حقیقۃ' ہے۔ ابوالفضل نے کہا :

تراز کاف کفرت ہم خبر نیست حقائق ہاے ایماں را چہ دانی

آمال جمع 'اَمَل' ہے۔ صائب نے کہا :

ہر چند صائب میروم سامان نومیدی کنم
زلفش بدستم میدہد سر رشتۂ آمال ہا

(16) عربی لفظوں سے فارسی طور پر اشتقاق کرتے ہیں۔ مثلاً :

فہم سے فہمیدن۔ غارت سے غارتیدن۔ شمّ سے شمیدن

"سیر" بمعنی رفتار ہے۔ عرفی نے کہا:

کرم گفتا پرستار است بے غیر بیا دستِ تحمل گیر و مے سیر

"تمیز" عربی لفظ ہے۔ سالک یزدی نے فارسی طور پر اشتقاق کیا:

سالک نفروشند بما بادۂ صافی کو ذائقہ محتسبے تا بتمیزد

(تمیز کردن)

اسمائے جامد سے بھی اشتقاق کرتے ہیں۔ مگر یہ ظرافت میں داخل ہے مثلاً:

اگر بے تو یک دم شرابیدہ باشم بہ کانونِ ہجرت کبابیدہ باشم

(طرزی)

مدنیدیم پس از مکّیدن نہ بکس حیلہ و نے مکریدن

مرقدِ پاک نبی طوفیدیم عمریدیم و ابابکریدیم

(17) فارسی لفظوں کو عربی لفظوں کے قالب میں ڈھال لیتے ہیں۔ مثلاً زلف مُتر ّش۔ لباس مُزیّب۔ معجون مُنہّی، جام مُلبّب۔ لوح مُطلاّ۔ موے مُزلّف۔ جامۂ مُزرکش۔ مرد مفلوک (فلک زدہ)۔ فلاکت۔ نزاکت۔ بادشاہت۔ تکشمُر (کشمیری بننا)۔

(18) فارسی لفظوں کی عربی جمع بنالیتے ہیں۔ مثلاً تراکمۂ اُرگنج۔ افاغنۂ کابل۔ تکاکرۂ ہند۔ فرامین شاہی۔ اہل دفتر کی اصطلاح میں مدّ نزدات۔ پرگنات۔ باغات۔

(19) فارسی لفظوں کو عربی طور پر ترکیب دیتے ہیں۔ نعمت خان عالی نے کہا:

گُل مگر بانگِ اناالیار بگلشن زدہ است بر سرِ دار خیالِ سرِ منصور کنم

(خاقانی)

تا مہر تو گشت نور افشاں ذوالخورشیدین شد شتاباں

تاریخ ہفت اقلیم میں خواجہ حسن دہلوی کے حال میں لکھا ہے۔ وے در آخر عمر 'حسب الفرمود' بادشاہِ وقت سلطان تغلق بہ 'دیوگر' رفت۔

ابوالفضل نے اپنی انشا کے دفتر سوم میں 'عبدالخواہش' لکھا ہے۔

بیدل نے کہا ع 'النوید' آفتاب عالمتاب

نور چشمی قبلہ گاہی میں دیکھو یائے متکلم لگائی ہے۔

(20) عربی کے مشدّد لفظ کو مخفف کر لیتے ہیں۔ نظامی نے نیّت کو تخفیف باندھا۔

پناہندہ را یاد کرد از نخست　　　'ہنیت' کرد بر کامگاری درست

اسی طرح 'محویّت' کو 'محوِیَت' ایک شاعر نے باندھا :

کیست آئینہ کہ باحیرت من چہرہ شود　　　ہمہ تن 'محوِیَتِ' عربدہ سازم کردند

خاصّ اور خاصیّت مشدّد ہیں۔ اب خاص و عام مخفف بولتے ہیں :

ایں ہدیہ خاص اوست کہ آثار بذل شاہ　　　چوں آفتاب خاصیتِ خود گرفتہ است

اسی طرح غم ہم حق وغیرہ بہت الفاظ ہیں۔

(21) کبھی لفظ و معنی دونوں میں تصرف کرتے ہیں مثلاً :

کیفیّت بالتشدید بمعنی چگونگی ہے۔ انھوں نے بالتخفیف 'کیفیت' سے نشے کا سرور مراد لیا۔ شمشیر گرمتی :

مے کو زدستِ ساقیِ مشکیں کلالہ نیست　　　در صد سبوش 'کیفیتِ' یک پیالہ نیست

طامات عربی میں بالتشدید بمعنی مصیبت و حادثۂ عظیم ہے۔ یہ طامات صوفیہ کے مقالات نامشروع کو کہتے ہیں۔

نظّارہ عربی میں جمع ہے دیکھنے والوں کو کہتے ہیں۔ یہ 'نظّارہ' اور 'نظارہ' نظر بھر دیکھنے کو کہتے ہیں۔

غشی عربی میں بیہوشی کو کہتے ہیں۔ یہ 'غش کردن' بمعنی 'فریفتہ شدن' بھی بولتے ہیں۔

(22) الفاظ عربی سے اہل عرب کے طور پر لفظ مشتق کیے ہیں۔ حالانکہ وہ اشتقاق عرب کے محاورہ میں نہیں آئے مثلاً :

عربی میں 'یاس' سے 'یؤوس' آیا ہے۔ انھوں نے مایوس نکالا اور اس لفظ نے ایسا رواج پایا کہ محتاج بیان نہیں۔

اسی طرح مرسول بمعنی 'مُرسَل'۔ عرفی نے کہا ہے :

قضا بہ حاکم دانش نوشتہ مصلحتے　　　فلک نہ دیدہ کہ 'مرسول' او چہ مضمون است

ماثور بمعنی متاثر۔ عرفی نے کہا :

اگرچہ ہست مبرہن کہ در مسیر وجود　　　مؤثر اند صفاتِ الٰہ نے ماثور

عربی میں 'اصَمّ' بہرے کو کہتے ہیں۔ انھوں نے صمیم نکالا۔ عرفی نے کہا ہے :

نوائے مرثیۂ صوم و شادیانۂ عید کشادہ از اثر انبساط گوش صمیم

اسی طرح مروّج کی جگہ بدر چاچ نے رائج کہا ع

مشتری نہاد نقدے رائجے دربار من

(23) شعرائے اہل زبان نے کہ قادر الکلامی ان کی مسلم الثبوت ہے۔ بعض الفاظ عربی میں حروف ساکن کو متحرک باندھا۔ سعدی :

عفو کردم از وے عملہائے زشت بفضل خودش آورم در بہشت

(ناصر خسرو)

اگر سہوے بود دروئے عَفُو کن دریدہ پردۂ کارم رَفُو کن

دو قرن از کرمت در دو جہاں بردہ نواست توچہ دانی کہ جہاں بے توچہ بے برگ و نواست

(24) اسی طرح متحرک کو ساکن کردیتے ہیں مثلاً مُتَواری کو مُتْواری۔ کمال اسماعیل :

دمے کہ عقرب کلکش بہ جنبش آرد نیش شود حسود بہ سوراخ مار متواری

(منوچہری)

بود آں تیغ وے ہنگام ہیجا چناں دیبائے بوقلموں ملوّن

(صحیح بوقلموں)

لیکن الفاظ مذکور جہاں آگئے وہیں درست ہیں اُور جگہ استعمال نہیں کرسکتے نہ اس قیاس پر ہم متحرک کو ساکن یا ساکن کو متحرک کرسکتے ہیں۔

(25) عربی لفظ میں سے بعض حروف کو حذف کردیتے ہیں مثلاً 'مواسات' سے 'مواسا'۔ 'محاکات' سے 'محاکا' وغیرہ۔ اس میں بھی جہاں تک اہلِ زبان نے تصرف کیا وہیں تک جائز ہے۔ ان پر قیاس کرکے 'ملاقات' کی جگہ 'ملاقا' نہیں کرسکتے۔

اسی طرح 'تمییز' سے 'تمیز' اور 'تغییر' سے 'تغیر' کرکے 'ی' گرادیتے ہیں :

مسکین خر اگرچہ بے تمیز است چوں بار ہمے برد عزیز است

اسی طرح 'مصئون' کو 'مصون' بوزن زبون کردیا۔ ظہوری نے کہا ہے :

خدا پیرایہ بخشد از قبولش مُصُوں دارد ز ردِّ ہر فضولش

بعض نے عیال مند کو یال مند کہا مگر وہ اُسی موقع کے لیے رہا جہاں کہنے والا کہہ گیا۔

اسی طرح :

ابونصر ابوجہل ابولہب امّ غیلاں ابواسحاق اطعمہ ارسطاطالیس

بونصر بوجہل بولہب مغیلاں بسحق اطعمہ سطاطالیس

اصطرلاب سے صطرلاب۔ صُلّاب۔ نظامی نے کہا ہے :

ہمہ زیچ و صُلّاب برداشتند براں کار یک ہفتہ نگزاشتند

(26) عربی کے مرکب لفظوں کو فارسی میں اس طرح ترتیب دیتے ہیں گویا فارسی کے مفرد لفظ ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں: ایں مطلب تفصیل علیٰحدہ میخواہد۔ اور۔ اوبمکانے علیٰحدہ نشستہ بود۔ تم جانتے ہو کہ 'علیٰ' حرف جر ہے اور وحدہ میں سے 'و' گرا کر اُس کے عوض 'ۃ' بڑھادی ہے۔ پس علیٰحِدہ۔ علیٰ حِدَۃٍ سے مرکب ہے۔

'ماجریٰ' کو موصوف کر کے کہتے ہیں: ماجراے عجیبے ست۔ اور الٹ کر کہتے ہیں۔

ع

عجیب واقعہ و طرفہ ماجرائے ہست

اسی طرح کہتے ہیں: اِتلافِ حقوقِ خلاف شیوۂ انسانیت است فکیف کہ در حقِ برادران و خویشان! اور آج کل کے محاورہ میں لکھتے ہیں: مدتیست کہ از کیف شما آگہی نداریم (از حال شما)

اور کہتے ہیں: اگرچہ از دیانت و خیانتش خبر ندارم مع ذٰلک از احوالش غافل نباید بود۔

ایں برأسہٖ نسخہ ست علیٰحدہ۔

مرزا بیدل اپنے رقعات میں ایک پرانی کتاب کی کہنگی اور کرم خوردگی کے باب میں کہتے ہیں: نخستیں جریدۂ کہ منقول عنۂ لوح محفوظش تواں گفت امروز بنظر آمد۔ دیکھو 'منقول عنہ' کو مضاف کیا ہے اور اضافت کی زیر کو کس طرح 'عنہ' کی 'ہ' پر ڈالا ہے۔

لفافوں پر لکھتے ہیں: لفافۂ ہٰذا۔ بموجب قاعدہ کے ہٰذہ چاہیے کیونکہ لفافہ میں تاے تانیث موجود ہے۔

اسی قبیل سے ہے: 'عقدۂ مالاینحل' جملہ موصولہ صفت واقع ہوا ہے۔

اسی قبیل سے ہے۔ 'بدل مایتحلل' جملہ موصولہ مضاف الیہ پڑا ہے۔

'یعنی'۔ واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ یہ اسے اس طرح بولتے ہیں جیسے فارسی کا حرف تفسیر اور 'یعنی چہ' جو محاورہ عام ہو رہا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ صائب نے کہا :

دلبرا طرح نوانداختہ 'یعنی چہ' جامہ را فاختہ ساختہ 'یعنی چہ'

اگر صحت پر خیال کریں تو 'تعنی چہ' کہنا چاہیے۔ لیکن اب محاورہ اور استعمال کی سند سے یہ غلطی ایسی زبانوں پر چڑھ گئی ہے کہ صحیح بولیں تو مسخراپن معلوم ہوتا ہے۔

(27) کبھی ایک حرف کے ساتھ دوسرا حرف ہوتا ہے اور مجموعہ کو ایک حرف سمجھ کر فقط ایک معنی اعتبار کرتے ہیں۔ دوسرے کا بالکل لحاظ نہیں کرتے چنانچہ 'ولیکن'۔ عربی میں 'واو' عاطفہ حرف استثنا پر ہے۔ یہ کل کو ایک حرف استثنا شمار کرتے ہیں:

ولیکن خداوند بالا و پست بہ عصیاں درِ رزق بر کس نہ بست

'بل' عربی میں ترقی یا اضراب یا اعراض کے لیے آتا ہے۔ انھوں نے بلکہ بعض موقع پر بمعنی شاید استعمال کیا:

در سرو و گل و یاسمن ایں نور نہ دیدم ہنگامۂ مرغانِ چمن بلکہ تو باشی

(28) بعض تعلیلی تغیر کیے۔ مثلاً حاجّ بالتشدید تھا۔ انھوں نے تخفیف کر کے ایک 'ی' زیادہ کردی۔ اب سب حاجی کہتے ہیں۔

محفّہ پردہ دار کجاوہ جو اونٹ پر کسا جاتا ہے۔ انھوں نے محافہ بنالیا۔

غُدّہ عربی لفظ ہے انھوں نے 'غدود' بنالیا:

خدنگ عقدہ کشائے تو بایدم کہ غمت درون سینہ گرہ گشتہ چوں غدود مرا

ولے مخفف ولیکن کا ہے۔ سعدی ع ولے زبا طنش ایمن مباش و غرّہ مشو

(29) اس ہجومِ الفاظ اور شورشِ تصرفات میں ہزاروں عربی الفاظ نظر آتے ہیں۔ اُن کے فارسی الفاظ ایسے گم ہوئے کہ گویا ملک کی زبان میں ان کے لیے لفظ ہی نہ تھا۔ یہاں چند عربی لفظ لکھتا ہوں جو خاص و عام کے روزمرہ میں رائج ہیں۔ اوّل وہ چیزیں لکھتا ہوں جو عام لوگوں کی نظر میں عرب سے آئیں اور اپنے نام ساتھ لائیں مثلاً لباس میں عمامہ جبّہ برقع عبا۔ وغیرہ۔ کیا عجب ہے کہ فارس میں بھی یہ یا اس قسم کی اشیا ہوں اور ان کا نام بھی ہو۔

اکثر چیزیں ہیں کہ فارس میں تھیں مگر اب عربی لفظ ان کی جگہ اس طرح کام دے رہے ہیں کہ اگر کتابوں میں ڈھونڈ کر ان کے لیے فارسی الفاظ نکالیں اور بولیں تو کوئی سمجھے بھی نہیں۔ یا مطلب اصلی فوت ہو جائے مثلاً کتاب۔ صفحہ۔ سطر۔ فصل۔ باب۔ اسم۔ فعل۔ حرف۔ غزل۔ قصیدہ۔ وکیل۔ قاضی۔ مفتی۔ فتویٰ۔ صندوق۔ حمام۔ پانچوں انگلیوں کے نام۔ دانتوں

کے نام۔ ساقی۔ تنور۔ شمع۔ عید۔ قلیان (غلیان)۔ دلال۔ فراش۔ جلاد۔ صراف۔ بیطار۔ مسخرہ۔ صورت۔ شکل۔ شبیہ۔ کرسی۔ رکاب۔ نعل۔ عقیدہ۔ تہمت۔ وفا۔ الزام۔ سیر تماشا۔ غلط۔ صحیح۔ قبالہ۔ ضمانت۔ ضامن۔ وکیل۔ قمری۔

(30) بعض باتیں اپنے ملک کے ساتھ خصوصیت رکھتی تھیں انھیں چھوڑدیا۔ ان کی جگہ وہ باتیں اختیار کیں جو عرب کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔

فردوسی وغیرہ قدیم شاعر تاریخی بات کو دہقان پیر کی طرف نسبت کرتے تھے۔ انھوں نے داستان کی ابتدا میں تمہید اختیار کی: حاکیانِ اسمار در ادیانِ اثار عروس ایں حکایت در حجلہ بیان چنیں جلوہ دادہ اند۔

سمر۔ عرب کے بیاباں گرد قبیلے اپنے ریگستانوں میں جابجا سفر کرتے اور اترتے پھرتے تھے اور اسی عالم میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جب چاندنی رات ہوتی تو اپنی اپنی تنبوٹیوں اور تانے ہوئے کمبلوں سے نکل بیٹھتے اور کہانیاں کہہ کر جی خوش کرتے۔ عربی میں چاندنی کو 'سَمَر' کہتے ہیں۔ چونکہ یہ کہانیاں چاندنی رات میں ہوتی تھیں اس لیے کہانی کو بھی 'سَمَر' کہنے لگے۔

نعمان ابن منذر نے عرب میں 'لالہ' کا تخم پہنچایا۔ ایک دن باغ میں چلتے پھرتے لالہ کے تختہ پر گزر ہوا۔ رنگارنگ کے پھول دیکھ کر دل شگفتہ ہوا۔ چونکہ عربی میں شقائق بمعنی رنگارنگ ہے۔ اس کی زبان سے نکلا مَا اَحْسَنُ الشَّقَایِقُ (کیا بوقلمونی ہے)۔ عرب کے لوگ اسے 'شقائق النعمان' کہنے لگے۔ اب یہ بھی اپنی زبان میں شقائق النعمان استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ شقائق النعمان تھا تو اُن کے لیے تھا، نہ کہ ان کے لیے۔

عرب کے لوگ اقصائے مغرب کے سونے کو کھرا سمجھتے تھے اور اسی واسطے زرِ خالص کو زرِ مغربی کہتے تھے۔ انھوں نے بھی 'زرِ دہ گانی' اور 'زرِ دہ دہی' کی جگہ 'زرِ مغربی' اختیار کیا۔ کھوٹے سونے کو وہ 'پنچی' کہتے ہیں۔

جعفر برمکی نے خلفائے عباسیہ کی وزارت میں اپنے عمدہ انتظاموں میں ایک یادگار یہ بھی چھوڑی کہ سکہ ہائے سابق کو تڑوا کر سونے کو خالص کیا اور خلفائے وقت کی ضرب اس پر لگائی چنانچہ وہاں 'زرِ جعفری' اپنے کھرے پن میں مشہور تھا۔ اِنھوں نے وہی اختیار کیا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے تاریخی اشارے چھوڑ کر عرب اور اسلام کے نئے اور

پُرانے حوالے اختیار کیے۔ مثلاً نوح کا طوفان، خضر کی رہنمائی، عیسیٰ کی جان بخشی، موسیٰ کا عصا، مریم کی پاک دامنی، عرش، کرسی اور کعبہ کی بزرگی، ذوالفقار کی بُرِش وغیرہ وغیرہ۔

اکثر جگہ مذہبی محبت کو چھوڑ کر عرب کی عام مشہور باتوں کو بھی لیا چنانچہ لیلیٰ، عذرا، سلمیٰ، سعاد کا حسن۔ مجنوں، وامق کا عشق ایسا بھایا کہ ویس و رامین کے قصہ کو بھول گئے۔ خورنق، سدیر کی عمارتوں کی خوبی۔ سِنمار کی دستکاری نے قصر شیریں اور طاق بستان سے پہلو مارا۔ کوہ بوقبیس کی بلندی نے کوہ الوند اور بے ستون کا مقابلہ کیا۔

(31) اصولِ انشا کے شیرازہ بند جانتے ہیں کہ ایک زبان کے محاورہ کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز نہیں مگر یہاں ہوا اور وہی محاورہ ہو گیا۔ چنانچہ اہلِ عرب علما کو ارباب العمائم کہتے تھے۔ شیخ شیراز نے اس کا ترجمہ کیا :

چو قاضی بہ حکمت نویسد سجل　　　نگردد 'ز دستار بنداں' خجل

عرب میں ضرب المثل ہے اَلنَّوْمُ اَخُ الْمَوْتِ۔ بدر چاچ نے اس سے مضمون نکالا :

چو دید دولتِ بیدار ت از جہان بگریخت　　　گرفتہ دست برادر اَجَل بخیل و حشم

عرب میں محاورہ ہے وَ بِقَطْعِ النَّظَرِ عَنْ ذٰلِكَ اہل فارس لکھتے ہیں۔ و چشم بریدہ ازاں میگزیم کہ چنیں است و چنان است۔ غور کرو تو چنین و چناں بھی کَذَا وَکَذَا کا ترجمہ ہے۔

عرب میں عَلَیْكَ اَنْ تَفْعَلَ کَذَا وَ کَذَا اہل فارس کہتے ہیں۔ بر تو باد (یعنی از قبیل واجبات است بر تو کہ چنیں و چناں بعمل آری)۔

عرب میں اِلَیْكَ عَنِّیْ۔ بخود باش

عرب میں یَا لِلْعَجَبْ۔ انھوں نے اس کا ترجمہ کیا۔ 'اے عجب' اور 'اے شگفت' شیخ شیراز جابجا کہتے ہیں :

شنید ایں سخن مرد صاحب ادب　　　بہ تندی بر آشفت و گفت 'اے عجب'

عرب میں وَ مِنْ هٰهُنَا۔ انھوں نے کہا وازینجاست (ہمیں سبب)

عرب میں وَمِنْ ثَمَّ۔ وازینجاست (یعنی ہمیں سبب است)۔

عرب میں بناء علیٰ ذٰلِكَ۔ بریں بنا۔ بنابریں۔ بریں بنیاد کردہ میگویم۔

عرب میں وَلَهٗ یَدٌ فِیْ ذٰلِكَ۔ اودریں کار دستے دارد۔

عرب میں بِرَاسِہٖ۔ سر خود اس کا ترجمہ ہے۔ نعمت خان عالی وقایع میں کہتے ہیں :
حضرت میر بذات خود پیرے ہستند و سر خود میرے۔
عرب میں سَوَادُ الْعَسْکَرِ۔ سیاہی لشکر اس کا ترجمہ ہے۔ اس سے خوشنما افعال مشتق کیے۔ لشکر سیاہی کرد (یعنی سامنے سے نمودار ہوا)۔ کیا خوب کہا ہے فصیح فارس نے :

در نامہ زمانہ بجز حرف جنگ نیست — گویا کہ از سیاہیِ لشکر نوشتہ اند

عرب میں قَامَ الْحَرْبُ عَلیٰ سَاق۔ شاید اسی کا ترجمہ ہے۔ جنگ برپا شد۔ اور۔ قیامت برپا شد۔
قرآن میں آیا ہے۔ وَالصُّبحِ اِذَا تَنَفَّسَ۔ انھوں نے اس سے مضمون پیدا کیا۔ قدسی :

ساقی بہ صبوحی نفسے پیشتر از صبح — برخیز کہ تا صبح شدن تاب ندارم

اور 'نفس زدن صبح' کا استعارہ اکثر اہل انشا میں عام ہے۔ بدر چاچ :

چوں صبح کہ زدیک نفس از سینۂ پر سوز — کے مَیل بخواب آید و مہرش بہ خور افتد

مطلع

صبح صادق گر نمیز د دم بہ مہر بوتراب — تکمۂ چاکِ گریبانش نمیشد آفتاب

اہلِ عرب موصول کو منادیٰ کرتے ہیں مثلاً ع یا من غدا لی سَاعداً وَ مساعِداً دَوْنَ الْبَشَرَ (اے کسے کہ گشتی برائے من معاون پیش مردم) شیخ شیراز فرماتے ہیں :

ع بیا اے کہ عمرت بہفتاد رفت
ع اے آنکہ باقبال تو در عالم نیست
ع اے کہ پنجاہ رفت و در خوابی

عرب میں قَبَّلَ الْاَرضَ بَیْنَ یَدَیْہِ۔ زمین خدمت بوسید۔ لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادب کی رسم دونوں ملکوں میں یکساں ہو گی۔
عرب میں اِحْیَاءُ اللَّیْلِ۔ عرب میں شب بیداری کو کہتے ہیں۔ یہاں شیخ شیراز نے کہا ع

خردمند عثمانِ شب زندہ دار

(32) بعض محاورات ایسے ترجمہ ہو گئے ہیں جن کا اتحاد اتفاقی معلوم ہوتا ہے کیونکہ اقتضائے عقلی واقعہ مذکورہ کے لیے یہی لفظ تجویز کرتا ہے خواہ عرب میں ہو خواہ فارس میں۔

مثلاً :

طَوِیْلُ الْبَاع۔ عرب کا محاورہ ہے۔ فارس میں اس کے لیے فراخ دست اور دست رسا ہے۔

قَصِیْرُ الْبَاع۔ عرب کا محاورہ ہے۔ فارس میں کوتاہ دست۔ ظہوری بادشاہ کی تعریف میں کہتا ہے

کوتاہ دستانِ بلند حوصلہ ہر چہ شب بخواب بینند۔ صبح از باغ سخایش گل مراد چینند۔

شیخ سعدی نے کہا ہے :

قوی باز دانند کوتاہ دست خردمند و شیدا و ہشیار و مست

جرّ الذّیول۔ عرب کا محاورہ ہے۔ خرام متکبّرانہ مراد ہے۔ دامن کشاں رفتن سے انھوں نے بھی ناز و انداز دکھائے ہیں۔

دَمْعُ الشَّمْع۔ عرب کا محاورہ ہے۔ شمع سے جو چربی بہتی ہے۔ فارس میں بھی اسے اشکِ شمع کہتے ہیں۔

بِالرَّاسِ وَ الْعَیْنِ۔ عرب کا محاورہ ہے۔ بسر و چشم۔ بچشم اور چشم بھی کہتے ہیں۔

قَرَّۃُ الْعُیُوْن۔ عرب کا محاورہ ہے۔ خنکیِ چشم ہر ملک میں باعث صحت چشم ہے۔ عجب نہیں کہ ہر ایک اپنے محاورہ کا مالک ہو۔

رَطْبُ اللّسَان۔ عرب کا محاورہ ہے۔ تر زبان ہر ملک میں خشکی زبان ہارج تکلّم ہے۔

بِنْتُ الْعِنَبْ۔ عرب کا محاورہ ہے۔ فارس میں 'دختر رز' کہتے ہیں۔ شاعر نے اس سے

بِنْتُ الْکَرُم عجیب رنگین مضمون پیدا کیا ہے :

ساقیاں دختر پیرے کہ فرو ماندہ ز تاک
خوب کردند کہ در گردنِ مینا بستند

غِزَالَہ۔ عربی میں آفتاب کو کہتے ہیں۔ بدر چاچ نے اس کا ٹھیک ترجمہ کیا :

سبزہ زار آسماں را در پناہِ عدل او مرتع آہوے مادہ سینۂ شیرِ نر است

بِنَاتُ النَّعْش۔ عرب کا محاورہ ہے۔ فارس میں دخترانِ نعش۔ ع

چوں دختران نعش بہ پیرامن جدی

ذَنَبُ السِّرْحَانِ۔ عرب کا محاورہ ہے۔ فارس میں 'دُمِ گرگ' اس کا ترجمہ کیا کہ صبح کاذب سے مراد ہے۔

مَاءُ الْحَيَاة۔ عرب کا محاورہ ہے۔ فارس میں آب حیاۃ۔ آبِ زندگی۔

فَرْزِينُ هٰذِهِ الرُّقْعَه عرب کا محاورہ ہے مگر نہیں کہہ سکتا کہ کس نے کس سے لیا ہے۔ سعدی :

تو دانی کہ فرزین ایں رقعہ ام نصیحت گرِ شاہ ایں بقعہ ام

کبھی برعکس اس کے محاورۂ فارس کے لیے عربی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً 'راہ دادن' کی جگہ "طریق دادن' :

دو خواہند بودن بہ محشر رفیق ندانم گدایاں دہندم طریق

خاتمہ

عزیزانِ وطن! میٹھی زبان نے شیر کو شکر میں ملا کر دکھادیا کہ میں جس قوم کی زبان ہوں ملنساری اس کی کس حد کو پہنچی ہے۔ آزاد اپنی کم زبانی سے شرمندہ ہے کہ بیان کا حق ادا نہ کرسکا۔ پھر بھی جو کچھ کہا گیا سمجھنے سمجھانے کو کافی ہے۔ اب ایک اور مطلب کی سماعت پر مستعد ہونا چاہیے جو کہ خاص اپنے ملک سے متعلق ہے۔ یعنی فارسی زبان جب ہندستان میں آئی تو اُس سے اور ہندی سے کیا معاملے گزرے۔ اس مضمون کو جلسۂ آئندہ پر ملتوی رکھ کر حاضرین شائقین سے رخصت چاہتا ہوں :

اب تو جاتے ہیں میکدہ سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

دسواں لکچر

فارسی پر ہندُستان میں آکر کیا کیا رنگ چڑھے

عربی نے جو جو اثر فارسی پر کیے۔ اکثر تم نے سُن لیے۔ اب ذرا دیکھو کہ خود فارسی جب عربی سے رنگین ہو کر ہندُستان میں آئی تو وہ ہندی کے ساتھ کس طرح پیش آئی اور ہندی نے اُس پر کیا کیا رنگ چڑھائے۔ اوّل تو یہی دیکھو کہ یہاں اُردو ایک نئی زبان پیدا کر دی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود اپنے سلسلہ میں بھی بہت سے ہندی لفظوں کو جگہ دی۔ ہندُستان میں جو مسلمان آئے تو زیادہ تر تُرک قوم کے بادشاہ آئے۔ مگر تعجب ہے کہ تصنیفات ان کی یا عربی میں رہیں یا فارسی میں۔

سلاطینِ چغتائیہ کے عہد میں بھی دربار کی زبان فارسی رہی مگر ملک کی خاک اور قوم کی تاثیر بھی موجود تھی۔ سیکڑوں ہندی لفظ اس میں بولتے تھے اور لکھتے تھے۔ جہانگیر کے ہاں خورم (شاہجہاں) پیدا ہوا تو اکبر بادشاہ نے اسے بیٹا کر لیا۔ وہ اکبر کو 'شاہ بابا' اور جہانگیر کو 'شاہ بھائی' کہا کرتا تھا۔ اکبر بادشاہ جہانگیر کو 'شیخو جی' کہتا تھا اور مراد کو 'پہاڑی راجہ'۔

ایک دن فیضی حسب الحکم حضور میں کچھ لکھ رہا تھا۔ بیربل بات کرنے لگا۔ اکبر نے آہستہ سے کہا۔ "حرف نزنید شیخ جی می نویسد"۔ تم عہد چغتائیہ کی تصانیف دیکھو گے تو معلوم ہوگا کہ کتابوں میں 'جروکہ درشن' برابر لکھتے تھے اور کبھی کہتے تھے۔ "بپاے درشن حاضر شدہ

باریابِ مجرا گشت۔"

'سرچوکی'۔ ان نوکروں کے افسر کو کہتے ہیں جو اپنی اپنی باری پر حاضر ہو کر کام دیں۔ ظہوری نے سہ نثر میں بادشاہ کی تعریف میں کہا: بار جگت گردئی عالم بردوش گرفتہ اور ساقی نامہ میں کہا:

شود چہرۂ زردِ خورشید آل دہندش اگر نازنیناں اگال

اب چند ایسے الفاظ دکھاتا ہوں جن میں فارسی تلوار نے اپنی تراش کا جوہر دکھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فارسی ہندستان پر قابض ہوئی تو کوئی مانع نہ تھا جو اُسے ہندی لفظوں میں تصرف کرنے سے روکے۔ دین، دربار، علوم فنون اُنہی کے تھے۔ سنسکرت میں پرانے خزانے تھے جن کا حاصل کرنا طالب کمال کو واجب تھا مگر فتحیابوں کی خود پسندی اجازت نہ دیتی تھی کہ پسند کی آنکھ سے دیکھ سکیں اور اُس سے کچھ حاصل کریں۔ یا استعمال میں اس کے لفظوں کی صحت و غلطی بلکہ معنی و بے معنی، یا درستی و نادرستی کی خبر لیں۔ البتہ ابوالفضل وغیرہ دو تین مصنف اہل تحقیق ہوئے۔ انھوں نے تصحیح الفاظ کا حق ایسا ادا کیا کہ حروف و اعراب تک کو عبارت میں تحریر کر کے کھولا۔ ورنہ کسی نے لفظوں کی تحقیق اور ان کے صحیح بولنے کی پروا نہ کی۔ اپنی زبان میں جس لفظ کو جس طرح ٹوٹا پھوٹا ادا کر سکے اُسی طرح بول دیا اور تعریب کے مقابل میں اُس کا نام تفریس رکھا۔

تفریس کی ضرورت مختلف سببوں سے ہوتی تھی۔ تم جانتے ہو کہ ٹ ڈ ڑ مثقلہ زبان فارسی میں نہیں۔ جن ہندی لفظوں میں کوئی حرف ان میں سے ہوتا ہے تو ت د ر ہو جاتا ہے۔ (2) ہائے مخلوط التلفظ ان کی زبان میں نہیں، جس ہندی لفظ میں آجاتی ہے اسے گرا دیتے ہیں۔ (3) کسی فارسی لفظ میں تشدید تم نے نہ دیکھی ہوگی۔ زبان فارسی گویا بالطبع اس سے انکار رکھتی ہے۔ دیکھو عربی نے اس میں بے شمار مشدد الفاظ پھیلائے مگر ان کی زبانوں کو تشدید کی مشق بہت کم ہوئی۔ اسے طبعی اثر کا زور سمجھنا چاہیے کہ جس ہندی لفظ میں تشدید ہوتی ہے۔ تخفیف ہو جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بعض موقع پر اسباب مذکورۂ بالا میں سے کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے جو تفریس کے لیے مجبور کرتا ہے مثلاً:

'کٹارہ' کو 'کتارہ' کہتے ہیں۔ صاحب رشیدی نے سفر نامہ سے نقل کیا اور بعض اشخاص نے اسے تسلیم بھی کیا کہ اصل اس کی 'قتالہ' ہے۔ اہلِ یمن کے محاورہ میں ہے۔ مگر یہ ان

صاحبوں کا خیال ہے۔ کیونکہ کٹار خاص ہند کا حربہ ہے۔ سلف سے اپنا نام ساتھ لیے چلا آتا ہے۔ یہ لفظ کہیں سے لیا ہوا نہیں ہے۔

سرِ آں دو چشم گردم کہ چو ہندوان رہزن ہمہ را بنوکِ مژگاں زدہ بر جگر کتارہ

'جھمدھر' کو اہلِ فارس اپنے تلفظ میں 'جمدر' کہتے ہیں۔ طغرا:

شوخ سوسن را بگو دل مے رُباید قشقہ ات ذاتِ رجپوت است ترسم دست بر جمدر کند

مُتھرا شہر کو متورہ کہتے ہیں۔

چوں زند سبزِ متورہ حرفے از پاژند حسن بہر زیبِ نطق مصحف خوان گل از بر کند

'سکھر' کو 'سکر' اور سکھری کو سکری کہتے ہیں:

اے خدا عالیِ بیچارہ بہ ہند آمدہ است نازنیں شوخ ظریفِ سکری میخواہد

'جھلّو' کو 'جکر' کہتے ہیں۔ اس میں تشدید کو تخفیف اور ڑائے مثقلہ کو رائے مہملہ سے بدل لیا ہے۔ اسی قیاس پر 'جھروکہ درشن' کو 'جروکہ درشن' کہتے اور لکھتے تھے۔ عرفی:

در چاشتگہ از شبنم گل گرد فشانست آں باد کہ در ہند اگر آید جکر آید

'کھچڑی' کو 'کچری' کہتے ہیں۔ سالک یزدی:

سیر گشتم ز کچریِ لیام ہوسِ سیم و زر نمیدارم

'براھمن' ہائے مخلوط اور ایسے 'ن' کے ساتھ ہے جو ہماری زبان سے نہیں نکلتا۔ اہلِ فارس نے 'برہمن' اور 'برہَمن' کر لیا۔ چندر بھان دارا شکوہ کے منشی نے کہ 'برہمن' تخلص کرتا تھا کہا:

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار بکعبہ رفتم و بازش برہَمن آوردم

'چوکھنڈی' بالاخانہ جسے ہوا کے لیے چاروں طرف سے کھلا رکھتے ہیں:

چوکندیِ شکوہش اگر سایہ افگند پیلِ سپہر شانہ بد زدد بزیر آں

(2) بعض موقع پر کوئی سبب تفرّس کے لیے نہیں ہوتا۔ مگر وہ پھر بھی اپنا دخل کر ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ اکثر اہلِ زبان کو گفتگو میں دیکھا جاتا ہے کہ بہاری لعل کو بَہاری لعل کہتے ہیں۔ میں نے خود ایک شخص سے کہا کہ جناب آغا! ایں بِہاریست۔ بالکسر بفرمائید۔ متعجب ہو کر بولے کہ بِہاری؟ پس ایں چہ معنی دارد؟ میں نے کہا۔ نام یکے از پیشوایانِ ہنود است۔ آغا صاحب ہنس کر بولے کہ "خیر۔ او معنی ندارد۔ 'بَہاری' منسوب بہ بہار با معنی لفظیست۔ ایں خیلے خواب

است۔ باید 'بہاری' بخوانیم۔"

اسی طرح جگل کشور اور نول کشور میں 'کشور' کو بہ سکون شین اور فتح واو بولتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آغا! 'کشور' بسکون واو مجہول است۔ کہنے لگے کہ "خیر۔ 'کشور' معنیٔ ندارد۔ 'کشور' بمعنیٔ ولایت لفظ خوبیست باید 'کشور' بگوئیم۔"

یہی اثر تھا جس کے زور نے کلیم کی زبان سے شاہجہاں نامہ میں 'سنگھ' کو 'سنگ' کہوادیا:

سر راجپوتاں جگت سنگ بود   کہ بر شیشہ نہ فلک سنگ بود

یہ تصرف بعض جگہ کسی قاعدے کے پابند نہیں ہوتے اور اکثر لفظوں کے حرفوں یا حرکتوں کو اَدل بَدل کر اپنی زبان کے قالب پر ڈھال لیتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک ملک کے لوگوں کی زبان و دہان کو قدرت نے اس طرح بنایا ہے کہ وہ غیر ملک کے لفظوں کو جوں کا توں ادا نہیں کر سکتے۔

'جیسلمیر' مارواڑ اور سندھ کے درمیان میں ایک علاقہ کا نام ہے۔ اہلِ ایران اسے 'جسرمیر' کہہ گئے ہیں۔ چنانچہ طغرا کا شعر غزل مذکورہ بالا میں ہے:

نوچہ کز جسرمیر آید بہ گلزارِ بہشت   از نزاکت جاے خود بر دیدۂ عبہر کند

'جمنا' کو 'جمنہ' اور 'جمن' باندھتے ہیں۔ ملا طغرا:

چوں تختِ شہ ز گل نزند دم کہ بہر او   آوردہ آب جمنہ ز ملک بہار تخت

'کہار' کو 'کہار' باندھا ہے۔ طغرا:

چوں کردہ رو بر پالکی گردید خاور پالکی   بنشست تا در پالکی ئہ چرخ کہار آمدہ

'گربھ سوت' ہندی ہے۔ سوت اور ریشم کے ملے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں۔ اہلِ ایران اسے 'گرم سوت' کہتے ہیں۔ محسن تاثیر:

سخن بند از قماشِ لفظ بے مضموں نمیگردد   کہ گرمی از لباس گرم سوت افزوں نمیگردد

میرے دوستو! تمھیں تعجب آئے گا جب میں اکثر الفاظ ایسے سناؤں گا کہ فارسی ہیں مگر زبانِ فارسی نے ہند میں آکر پیدا کیے ہیں۔ تم انھیں فارسی سمجھ کر بولتے ہو اور فارس والے اُن سے وہ مطلب نہیں سمجھتے جو تم مراد لیتے ہو۔ مثلاً:

شبنم، تن زیب، جامدانی، کامدانی وغیرہ کپڑوں کے نام ہندوستان میں فارسی لفظوں میں ہیں مگر وہ لوگ نہیں سمجھتے۔

"رہباری"۔ مزدور جو راہِ سفر میں تمھارا بوجھ اٹھا کر لے چلے۔

"فارغ خطی"۔ بروقت فیصلہ باہمی۔ مدعی اپنے مدعاعلیہ کو لکھ کر دیتا ہے۔

"دست پناہ" جو 'دسپنا' مشہور ہے۔ ایران میں اسے 'آتشگیر' کہتے ہیں۔

"خوشدامن"۔ یہاں ساس کو کہتے ہیں۔ وہاں 'مادرزن'۔ یا 'خشو' کہتے ہیں۔

"خویش"۔ یہاں 'داماد' کو کہتے ہیں۔

"تاہم"۔ اہل ہند کا ایجاد ہے۔ 'با اینہمہ' یا 'بازہم'۔ 'باوجوداین' جو مناسب مقام ہو اہل ایران کا محاورہ ہے۔

فوج کے عہدہ داروں کے نام 'رسالہ دار'۔ 'جمع دار'۔ 'برقنداز'۔ 'تھانہ دار'۔ سب یہیں کے لفظ ہیں۔ بلکہ 'رسالہ' بھی یہیں کا ایجاد ہے۔

"متصدی" اور۔ "منشی"۔ نویسندوں کے نام یہاں قرار پائے ہیں۔ وہاں 'میرزا' کہتے ہیں۔ ان کے دفتر کی اصطلاحیں بھی یہیں تصنیف ہوئی ہیں مثلاً :

"روشنائی"۔ یہاں سیاہی کو کہتے ہیں۔ وہاں 'مرکب' کہتے ہیں۔

"رسید"۔ یعنی سندِ قبض الوصول۔

"رَسَد"۔ کاروانِ غلہ و سامانِ لشکر۔ ایران میں اسے 'سُورسات' کہتے ہیں۔

"دفتر"۔ آج کل وہاں فردِ کاغذ کو کہتے ہیں۔

"چلم"۔ یہاں مشہور ہے۔ اسے وہاں 'سر قلیان' کہتے ہیں اور کابل، قندھار، ہرات میں حقہ کو 'چلیم' کہتے ہیں۔

"دستانہ"۔ اسلحہ جنگ میں ایک لوہے کی چیز تھی کہ ہندستانی بہادر لڑائی میں ہاتھوں پر پہنتے تھے۔ کہنیوں تک کے زخم سے حفاظت کرتے تھے۔ ایران میں اسے 'قلچاق' کہتے ہیں۔

اس طرح کے بہت سے لفظ ہیں کہ سلاطین ہند کے درباروں اور دفتروں میں نکلے اور تمام ہندستان میں رواج پا کر یہاں کی تصنیفات میں داخل ہو گئے۔ انھیں ہندستانی فارسی کہنا چاہیے۔ اہل ایران کو خبر بھی نہیں ہے۔ انشاپرداز کو چاہیے کہ جس طرح ان لفظوں سے باخبر رہے اسی طرح ان لفظوں سے بھی آگاہ رہے جو کہ ایران میں ان کی جگہ بولتے ہیں تاکہ جب اہل زبان کے جلسہ میں بیٹھے تو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ وہی بولے جو وہ آپس میں بولتے ہیں۔ کیونکہ فارسی وہی ہے جو فارس میں بولیں نہ کہ ہند میں۔

جب سلسلۂ کلام یہاں تک پہنچا تو واجب ہے کہ ان غلطیوں کو کھول کر بیان کروں جن میں خود آلودہ رہا اور اکثر بے استعداد ہم وطن میرے مبتلا ہیں۔ اس مطلب کو جس قدر پھیلایا جائے اُسی قدر مناسب ہے تاکہ کانوں سے زبانوں پر اثر پہنچے۔ زبان کے معاملہ میں فقط سمجھ لینا کافی نہیں۔ مشق اور کثرتِ استعمال ایک ضروری شرط ہے۔ اکثر غلطیاں جو ہم لوگوں سے گفتگو اور تحریر فارسی میں ہوتی ہیں۔ ان کا سبب یہ ہے کہ ہم کو ان کے ہر قسم کے الفاظ پر اور مناسبِ مقام محاوروں پر عبور نہیں۔ یہ بات دو طرح سے حاصل ہو سکتی ہے اوّل تو یہ کہ ہمیشہ اہلِ زبان کے ساتھ نشست و برخاست رہے اور ہر وقت ان سے ہمکلام رہیں۔ یہ نہ ہو سکے تو ان کے کلام کو ہر وقت پڑھتے رہیں اور زبان پر جاری کرتے رہیں۔ ہم ان دونوں دولتوں سے محروم ہیں۔ اس لیے جابجا ٹھوکریں کھاتے ہیں اور دیکھنے والوں کو اپنے اوپر آپ ہنساتے ہیں۔

حالت یہ ہے کہ جب کوئی مطلب فارسی میں ادا کرنا ہوتا ہے تو پہلے اُس کی اُردو سوچتے ہیں، پھر فارسی میں اس کا ترجمہ کردیتے ہیں۔ ہر مقام کے مناسب حال فارسی کے محاورے زبان پر نہیں، لفظی ترجمہ کردیتے ہیں۔ وہی تمسخر اور ریشخند کا سامان ہوتا ہے۔ ایک ولایتی جب اُردو بولنے لگتا ہے تو اُس کی بے محاورہ باتوں پر تم کیوں ہنستے ہو؟ اسی لیے ہنستے ہو کہ اس کا بے محاورہ پن کانوں میں گُدگُدیاں کرتا ہے۔ وہ تمھارے محاوروں پر اچھی طرح حاوی نہیں اس لیے اِدھر اُدھر سے توڑ جوڑ کر جگہ بے جگہ الفاظ بولتا ہے۔ تمھیں اس پر ہنسی آتی ہے۔ بس اسی طرح ہم لوگوں کی فارسی کا حال ہے کہ ذرا ذرا سے لفظ جو بات بات کے بولنے چالنے میں کام آتے ہیں اُن کے فرق ہمیں معلوم نہیں۔ یا معلوم ہیں زبان پر رواں نہیں۔ ہم کبھی تو اپنے محاورہ کا ترجمہ کر جاتے ہیں۔ کبھی بے خبری کے سبب سے جو منہ میں آتا ہے وہ کہہ جاتے ہیں۔ اہلِ زبان سن کر ہنس دیتے ہیں۔ مثلاً اگر کہنا چاہیں۔ میں نے سیب کے مربّے سے روٹی کھائی تو

ہم کہتے ہیں	نان از مربائے سیب خوردم
اہلِ زبان کہے گا	نان بمربائے سیب خوردم
ہم کہتے ہیں	ایں عبارت را از روشنائی بنویسد وایں را از شنگرف
اہلِ زبان کہے گا	ایں عبارت را بمرکب بنویسید وایں را بشنگرف
ہم کہتے ہیں	ایں صفحہ را از قلم نیزہ نوشتہ وایں را از قلم آہن

اہلِ زبان کہے گا ایں صفحہ را بقلم نیزہ نوشتہ وایں را بقلم فولاد

ضمیریں منفصل ہماری زبانوں پر ایسی چڑھی ہیں کہ متصل کے لطفِ اختصار سے بالکل محروم ہو گئے۔ مثلاً بلّی کچھ پکڑ لائی ہے۔ پوچھتے ہو کہ اس کے منہ میں کیا ہے۔ ہندی کہے گا کہ در دہنِ ایں چہ چیز است۔ اہل زبان کہے گا بدہنش چیست۔ بدہن چہ دارد۔

اسے اندر نہ آنے دینا۔ ہندی کہے گا۔ ایں را دروں آمدن ندہید۔ اہل زبان کہے گا۔ مگزار کہ سر فرش بیاید۔

اگر کہنا منظور ہو کہ اسے باہر نکال دو تو ہم کہتے ہیں ایں را بیروں کن۔ اہل زبان کہتے ہیں۔ بدرش کن۔

ہم ایک بچّہ سے پوچھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ بدست شما چہ چیز است۔ ایرانی کہتا ہے۔ بدستت چہ داری۔ در دست چہ داری۔ بدستت چیست۔ (حکیم ایرانی بیمار سے کہتا ہے) دستت بمن بدہ۔ نبضت بمن بنما۔

ہم کہتے ہیں تیرا قلم کیا ہوا۔ قلم تو چہ شد۔ قلم تو کجا رفت۔ اہل زبان کہتا ہے۔ قلمت راچہ کردی؟ قلمت چہ شد؟ میں نے آپ دیکھا ہے یہیں تھا۔ ہم کہتے ہیں۔ من خود دیدم ہمیں جا بود۔ اہل زبان کہتا ہے۔ بندہ خودم دیدم ہمیں جا بود۔

ہندوستانی پوچھتا ہے۔ ایں کارد کیست؟ ایرانی پوچھتا ہے۔ ایں کارد از کیست؟ ہم کہیں گے۔ ایں کاردِ من است۔ ایرانی کہے گا۔ از من۔ از ماست۔ از خودِ بندہ۔

اگر جواب میں کہنا ہو کہ یہ تمھارا ہی چاقو ہے؟ تو ہم کہیں گے۔ ایں کارد از شماست؟ (دیکھو ہی کا اشارہ رہ گیا)۔ اہل زبان کہے گا۔ از خودِ تانست۔ از خودِ شماست؟

ایک خط کا لفافہ چاہیے ہو تو ہم پوچھیں گے۔ نزدِ جناب لفافہ ہست۔ پیش شما لفافہ ہست؟ اہل زبان کہے گا۔ لفافہ ہست؟ لفافہ[1] دارید؟

جواب میں ہم کہیں گے۔ نزد من نیست۔ نزد بندہ نیست۔ پیش بندہ نیست۔ ایرانی کہے گا۔ ندارم۔ ندارم آغا۔ پیش من نیست آغا۔

یہ تصویریں تمھارے پاس کہاں سے آئیں؟ ہم ترجمہ کردیں گے۔ ایں تصویرہا پیش

---

1 اب ایران میں لفافہ کو پیکٹ کہتے ہیں۔

از شما کجا آمد ند۔ ایرانی کہے گا۔ ایں تصویرہا راز کجایافتید۔

تمھیں ان میں سے کون سی چاہیے؟ ہندی کہتا ہے۔ شما را ازیں تصویرہا کدام تصویر درکاراست۔ اہل زبان کہے گا۔ شما کدامش میخواہید؟

مثلاً دُکاندار سے تم نے ایک چاقو مانگا اور پسند نہ آیا۔ تم کہتے ہو۔ یہ میرے کام کا نہیں۔ ہم خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ پھر بھی مطلب نہیں ادا ہوتا۔ صاحب زبان کہہ دیتا ہے۔ بکارم نمیخورد۔

دکاندار کہتا ہے۔ یہ اُور ہے۔ وہ کہتا ہے۔ نمیخواہم۔ بکار ندارم آغا۔

ایک شخص کے سامنے دوا کا پیالہ دھرا ہے۔ کہتا ہے۔ کیا کروں، نہیں پیا جاتا۔ ہم کہتے ہیں۔ چہ کنم کہ نوشیدہ نمیشود۔ آشامیدہ نمیشود۔ اہل زبان دو لفظوں میں فیصلہ کر دیتا ہے۔ چہ کنم کہ نمیتوانم۔

ایک لڑکا فارسی زبان کا شوقین کوٹھے پر جانے لگا۔ کسی نے پوچھا۔ کجا میروید آغا؟ اس نے کہا۔ برائے گذاشتن کتاب بالا میروم (لفظی ترجمہ اردو کا ہے۔ اوپر کتاب رکھنے جاتا ہوں)۔ محاورہ سے واقف ہوتا تو کہتا۔ میروم کتاب بالا بگذارم۔

ایک غریب نواب صاحب کے ہاں گیا۔ دربان نے جانے نہ دیا۔ فارسی میں کہتا ہے۔ خانہ نواب صاحب رفتہ بودم دربان رفتن نہ داد۔ اہل زبان کہتا ہے۔ خانہ نواب رفتہ بودم دربان نگزاشت کہ دروں روم۔

جانے دو۔ ہندی کہتا ہے۔ رفتن بدہ! اہل زبان کہتا ہے۔ بگزار کہ برود! نہ جانے دینا! نگزار کہ برود۔

'کوئی'۔ اُردو میں انسان اور غیر انسان دونوں کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ میں گیا تھا وہاں کوئی نہ تھا اور بیمار کہتا ہے۔ کوئی چیز بھلی نہیں لگتی۔ فارسی میں انسان کے لیے 'کس' یا 'کسے' کہتے ہیں۔ چیز کے لیے 'ہیچ' یا 'ی' کافی ہوتا ہے۔ جنھیں یہ نکتہ زبان پر چڑھا ہوا نہیں۔ وہ دونوں موقع پر 'کس' یا 'کسے' بول جاتے ہیں۔ چنانچہ کہیں گے۔ بندہ رفتہ بودم آنجا کس نبود یا ہیچ کس نبود یا کسے نبود اور دوسرے فقرے کا بھی وہی ترجمہ کر دیں گے کہ کسے چیز خوشم نمی آید۔ اگر بجائے اس کے کہتے۔ ہیچ چیز خوشم نمی آید۔ چیزے خوشم نمی آید۔ چیزے بمذاقم خوش نمی آید تو محاورہ درست ہوتا۔

ناواقف زبان کہتا ہے۔ اگر کسے حویلی در خیال شما باشد نشان دہید کہ من بکرایہ بگیرم۔ یہ ترجمہ بھی اس فقرے کا ہے کہ کوئی حویلی تمھارے خیال میں ہو تو بتاؤ کہ میں کرایہ کو لوں گا۔ اگر کسے خط از وطن بیاید ضرور مرا خبر کنید۔ کوئی خط وطن سے آئے تو ضرور مجھے خبر کرنا۔ اور ،

اہل زبان کہے گا۔ اگر مکانے در نظر شما باشد بہ بندہ نشاں دہید کہ کرایہ بگیرم۔ اگر خطے از وطن برسد بہ بندہ خبر دہید۔

اردو میں اکثر 'کوئی' بھی اور شخص بھی دونوں کو جمع کر کے کہتے ہیں۔ کوئی شخص وطن سے آئے تو مجھے ضرور خبر کرنا۔ یہ فارسی میں بھی کہہ دیتے ہیں۔ اگر کسے شخص از وطن آید ضرور مرا خبر کنید۔ یہاں اتنا ہی کافی ہے کہ اگر شخصے از وطن برسد یا کسے از وطن بیاید۔

یہ بات بھی جتانے کے قابل ہے کہ ہمارے ہم وطنوں نے ایشاں یا شاں کو نزدیک کے لیے رکھا ہے۔ یعنی 'اِن' کا ترجمہ سمجھا ہوا ہے اور اوشاں کو 'اُن' کا ترجمہ قرار دیا ہے۔ ور یہ بے فائدہ محض ہے۔

حاضر و غائب کی ضمیروں میں بھی ہم لوگ اسی طرح سے شتر گربہ کرتے ہیں اور غائب کی ضمیر اور غائب فعل سے خطاب کرنا ادب میں داخل سمجھتے ہیں مثلاً جناب آغا! شما کجا رفتہ بودند۔ جناب کجا تشریف بردہ بودند۔ بندہ صبح حاضر شدہ بود۔ بھی فعل حاضر لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ آں کر مفرما کجا رفتہ بودید؟ کجا خواہید رفت؟ آں غائب پر اشارہ کرتا ہے اور بودید اور خواہید رفت صیغہ ہاے حاضر ہیں۔ اہل زبان ہوگا تو صاف کہہ دے گا۔ کجا رفتہ بودید؟ بندہ صبح آمدہ بودم۔ اور۔ کجا خواہید رفت کی جگہ کہے گا۔ کجا میروید؟ وغیرہ۔ استقبال کی جگہ صیغۂ حال سے کام لیتے ہیں۔

ہمارے اہل وطن میں تعظیم کے موقع پر آنجناب کا بہت خرچ ہے اور فعل بھی غائب۔ مثلاً بندہ بخدمت آنجناب عرض کردہ بود۔ اور۔ آنجناب کجا تشریف می برند۔

اینجانب اپنے لیے بولتے اور لکھتے ہیں مثلاً۔ اینجانب رفتہ بود۔ اہل زبان اینجانب بولتے ہیں مگر ایں طرف کے معنوں میں لکھتے ہیں۔ مثلاً از اینجانب قصورے نخواہد رفت۔ یا فلاں کس از متوسّلان اینجانب بودہ۔

اکثر خطوں میں دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے کے لیے 'نور چشم' اور اس کی بہن ہو تو

'نور چشمی' لکھتے ہیں اور اعتراض کرو تو صاحب زادہ اور صاحب زادی سند پیش کرتے ہیں۔ ایسے لوگ لفظ 'قبلہ گاہی' کو ضرور ماں سمجھتے ہوں گے۔ یہ غلطیاں اُنھی دو کوتاہیوں سے پیدا ہوئی ہیں کہ اہل زبان کی صحبت نہیں اور کتاب پر نظر نہیں۔

اہلِ ہند نے کتاب میں پڑھا ہوا ہے کہ 'نہادن' رکھنا۔ چنانچہ جب کہنا چاہتے ہیں کہ گلاب کا شیشہ طاق میں رکھ دو۔ یا میری کتاب طاق پر رکھ دو تو فارسی میں کہتے ہیں کہ شیشۂ گلاب در طاق بنہید اور عمامہ بسر بنہید۔ کوئی زیادہ فصاحت خرچ کرتا ہے تو کہتا ہے کتابِ من بر طاق بگزارید۔ یا کتاب بندہ بطاق بگزارید۔

واقفِ زبان کہے گا۔ شیشۂ گلاب سر طاق بگزارید اور کتابم سر طاق بگزارید اور عمامہ بر سر بگزارید۔ کتاب روے میز بگزارید۔ یا سر میز بگزارید۔ مشکل یہ ہے کہ اسے سن کر جب کہنا چاہتے ہیں کہ میرا چوغا رکھو کل لے لوں گا تو کہتے ہیں۔ چوغاے من بنہید۔ یا بگزارید فردا خواہم گرفت۔ اہل زبان کا صحبت یافتہ چغا دیتا ہے اور کہتا ہے۔ ایں را پیش خود نگہدارید۔ فردا میگیرم۔

خواہم گرفت اور مے گیرم کے اختلاف کا سبب بھی جتانے کے قابل ہے۔ ہم لوگوں نے قواعد کی کتابوں میں پڑھا ہوا ہے کہ استقبال کا صیغہ یہ ہے اور حال کا یہ ہے۔ اس کے بموجب ہر وقت کے لیے اسی کا صیغہ بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ اہل زبان کے کلام میں استقبال کی جگہ ہمیشہ حال کا صیغہ آتا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی وہی بولنا چاہیے۔

لطف یہ ہے کہ بہت آدمیوں کو گفتگو میں دیکھا کہ فردا اور دیروز میں فرق نہیں سمجھتے۔ اُردو میں گزشتہ اور آئندہ دونوں کو 'کل' ہی کہتے ہیں۔ ایسے لوگ بے تکلف کہتے ہیں کہ دیروز ضرور بہ بندہ منزل تشریف آرید۔ و دیروز حاضر خدمت خواہم شد اور فردا آمدہ بودم شما خانہ بنودید۔

کسی بہادر کی تعریف کے موقع پر ہندی کہتے ہیں۔ وہ بڑا بہادر ہے جب شیر مارا ہے تلوار ہی سے مارا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں۔ او بسیار بہادر است۔ وقتیکہ شیر را زدہ است بہ شمشیر زدہ است اور بسیار شیر ہا را زدہ است۔ اور۔ من ہم امروز موشے زدہ ام اور فلاں کس در جنگ زدہ شد۔

اہل زبان ہرگز اس طرح نہ کہے گا۔ وہ کہے گا: خیلے دلاور است۔ شیر را گاہے نہ کشتہ

مگر بہ شمشیر اور بسیار شیر ہارا کشتہ است۔ اور۔ شیر راہچو موش میکشد۔ اہل زبان جب کہتے ہیں کہ احمد راسگ زدہ است۔ محمود رامار زداست۔ اُس سے کتے اور سانپ کا کاٹنامراد ہوتا ہے۔

یہی لوگ ہیں جو گزیدن اور بُریدن کا فرق بھی نہیں رکھتے۔ کیونکہ اُردو میں کتّے کے کاٹنے کو بھی کاٹنا کہتے ہیں۔ اور چُھری تلوار کے کاٹنے کو بھی کاٹنا کہتے ہیں۔ بچّہ پر خفا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں۔ صبح نزد استاد تو خواہم رفت و خواہم گفت گوش تو میگزد۔ اہل زبان کہتا ہے۔ صبح پیش استادت میروم ومیگویم۔ گوشہایت می برد۔ اسی طرح جو لوگ محاورہ سے بے خبر ہیں کتّے اور بھڑ کے لیے کہتے ہیں۔ مُلّا فرقان بہ بازار میرفت سگ بپایش گزید۔ اور۔ زنبور بدستش گزید (برید بھی کہہ دیتے ہیں)۔

اکثر اشخاص ہیں کہ شکستن اور گسستن میں بھی فرق نہیں کرتے۔ نہیں جانتے کہ گسستن رسّی اور ڈورے کے لیے خاص ہے۔ اس لیے پاؤں ٹوٹے، ہڈی ٹوٹے، پیالہ، سر، ڈورا، جو ٹوٹے ایک ہی لفظ کہہ دیتے ہیں کہ احمد از درخت افتاد پایش گسست اور استخوانش بگسست اور پیالہ از دست افتادو بگسست اور سرش بگسست اور رشتہ نازک بود بگسست۔

گزاشتن کے معنی آمدنامہ میں چھوڑنا پڑھے ہیں۔ جانتے ہیں کہ چھوڑنا ایک ہی ہوتا ہے۔ خواہ گھر چھوڑنا۔ خواہ بندوق چھوڑنی۔ خواہ کتّے کو شکار پر چھوڑنا۔ اسی واسطے کہتے ہیں کہ احمد مدرسہ راگزاشت و خانہ راگزاشت اور تفنگ گزاشت اور سگ را بر صید گزاشت۔ اہل زبان سن کر ہنستے ہیں۔ کیونکہ ان کے محاورہ میں مدرسہ راگزاشت اور خانہ راگزاشت صحیح ہے۔ باقی سب واہیات ہیں۔ وہ کہیں گے۔ تفنگ سر کرد۔ اور۔ سگ راسر نخچیر سر داد۔ باز راسر کبوتر سر داد۔

بندوق خود بخود چُھٹ جائے یا کتّا یا بکری چُھٹ جائے تو اس کے لیے فرق ہے۔ تفنگ سر شد اور سگ رہاشد۔ گوسپند یلہ میگرددیار ہاشد۔ یہاں کے لوگ بندوق کے لیے بھی کہہ دیتے ہیں کہ تفنگ یلہ شد اور کسی نے چھوڑ دی ہو تو کہیں گے یلہ کرد۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ایرانی کہے گا۔ اتفاقاً تفنگ دررفت (چھوٹ گئی)۔

اُس کا تیر نشانہ پر نہ لگا۔ کسی کی دعا لگ گئی۔ میرے کئی برس اس کام میں لگے اور اُس کے پاؤں میں چوٹ لگ گئی۔ جو لوگ محاورہ سے ناواقف ہیں۔ کہہ دیتے ہیں۔ تیر بر نشانہ چسپید۔ دعاے کسے چسپیدہ است۔ چندیں سال بریں کار چسپید۔ ضرب بپایش چسپید۔

زباں دان کہے گا کہ تیرش برہدف رسید۔ یا تیرش برہدف نشست۔ اور۔ دعاے کسے اثر کرد۔ دعاے کسے اثر کردہ باشد۔ دعاے فلانی زدہ است اورا۔ چندیں سالم دریں کار گزشت۔ یا سالہادریں کار صرف کردم۔ سالہاصرف کارش کردم۔ ضرب سخت بپالش رسیدہ۔

بعض اشخاص جھوٹے نگینہ یا عقیق کو کہتے ہیں۔ ایں نگین دروغی است۔ واقف زبان کہے گا۔ اصلی نیست۔ یا مصنوعی ست۔ یا جعلی ست۔

حقہ عربی لفظ ہے۔ فارسی میں اسے قلیان کہتے ہیں (اس کی اصل بھی غلیان عربی ہے)۔ ناواقفوں نے پینے کے لیے نوشیدن سنا ہوا ہے اس لیے کہتے ہیں بسم اللہ حقہ بنوشید۔ اہل زبان کہتا ہے۔ قلیان بکشید۔ یا میل بفرمائید اور یہ خبر نہیں کہ اہل زبان پانی کے لیے بھی یہی کہتے ہیں کہ آب بخورید خیلے خنک است۔ اور۔ چاے نمیخورم کہ خشکی می آرد۔ اور۔ شیر نمیخورم کہ جاہیدہ ہستم۔ ماست نمیخورم کہ بمزاجم نمیسازد۔

ایک جلسہ میں یہ مثل ترجمہ کرنے کے لیے پیش ہوئی۔ (شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں)۔ یاروں نے انواع واقسام سے آپس میں طبع آزمائیاں کیں۔ شیر و گوسفند در کنارے آب می نوشند۔ شیر و گوسفند بریک چشمہ از آب سیر می شوند۔ شیر و بز بر ساحلے آب مے نوشند۔ اور۔ بیک جا آب مے آشامند۔ و بیک مشرب آب مے آشامند۔ و نوش مے کنند۔ اصل وہی ہے کہ۔ شیر و بز یکجا آب میخورد۔

جب کسی کو دھمکاتے ہیں تو اُردو میں کہتے ہیں کہ آج میں نے اسے خوب جھاڑا۔ مترجم کہتے ہیں۔ امروز اوراخوب فشاندم۔ اہل زبان کہے گا۔ ترساندم۔ تنبیہش کردم۔ برق چشمش گرفتم۔

بھائی کو برادر صاحب اور سب میں بڑے بھائی کو اخوان صاحب کہتے اور لکھتے ہیں۔ یہ بھی فضول ہے۔ برف اور یخ کو ایک سمجھتے ہیں۔ موٹے قلم سے لکھا ہو تو کہتے ہیں بقلم فربہ نوشتہ است۔ اور۔ ایں نیشکر ہم بسیار فربہ است۔

ماضی تمنائی کی 'ی' جس کے لطفِ ادا کا خاتمہ بلبلِ شیراز کی زبان پر ہو گیا۔ لوگوں کو بہت خراب کرتی ہے۔

ایک دفعہ یہ فقرہ امتحان میں پیش ہوا۔ اگر میرے پاس روٹی ہوتی تو بھی میں نہ کھاتا۔ اس پر جس جس طرح لوگوں کے ذہن دوڑے اُن کا تماشا دیکھنے کے قابل ہے : اگر نزد من نان

بودے۔ تاہم نوش نکردے۔ اگر پیشم نان بودے تاہم از من خوردہ نشدے۔ اگر نزدِ من نان شدے ہم نخوردمے۔ بات فقط اتنی ہے کہ اگر نان پیش من میبود۔ ہم نمیخوردم۔

یہ عام اہل ہند کی ٹھوکریں ہیں جو لکھی گئیں۔ تخمیناً 15 16 برس پنجاب میں ہوئے بعض لغزشیں ایسی معلوم ہوئیں کہ پنجاب کے لوگوں کے لیے خاص ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر کی ڈاڑھ میں درد ہوا۔ لاہور میں ایک شاہ جی صاحب عامل تھے۔ اُن کے جھاڑنے سے درد جاتا رہتا تھا۔ انھیں بلایا اور رخصت کے وقت حکم دیا کہ انھیں 25 روپیہ دے دو۔ دیوان حاضر باش موجود تھا۔ حسب ضابطہ خزانچی کے نام حکمنامہ لکھا۔ فلاں شاہ جی برروے سرکار جھاڑا کردہ است بست و پنج روپیہ بایشاں بدہند۔ تاکید دانند۔

اس ملک میں خوش کی جگہ راضی بولتے ہیں۔ اسی بناپر ایک شخص نے لکھا۔ چوں ایں سخن بشنید بسیار راضی شد۔

تم جانتے ہو کہ ہندستان میں 'ٹانگ' وہی ہے جسے فارسی میں 'پا' کہتے ہیں اور 'لات' خاص مارنے کے لیے ہے۔ مثلاً گھوڑے نے لات ماری۔ گدھے نے لات ماری۔ اسی کی فارسی 'لکد' ہے۔ کہتے ہیں کہ اسپ لکد زد اور خر لکد زد۔ پنجابی میں عموماً ٹانگ کو لت کہتے ہیں کہ اُس دی لت وِچ پیڑ ہوندی ہے اور یہی 'لت' مارنے میں بھی لگادیتے ہیں کہ گھوڑے نے لت ماری۔ چنانچہ ایک لڑائی میں کسی شخص کے گھوڑے کی ٹانگ گولہ سے اڑگئی تھی۔ اسی بنیاد پر ایک منشی نے معرکہ جنگ سے روئداد لکھ کر مہاراج کی خدمت میں بھیجی۔ اس کا فقرہ تھا کہ لکدِ اسپش از گلۂ توپ پرید۔ اس نے جانا کہ جس طرح پنجابی میں دونوں کے لیے ایک لفظ ہے یعنی 'لت' اسی طرح فارسی میں بھی ہوگا۔ اگر اہل فارس کے کلام پر عبور ہوتا تو لکھ دیتا کہ پاے اسپش بگلۂ توپ پرید۔

اِن باتوں کی تفصیل لکھ کر اگر میں چاہوں کہ کُل اس قسم کی غلطیوں کی فہرست مکمل کردوں اور اُسے پڑھ کر کوئی محاورہ کے رستہ میں ٹھوکر نہ کھائے تو خیال محال ہے۔ کیونکہ جس شخص کو دیکھتا ہوں ایسی نئی غلطی ایجاد کرتا ہے کہ اُس سے پہلے کسی کو نہیں سوجھی۔ اس لیے مناسب ہے کہ اس تقریر کو یہیں ختم کردوں اور آئندہ کے لیے نظم فارسی کی تاریخ کا سامان کروں۔ اگرچہ سالانہ چھٹیاں ہیں مگر میں نے نیت کرلی ہے کہ جب تک وہ لکچر لکھ نہ چکوں گا۔ آرام کا لطف نہ اٹھاؤں گا۔

گیارھواں لکچر

نظمِ فارسی کی تاریخ

عزیزانِ وطن! جلسہ کی جمعیت میں بہ نسبت سابق کے ریادتی معلوم ہوتی ہے۔ جس میں بہت سی معنی فہم صورتیں نظر آتی ہیں۔ اسے مبارک شگون اور نیک فال سمجھتا ہوں۔ غالباً اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ قوم تحقیقات کی طلب گار ہو اور مطالب علمی کے شکار تک ان کا نشانہ پہنچنے لگے۔ چونکہ آج شعرا بھی کچھ کچھ طبیعتوں کے جوہر دکھائیں گے۔ اس لیے واجب ہے کہ بیان مطلب شروع کروں تاکہ اُدر پڑھنے والوں کے لیے وقت میں گنجائش ہو۔

فارسی کے مورخ اور تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اسلام سے پہلے ملک فارس میں شاعری نہ تھی۔ بہرام گور ایک دن شکار کو نکلا۔ ایک بن میں گھس کر شیر کو جیتا پکڑ لایا اور اس طرح زیر کیا کہ دونوں کان کھینچ کر گرہ لگادی۔ جوش تفاخر میں اس کی زبان سے نکلا ع

منم آں پیل دماں و منم آں شیر یلہ

اس کی ایک معشوقہ تھی کہ حسن و ادا کے ساتھ حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی میں بولتی گھڑی کی طرح جواب دیتی تھی۔ بہرام مارے محبت کے اُسے ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا اور باتیں سن کر خوش ہوتا تھا۔ جس وقت یہ مصرع کہا تو بامّید جواب اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا ع

نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ

بادشاہ کو یہ انداز پسند آیا۔ اہل طبع کو جمع کر کے تقطیع کروائی اور شوق ظاہر کیا۔ اُس کے شوق سے ترقی نے قدم آگے بڑھائے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس نے عرب میں پرورش پائی تھی۔ اصل میں وہاں کی موزونیت تھی جس نے اس کی زبان پر یہ رنگ دکھایا۔

یہ بھی لکھا ہے کہ بہرام کے بعد عہد اسلام میں سب سے پہلے ابو حفص حکیم سغدی نے فارسی میں شعر کہا اور وہ پہلی صدی ہجری میں تھا :

آہوے کوہی در دشت چگونہ رودا　　　او ندارد یار چگونہ رودا

بعض کا قول ہے کہ یعقوب ابن لیث صفار جو ایران میں پہلے خود سر بادشاہ ہوا۔ اُس کا ایک چھوٹا سا بیٹا تھا۔ وہ اُسے بہت چاہتا تھا۔ ایک دفعہ عید کا دن تھا بچّہ لڑکوں میں جوز بازی کر رہا تھا۔ بادشاہ ادھر کو آیا۔ بچّہ کو دیکھ کر محبت کے مارے ٹھہر گیا اور دیکھنے لگا۔ بچّہ نے (جوز) اخروٹ پھینکے۔ اُن میں سات تو گچی (چھوٹا سا گڑھا) میں پڑے ایک باہر رہ گیا۔ یہ سمجھا کہ یہ دانہ رہ گیا۔ زمین ڈھلوان تھی۔ ذرا ٹھہر کر وہ بھی لُڑھکا اور آہستہ آہستہ گچی کی طرف چلا۔ بچّہ دیکھ کر خوش ہوا اور اچھل اچھل کر کہنے لگا ع

غلطاں غلطاں ہمیدود تالبِ گو

(گو۔ گچی۔ یا چھوٹا سا گڑھا)۔ بادشاہ کو یہ موزوں کلام پسند آیا اور اس لیے کہ فارس میں یہ فخر میرے بچّے کے لیے قائم رہے علما کو حکم دیا کہ اس کا قاعدہ باندھو۔ چنانچہ ابو ولف عجلی اور شبت اللعب نے تقطیع کر کے معلوم کیا کہ بحر ہزج کی ایک شاخ ہے۔ بعد اس کے بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچی۔

ابتدائی تحصیل میں جب تک میں نے فقط عروض کی کتابیں پڑھی تھیں اور اَور کتابوں میں حالات مذکورہ بالا نہ دیکھے تھے تو مدت تک یہی خیال رہا کہ زبان فارسی نے نظم اور اس کی بحریں اور زحاف وغیرہ عرب کی برکت سے پائی۔ لیکن جب ملک فارس کی تواریخ قدیمہ کو دیکھا تو خیال پیدا ہوا کہ فارس جیسا ملک، جس میں چار سلسلے سلاطین باآئین کے گزر گئے اور ایسی شان و شکوہ کے ساتھ سلطنت کر گئے جس کی باتیں آج افسانے ہیں۔ علوم و فنون اُس کے یونان اور روما کا پہلو مارتے ہیں۔ گلزار زمین! خداداد حسن! تفریح کے سامان! اور عیش و طرب میں پرستان! کیا یہ زندہ طبیعتیں نظم کے پھولوں کے لیے مردار زمین تھیں؟ وہ لوگ غزلخوانی نہ کرتے ہوں گے۔ اپنے بادشاہوں کے قصیدے نہ سناتے ہوں گے۔ اُن کی عورتیں گیت نہ گاتی

ہوں گی۔ اپنے بچّوں کو لوریاں دے کر نہ سلاتی ہوں گی۔

سنسکرت کی نظم نے یہ بڑا کام کیا کہ مذہب، تاریخ، علوم، فنون، جس مطلب پر کتاب لکھی گئی سب کو اپنے سلسلے میں کھینچ لیا۔ یہ قوتِ بیان اور قدرتِ بیان کی برکت ہے۔ اس کی نظم میں ایک اور وصف اُدر بھی ہے یعنی اس کے حروف الفاظ کی ترکیب اس ڈھب کی واقع ہوئی ہے کہ لفظ لفظ اپنی موزونیت کا کھٹکا کان میں پہنچاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس کے مرصّع کار کے پاس بہت سے چھوٹے اور بڑے بڑے موتی اور جواہر موجود ہیں۔ جو نگینہ جہاں سجتا دیکھتا ہے وہی جڑ دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زبانِ مذکور میں لفظوں کی بہتات ہے۔ اکثر لفظ ہیں کہ فقط 'سبب' ہائے خفیف ہیں۔ یا انھیں سے مرکب ہیں۔ اکثر 'سبب' ہائے ثقیل ہیں۔ اکثر 'وتد' اور اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ یا ان سے مرکب ہیں۔ پس زبانِ مذکور اپنی ہر بحر کے لیے جیسے الفاظ خوش آئندہ موزوں دیکھتی ہے لگا دیتی ہے۔ کیونکہ اس کا سامان وافر اُس کے پاس موجود ہے۔ اس کی نظم میں ان بحروں کو زیادہ لیا ہے جن میں ہر مطلب کے ادا کرنے کی وسعت ہے۔

میں نے اکثر پارسیوں کو عبادت معمولی کے وقت پڑھتے ہوئے سنا۔ اگرچہ وہ بالکل بے علم اور ہر بات سے بے خبر ہیں۔ نظم، نثر کچھ نہیں جانتے اور جو کچھ پڑھتے ہیں بے سمجھے پڑھتے ہیں۔ باوجود اس کے ان کی آواز سے نظم کے تسلسل کا مزا آتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ عہد قدیم میں ان کی تصانیف بھی سنسکرت کی طرح اگر کُل نہ ہوں تو اکثر منظوم ہوں۔ پھر یورپ کے داناؤں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہی صورت ہے۔ یہی موزونیت ہے، جس نے سُروں میں آکر راگ کو طرب ریز اور دل انگیز کر دیا۔ ان کے مدتوشدہ اجزا پر پردہ ڈالے ہیں۔ ورنہ خاص خاص کتبوں میں موزونیت کے رنگ کھل جاتے ہیں۔ رقص کی تال اور ترانوں کے سم دلوں پر موزون کھٹکے دیتے ہیں اور یہی اثر ہیں کہ ہر راگ میں تان پر آکر محفل بھر کے سر ہلا دیتے ہیں۔ اللہ اللہ ان دلوں پر لذتیں قربان ہوتی ہیں جو موسیقی کیفیتوں سے پل میں آبدیدہ اور دم میں متبسّم نظر آتے ہیں۔

اُس موزونیت کے اوج پر ذہن نہیں پہنچ سکتا جو عالم کے اجزا میں طاری و ساری ہے کہ اسی پر قیامِ دنیا کا مدار ہے۔ اور اسی پر کل نظام فلکی دن رات گردش کر رہا ہے۔ ہر ستارہ اپنے اپنے دورے میں طلوع و غروب پر پل بھر اور بال برابر فرق نہیں کرتا۔ اگر اس نظم میں کہیں

سکتہ ہو اور کوئی لفظ گر جائے عجب نہیں کہ قیامت آجائے۔

بہت خوب، مان لیا کہ فارس نے نظم کی کھجوریں عرب ہی کے ہاتھ سے لیں۔ تب ضرور تھا کہ ابتدائی حال میں جو کچھ کہا تھا وہ عرب کی اصل بحروں میں ہوتا۔ بلکہ مدتِ دراز تک اُسی انداز میں کہتے رہتے۔ ایک عرصہ کے بعد تراش و ترمیم اس منزل تک پہنچاتی۔ ساتھ اس کے جس طرح دوسری تیسری صدی کی اُدر تصنیفیں ہیں اسی طرح نظم کے نمونہ بھی جدا جدا امتیاز کے ساتھ موجود ہوتے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیکھتے ہیں کہ کوئی مثنوی، قصیدہ، غزل اُس عہد کی یادگار ہو۔ مگر نمونہ کو بھی ہاتھ نہیں آتی۔ حیرت آتی ہے کہ غیر قوم، غیر زبان کے شاگرد اتنے جلد بڑھ گئے۔ کیونکر بڑھ گئے؟ بیشک تیز و طرار طبیعتیں ایجاد کے رستوں میں بڑھتی ہیں۔ مگر بچّوں کی طرح گھٹنیوں گھٹنیوں، نہ کہ اس پھرتی سے۔

فارسی میں سب سے پہلے جامع کتاب "معیار الاشعار" محقق طوسی نے لکھی۔ دیکھ لو بحروں کی تمثیل کے لیے اُس میں بھی اکثر اشعار عرب کے ہیں جو زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہیں۔ بعض بعض شعر فارسی کے ہیں لیکن وہ فقط مثالیں ہیں کہ خود انھوں نے یا اور شاعروں نے سمجھنے سمجھانے کے لیے کہہ دیں۔ اس کے سوا کسی دیوان یا تذکرہ میں فارسی کا کوئی قصیدہ یا غزل بحرہائے عرب میں نہیں نظر آتی۔

پھر جب ہم فارسی کی نظم موجودہ کی حالت کو دیکھتے ہیں اور عربی کی نظموں کو دیکھتے ہیں تو ایک کا سایہ بھی دوسرے سے نہیں ملتا۔ تم کہو گے کہ فارس نے زحاف دے دے کر اُسے تراش لیا۔ یہ جواب سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ کیونکر ہو سکتا ہے کہ شاگرد جس فن سے بالکل ناواقف تھا اُس کی بحروں میں ایسی لطافت اور موزونی پیدا کرلے کہ اُستاد کے دیے ہوئے نمونے کو بالکل مٹا دے؟ اور اس قدر جلد!

میرا قیاس یہ کہتا تھا کہ جس طرح ہر ولایت میں اپنی اپنی طبیعت کے بموجب نظم اور نظم کی خوبی ہے اسی طرح فارس بھی اس فن سے بے بہرہ نہ ہوگا۔ انقلابِ زمانہ نے جس طرح اس کے علوم و فنون کو فنا اور کتابوں کو برباد کیا، نظم کی لڑیاں بھی توڑ ڈالیں اور دیوان درہم برہم کردیے۔ پھر بھی خوش حالی یا بدحالی میں قوم قائم تھی۔ ٹوٹے پھوٹے شعر، گیتوں کی آواز، شادی کے سہاگ، یا بچّوں کی لوریوں میں مدّت تک زبان بزبان چلے آئے ہوں گے۔

دیکھو! جب ایک کھیت یا باغ خشک ہو کر ویران ہو جاتا ہے تو کیاریاں سوکھ جاتی ہیں۔

پڑدے فنا ہو جاتے ہیں۔ چند سال کے بعد ان کے نشان بھی مٹ جاتے ہیں۔ پھر جب مینھ برستے ہیں یا کوئی نہر نالا آجاتا ہے اور زمین سیراب ہوتی ہے تو جو سوکھے ساکھے بیج خاک ہو گئے تھے۔ یا وہ سبزہ و گل جو خاک کی طبیعت میں چھپے ہوئے تھے پھر نکل کھڑے ہوتے ہیں، اسی طرح جب طبیعتیں شگفتہ ہوئیں اور لوگ نظم کہنے لگے تو شعر اُنہی بحروں میں موزوں ہو کر نکلے جو خاک ایران کی اصلی طبعزاد اور خودرو سبزہ تھیں۔

سوال ہوا کہ عروض کی کتابیں عربی سانچوں میں کیونکر ڈھل گئیں؟ ج ظاہر ہے کہ عروضِ فارسی کی کتابیں 600ھ کے پس و پیش میں لکھی گئیں۔ اُس وقت جو لوگ ملک مذکور میں تھے۔ یا تو عربوں کی اولاد تھے کہ فارس میں پیدا ہو کر اُسی کو اپنا ملک سمجھتے تھے۔ یا ملک کی نسل تھے کہ مسلمان ہو گئے تھے۔ جب شاعری کا چرچہ زیادہ ہوا تو اُس کے قواعد کی بھی ضرورت ہوئی۔ فارس کے علوم پہلے ہی فنا ہو چکے تھے اور ان کے عالم اُن سے پہلے معدوم ہو گئے تھے۔ اب تصنیفات اور ضبط قواعد اُنہی علما کا کام تھا جو عربی زبان اور عربی علوم و فنون میں مہارت رکھتے تھے۔ انھیں ملکی میراث کا خیال ہی نہ آتا تھا کہ تھی بھی یا نہ تھی۔ عربی عروض کے اصول سامنے تھے اور تم جانتے ہو کہ افاعیل، تفاعیل اپنے زحافوں کے ساتھ 'گز'۔ یا۔ 'پیمانہ' ہیں۔ ہر کلامِ موزوں کو ماپ سکتے ہیں۔ فارسی ہو، سنسکرت ہو، خواہ انگریزی۔ انھوں نے فارسی کے اشعار مروّجہ کو بھی اپنے 'گز' کے نیچے دھر لیا اور اُسی کے بموجب کاٹ چھانٹ کر کے کسی نہ کسی بحر کے کنارے لگا دیا۔

میرے دوست اسے تسلیم کرتے تھے۔ لیکن جب وہ عہدِ قدیم کی نظموں کے نمونے اور عروضِ قدیم کے قواعد اور اصطلاحیں مانگتے تو اس کے جواب میں آزاد کی زبان لاجواب تھی۔ چند روز کے بعد نظر نے اور وسعت پیدا کی اور کتب لغت سے معلوم ہوا کہ فارسی قدیم میں مفصلۂ ذیل الفاظ تھے:

نظم۔ پیوستہ   نثر۔ پراگندہ   شعر۔ سروارہ   دم۔ وزن شعر   چامہ۔ غزل
چکامہ۔ قصیدہ   سروارہ۔ قافیہ   پساوند۔ ردیف   داغ۔ تخلص۔

اور یہ ظاہر ہے کہ ہر قوم کی زبان میں پہلے اشیا اور کام ہوتے ہیں۔ پھر ان کے لیے لفظ یعنی اسما اور افعال ہوتے ہیں۔ اگر عہدِ باستانی میں اہلِ فارس کو شعر کہنا نہ آتا تھا تو الفاظ مذکور کیوں تھے۔

غور کرکے دیکھو ملک عرب میں مثنوی اور مثنوی میں کسی ماجرے کے نظم کرنے کا رواج کسی عہد میں بھی نہیں ہوا۔ یہ قدیم طریقہ خاص اہلِ فارس کا ہے۔ یاد کرو حال وامق و عذرا کی داستان کا۔ قدمائے عرب کے کلام میں ردیف بھی نہیں پائی گئی۔ یہ لفظ پیچھے پیدا ہوا۔

عزیزانِ وطن! اُس دن کی خوشی کا لطف بیان نہیں کرسکتا جب کہ 'تذکرۂ دولتِ شاہی' میرے ہاتھ آیا۔ اُس میں عہد قدیم کے سیاحوں سے یہ نکتہ منقول پایا کہ عضد الدولہ دیلمی کے عہد تک 'کوہ بے ستون' پر 'قصر شیریں' کی عمارتیں اکثر باقی تھیں۔ ایک دروازہ کی پیشانی پر یہ شعر لکھا تھا:

هزبرا بہ گیہاں انوشہ بدے　　　جہاں را بدیدار نوشہ بدے

خان آرزو نے لکھا ہے کہ سلاطینِ قدیمہ میں سے فرہوش نام ایک عالی شان بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں گروہ کثیر اہل سخن کا حاضر رہتا تھا۔ ان میں سے شیدوش شاعر نے ایک موقع پر بادشاہ بیگم کے حق میں کہا:

زنِ شاہ است درداور گردا　　　گوز گردد ندارد بیم از کس

اُسی کتاب میں لکھا ہے کہ زبان قدیم میں 'درداور' شجاعت اور 'گردا' بمعنی سمندر تھا۔

اس تقریر سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو بحریں آج ہم فارسی میں دیکھتے ہیں وہ بعینہٖ اس کے پرانے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہیں اور بے کم و بیش ان کے بزرگوں کی میراث ہیں۔ نہیں! وہ بھی ہیں، عرب سے بھی لی ہیں۔ کچھ اُن میں اصلاح ہوگئی ہے، کچھ نئی ایجاد ہوگئی ہیں اور اس سے سکاکی[1] کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ اُس نے بحروں کی فہرست لکھ کر کہا ہے۔ "ترقی بآوازِ بلند پکار رہی ہے۔ کہہ دو طبع سلیم کو کہ جو چاہے ان پر بڑھائے۔ یہاں سلامتِ طبع کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔"

مرزا بیدل نے 'نکات بیدل' میں اکثر غزلیں نئی بحروں میں لکھی ہیں۔ حقیقت میں نہایت پسندیدہ ہیں اور دل کو خوش آواز معلوم ہوتی ہیں۔

---

1. سکاکی نے مصباح میں کہا ہے: و الزیادة تنادی علیها باعلیٰ صوتٍ. فقل للطبع السلیم ان یزید علیها ماشاء۔و لا حکم فی هذا الا لاستقامة الطبع۔

سر طرّۂ بہوا افشاں، ختنے ز مشک تر آفریں | نگہے بآئنہ باز کن، گل عالمے دگر آفریں
به تماشائے ایں چمن، در مژگاں فراز کن | زخمستانِ عافیت قدحے گیر و ناز کن
چہ بود سروکار غلط سبقاں در علم و عمل بفسانہ زدن | بہ قبول دلائل بے خبری، ہمہ تیر خطا بہ نشانہ زدن
شور جنوں در قفسی باہمہ بیگانہ برآ | یک دو نفس نالہ شود و از دلِ دیوانہ برآ
اگر بہ گلشن ز ناز گردد قدِ بلندِ تو جلوہ فرما | ز پیکرِ سرد موجِ خجلت بروں تراود چوے زینا

جبکہ فارس کی قدیم شاعری کے باب میں اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے تو بہتر ہے کہ اسلام کے بعد اُس نے جس طرح نئی ولادت پائی اور قدم قدم چلتی رہی اس کا حال بیان کریں۔

عزیزانِ وطن! اگرچہ نظم مذکور اپنی نثر کے ساتھ بزرگوں کا کل سرمایہ خاک میں ملا بیٹھی تھی اور تصنیف کا دروازہ بند تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ نثر کی تصنیف کے لیے ہمیشہ مضمون اور سبب درکار ہے۔ 'نظم' ایک طبعی اثر ہے کہ خود بخود طبیعت سے نکلتا ہے۔ جس طرح کوئی زمین بے روئیدگی نہیں رہتی اسی طرح کوئی زبان بے شعر نہیں رہ سکتی۔ بے شک اسلام کی زبان کو لوگ ایمان سمجھتے تھے۔ مگر اپنی زبان اپنی ہی زبان ہے۔ بات چیت، ہنسنا بولنا، شادی، مہمانی، افسانہ، کہانی جو دل کی امنگ تھی فارسی میں نکلتی ہوگی۔ اور جب ہوتا ہوگا طبیعت کا جوش بھی اپنی موزونیت اسی میں دکھاتا ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ اسلام کے بعد دو سو برس تک اُس کا نمونہ بھی ہمارے پاس نہیں۔

چند سال ہوئے کہ ایران میں مرزا رضا قلی خاں للہ باشی (اتالیق خاندان شاہی) نے (مجمع الفصحا) ایک تذکرہ کمال جامعیت کے ساتھ لکھا۔ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ بہرام اور ابوحفص سغدی سے پہلے فارسی زبان میں کسی کا شعر نہیں ملتا۔ عہد مامون الرشید میں ابوالعبّاس مروزی ایک شاعر ملک فارس میں ہوا۔ طبیعت کے جوش اور قدر دانی کی کشش نے اسے بغداد میں پہنچایا۔ اُس نے ایک قصیدہ زبان فارسی میں کہا اور خلیفہ کے خوش کرنے کو فارسی کے ساتھ عربی الفاظ ترکیب دیے۔ چونکہ خلیفہ کی حکومت ایران کو لے کر توران میں پہنچ چکی تھی اور خود زبانِ فارسی کا شوق رکھتا تھا اس لیے بہت قدر دانی کی اور ہزار دینار انعام دیے۔ افسوس کہ قصیدۂ مذکور کے زیادہ اشعار نہیں پائے جاتے۔ پھر بھی اتنا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اس ایجاد تازہ سے بہت خوش ہوا۔ شاعر مذکور 200ھ میں فوت ہوا۔ ممکن نہیں کہ ایسی لطیف

شے عرب سے آئے اور یہاں ایک غیر ملک کا رہنے والا اُس میں اس قدر جلد ایسی تراش اور اصلاح کرے کہ اصلی قالب کی صورت بالکل بدل جائے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس کے پاس اپنا قالب پہلے سے موجود ہو، جس میں شعر ڈھالے اور عرب کے لفظ داخل کرلے۔ قصیدۂ مذکور کے یہ اشعار باقی ہیں

اے رسانیدہ بدولت فرق خود بر فرق دیں — گسترانیدہ بہ فضل وجود در عالم یدیں
مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را — دین یزداں را تو بائستہ چو رخ راہرو عیں
وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ وغیرہ
کس بدیں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت — مر زبانِ پارسی را ہست باایں نوع بیں
لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تاایں لغت — گیرد از مدح و ثنائے حضرتِ تو زیب و زیں
معذور کن اے شیخ کہ گستاخی کردم — زیراکہ غریبم من و مجروحم خستہ

محمود دراق 221ھ میں فوت ہوا اس کے دو شعر تذکروں میں لکھے ہیں :

نگارینا بہ نقد جانت ندہم — گرانی در بہا ارزانت ندہم
گرفتم بجاں دامانِ وصلت — دہم جاں از کف و دامانت ندہم

حنظلہ خراسانی بھی اسی عہد کا شاعر تھا 219ھ میں فوت ہوا۔ وہ کہتا ہے :

یارم سپند اگرچہ بر آتش ہمے فگند — از بہر چشم تا نرسد مرورا گزند
او را سپند و مجمر ناید ہمے بکار — باروے ہمچو آتش وباخال چوں سپند
مہتری گر بکام شیر در است — تو خطر کن ز کام شیر و بجوے
یا بزرگی و ناز و نعمت و جاہ — یا چو مردانت مرگ رو باروے

فیروز مشرقی 283ھ میں مرگیا :

مرغیست خدنگ او عجب دیدی — مرغیکہ شکار او ہمہ جانا
دادہ پر خویش کرگسش ہدیہ — تا بچہ اش را برد بہ مہمانا
سروِ سمینِ ترا در مشک تر — زلف مشکین تو سر تا پا گرفت

ان چند شعرا کے اشعار جو مع سال عہد کے میں نے پڑھے ان سے تم نے نتیجہ نکال لیا ہوگا۔ یعنی اگر فارس کے شاعر، عرب کے شاگرد ہوتے تو پہلے عرب کی بحروں میں شعر کہتے۔ پھر رفتہ رفتہ ان میں اصلاح کر کے اس درجہ تک پہنچتے۔ اتنی جلدی یعنی 20 25 برس میں استاد کی بحروں

کو ایسے موزوں اور خوش انداز قالب میں نہ ڈھال سکتے اور عرب کی بحروں کو تم خود جانتے ہو کہ غیر ملک کے لوگوں کو موزوں بھی نہیں معلوم ہوتیں۔ وہ آپ ہی پڑھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

جتنا کلام اس ابتدائی شاعری کا ملا ہے، اس قدر کم ہے کہ نکتہ مذکور سے زیادہ کوئی بات نہیں نکال سکتے۔ البتہ دو شعر ردیف کی مثال کے بھی مل گئے۔ جسے عہد قدیم میں 'پساوند' کہتے تھے۔ یہ بھی تذکروں میں لکھا ہے کہ ابتدائی شاعر مدت تک 'دوبیتی' کہا کرتے تھے۔ خوشی کے متوالے انھیں گاتے تھے اور دل بہلاتے تھے۔ حقیقت میں گیت ہوتے تھے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ 'نظم' شاعری کے سلسلے میں کوئی رتبہ نہیں پا سکتی۔ رفتہ رفتہ 300ھ کے اندر رودکی پیدا ہوا۔ اس کی طبیعت میں آمد بہت تھی۔ اس نے دوبیتی کو 'قطعہ' اور قطعہ کو بڑھاتے بڑھاتے زیادہ اشعار کر دیے۔ اسے صاحبِ دیوان بھی لکھا ہے۔ شاید اسی واسطے وہ فارس کا پہلا شاعر کتابوں میں لکھا گیا۔ ہمارے محققوں نے اوّل سے آج تک نظم فارسی کو اور اس کے تغیرات کو دیکھ کر شعرا کے طبقے باندھے ہیں۔ صاحبِ نظر کو ان کے کلام پر غور کرنے سے عہد بہ عہد کی نظم کا رنگ صاف الگ الگ نظر آتا ہے۔

طبقاتِ شعرائے فارسی

(1)	رودکی	اسدی طوسی	فردوسی وغیرہ
(2)	خاقانی	انوری	نظامی
(3)	سعدی	حافظ	
(4)	جلال اسیر	قاسم مشہدی	قاسم دیوانہ وغیرہ

پہلے طبقہ کے اشعار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی واقعہ حالیہ۔ موزوں طبیعت کو حرکت دیتا تھا۔ یا ضرورت اس کے خیال کو اکساتی تھی تو زبان سے نظم نکلتی تھی۔ اس میں کبھی مذہبی، کبھی بزرگانہ طور پر نصیحت کرتے تھے۔ کبھی شراب، کبھی بہار کا عالم۔ کبھی فلک، کبھی نصیبہ کی شکایت کرتے تھے۔ کبھی دنیا سے دل بیزار کرتے تھے اور ہر بات میں نصیحت کے اشارے کرتے جاتے تھے۔ تم جانتے ہو محبت سے کوئی جگہ اور کوئی دل خالی نہیں۔ اس لیے عاشقانہ کلام بھی کہتے

تھے۔ روٹی کی ہوس سے بھی کوئی پیٹ خالی نہیں، اس لیے بادشاہوں کی تعریفیں بھی خوب کرتے تھے۔ اس میں جنگ، شجاعت، سخاوت، عدالت وغیرہ اوصاف اور نصائح پر بنیاد قائم کرتے تھے۔ غرض کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہوتی تھی۔

اب میں آدم الشعرا استاد رودکی کے کلام پر کچھ گفتگو کرتا ہوں۔ سب نے اسے استاد خطاب دیا ہے اور لکھتے ہیں کہ وہ صاحبِ دیوان تھا۔ غالباً اسی واسطے اس سے سلسلۂ نظم شروع کیا ہے مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ میں نے اس کا دیوان دیکھا۔ ایران کے جس شہر میں میرا گزر ہوا وہاں کے اہل کمال سے پوچھا۔۔ جہاں دیکھا چند معمولی قصیدوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُن میں بھی بعض قصیدے ایسے ہیں کہ جو لوگ ایران میں جوہر سخن کو پہچانتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ حکیم قطران کے ہیں۔ انجان فخر کرتے ہیں کہ ہمارے پاس رودکی کے ایسے قصیدے ہیں کہ اَوروں کے پاس نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اُس کی طبیعت میں پہلے شعرا اور اپنے ہمعصروں سے زیادہ آمد تھی۔ کہتے ہیں کہ اس نے 13 لاکھ شعر یادگار چھوڑے اور 'کلیلہ دمنہ' کو نظم کر دیا۔ مجھ سے پوچھو تو جیسے اُس کے شعر ہیں ایسے 13 کروڑ ہوں تو بھی بہت نہیں۔

کوئی کہتا ہے موضع رودک علاقہ بخارا کا رہنے والا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ رود[1] بربط۔ قانون خوب بجاتا تھا اس لیے رودکی تخلص کیا تھا۔ خوش آواز تھا اور گانے میں کمال تھا۔ اندھا مادرزاد تھا۔ آنکھوں کے رس نے اُدھر رستہ نہ پایا۔ وہ بھی نظم میں بہہ نکلا۔ آٹھ برس کی عمر میں شعر کہنے لگا۔ اس کے شعر کی گرمی کو موسیقی تیز کرتی تھی اور موسیقی کو اس کی خوش آوازی آسمان پر اڑاتی تھی۔ آنکھیں نہ تھیں مگر سب آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اسی کی بدولت اسماعیل سامانی کا مصاحب بنا رہا۔ 304ھ میں مر گیا۔

ایک دفعہ بادشاہ دارالخلافہ بخارا سے علاقہ خراسان میں آیا۔ یہاں ایسے معاملات پیش آئے کہ ہرات میں ٹھہر گیا۔ اہلِ دربار۔ فوجوں کے سردار طولِ مسافرت سے تنگ آ گئے۔ سب نے استاد سے کہا کہ تم خلوت و جلوت کے مصاحب ہو کسی تدبیر سے بادشاہ کو بخارا لے چلو۔ ایک دفعہ رات کا وقت تھا۔ بادشاہ نے بخارا کی آب و ہوا اور گل و گلزار کا ذکر کیا۔ استاد نے موقع پا کر سارنگی سنبھالی اور گانا شروع کر دیا۔

---

1. رود۔ تانت کو کہتے ہیں۔ 'سارنگی' پر تانت کے تار چڑھتے ہیں اس لیے اسے بھی 'رود' کہتے ہیں۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہے | یاد یار مہرباں آید ہے
ریگ آموئی[1] و درشتیہائے او | پائے ما را پرنیاں آید ہے
آب جیحوں باشگرفیہائے او | خنگ شہ را تا عناں آید ہے
اے بخارا شاد باش و شاد ذی | شاہ نزدت شادماں آید ہے
شاہ ماہ است و بخارا آسماں | ماہ سُوئے آسماں آید ہے
شاہ سرو است و بخارا بوستاں | سرو سُوئے بوستاں آید ہے

مورخ لکھتے ہیں کہ اس غزل کے کئی سو شعر ہیں مگر سب نے اتنے ہی لکھے ہیں اور اس ثبوت کے لیے یہی کافی ہیں کہ نظم فارسی کی ابھی زبان نہیں کھلی۔

(1) دیکھو ہے رودکی اور اس کے ہمعصروں کی زبان پر تکیہ کلام ہے۔ شیخ سعدی کے عہد میں کچھ تخفیف اور اب ضرورت کے سوا نہیں بولتے۔

(2) اضافۂ تشبیہی۔ استعارہ وغیرہ تکلفات کا رنگ کچھ نہیں۔ محسوسات اور ان کے اصلی حالات ہیں۔ سادے الفاظ، سیدھی باتیں، جو آپس میں کہتے ہیں، وہی صاف صاف نظم کردیتے ہیں۔ اس بے تکلفی کو دیکھو کہ کہتا ہے۔ بوے جوے مولیاں، بوے گل، نگہت، شمیم وغیرہ خوشبوؤں سے کام نہیں لیتا۔ نسیم۔ صبا۔ باد سحر کے احسان نہیں اٹھاتا۔ کنار آب کے سبزہ زار، وہاں کے گلزار اور ان کی گلگشت کو بھی یاد نہیں کرتا۔ جتنی بات تھی اتنی ہی کہہ دی یعنی دریا اور اس کی ریت۔

(3) کبھی قادرالکلام اور مشاق شاعر۔ مناسب اور پُر معنی الفاظ کے کھپانے کے لیے۔ کبھی ترکیب میں چستی پیدا کرنے کے لیے۔ لفظوں کو پس و پیش کر کے اس طرح بٹھاتا ہے کہ اگر اسے کھولیں تو ایک شعر کی ڈیڑھ دو سطریں ہو جائیں۔ یہاں جس شعر میں جتنا مطلب سماسکا وہی ہے اور لفظوں کی بندش دیکھو! کیسی ڈھیلی ڈھالی ہے۔

(4) یاد کرو وہ عام قاعدہ جو کئی دفعہ جتا چکا ہوں کہ جب کسی زبان کی انشاپردازی عالم طفولیت میں ہوتی ہے تو وہ اصلیت کے علاوہ کچھ پیدا نہیں کر سکتی۔ نہ خیالات کو پھیلا سکتی ہے۔ وہ دور کے مضامین تک ہاتھ نہیں بڑھاتی۔ پاس پاس کی چیزیں اور وہی کھلی کھلی باتیں لیتی ہے جو

---

1. دریاے جیحوں کا نام آموبہ بھی ہے

آنکھوں کے سامنے نظر آتی ہیں۔ چنانچہ اشعار مذکور میں خیال کرو۔

'مولیان' بخارا یعنی شاعر کے وطن میں ایک نہر ہے۔ پہلے شعر میں اس کا لطف یاد دلایا ہے۔

لطیفہ۔ بچارا اندھا تھا۔ آنکھیں نہ تھیں کہ نظر کے لطف پاتا۔ "بُو" کی کیفیت پائی تھی وہی کہہ سنائی۔

رستہ میں ریگستان ہے، اس کی ریت کا ذکر کیا اور شوقِ وطن نے اس کی دقتوں کو آسان کر کے دکھایا۔ آج کل کے شاعر ہوتے تو ذرّہ کو آفتاب کر کے آسمان پر چڑھاتے۔ اس بچارے کو ذرّہ کی چمک کی خبر نہ تھی۔ ریتا پاؤں کو معلوم ہوا تھا۔ 'پرنیاں' کو اور ملائمت کے آرام کو جانتا تھا۔ اسی کو کہہ دیا کہ موٹا موٹا ریتا پاؤں کو پرنیاں معلوم ہوتا ہے۔

دریائے جیحوں اور آبِ جیحوں کے ذکر میں ہمارے شاعر، اس کے پانی اور موجوں کے خیالات سے خدا جانے کیا کیا طوفان اٹھاتے۔ اس نے جو بات تھی وہی کہہ دی کہ گھوڑے کی ایک باگ پانی ہے اور یہ ایک خوشنما اور فرحت انگیز حالت ہے۔ نہ کچھ تکلیف ہے، نہ خطر ہے۔ شہر بخارا کے پہنچنے میں دل کی محبت اور وفا نے بادشاہ کی قدر و منزلت اور آمد آمد کی دھوم دھام بھی دکھادی ہے۔

اس کے کنارے پر دوستوں کے جلسے یاد دلائے ہیں۔ بے شک! حب الوطن کے جوش میں شاعروں نے بہت دلچسپ، پرزور اور رنگین خیال باندھے ہیں۔ مگر وہ شاعرانہ خیال بندیاں اور بلند پروازیاں ہیں۔ یہاں سیدھی سادی باتیں ہیں جو اپنے آس پاس ہیں۔

(5) تم نے اشعار مذکورہ میں یہ بھی دیکھ لیا کہ انشاپردازی اپنے ملک کا جغرافیہ کیونکر دکھاتی ہے۔

(6) بندش کی چستی، الفاظ کی درستی، مضمون کی بلند پروازی، مبالغہ وغیرہ وغیرہ۔ جس سے آج فارس کی شاعری بدنام ہے، وہ اس میں بالکل نہیں۔ جو کچھ ہے۔ اتنا ہے کہ اگر آپس میں بیٹھ کر باتیں کریں تو اُس میں بھی اصلیت سے اتنی زیادتی ہو جاتی ہے۔

ایک قصیدہ کے چند شعر اَور لکھتا ہوں۔ یہ اُس نے اپنے بڑھاپے اور اس کی صورتِ حال پر کہا ہے۔

قصیدہ

مرا بسود و فرو ریخت ہر چہ دنداں بود / نہ بود دندان ہابل چراغ تاباں بود

سپید سیم زدہ[1] بود و درّ مرجاں بود / ستارۂ سحری بود و قطرۂ باراں بود

یکے نماند کنوں زاں، ہمہ بسود و بریخت / چہ نحس بود ہمانا کہ نحس کیواں بود

نہ نحس کیواں بود و نہ روزگار دراز / چہ بود منت[2] بگویم قضائے یزداں بود

جہاں ہمیشہ چنیں است و گردِ گردانست / ہمیشہ تا بود آئینش گرد گرداں بود

ہماں کہ درمان باشد بجائے درد شود / و باز درد ہماں کز نخست درماں بود

کہن کند بزمانے ہمانکہ تازہ بود / و نو کند بزمانے ہماں کہ خلقاں بود

بسا شکستہ بیاباں کہ باغ خرم گشت / و باغ خرم گشت او کجا[3] بیاباں بود

ہمے چہ دانی اے ماہروے غالیہ موے / کہ حال بندہ ازیں پیش با چہ ساماں بود

شد آں زمانہ کہ رویش بسان دیبا بود / شد آں زمانہ کہ مویش بسان قطراں بود

دو زلف چوگاں بازش ہمی نمود بروے / ندیدی او را انگہ کہ زلف چوگاں بود

بلند و روشن و دیدار خوب و روے لطیف / کجا[4] گراں بُد زی من[5] ہمارہ ارزاں بود

دلم خزانہ پُر گنج بود و گنج سخن / نشان نامۂ ما مہر و شہرہ عنواں بود

بسا دلا کہ بسان حریر کردہ بہ شعر / ازاں سپس کہ بہ کردار سنگ و سنداں بود

ہمیشہ دستش زی زلفکان خوشبو بود / ہمیشہ گوشش زی مردم سخنداں بود

عیال نے، زن و فرزند نے مؤنث نے / ازیں ہمہ ہم آسودہ بود و آساں بود

ہمے خریدے و بے شمار دادہ درم / بشہر ہر چہ ہمے ترک نار پستاں بود

تو رودکی را اے منع کنوں ہمے بنی / بداں زمانہ ندیدی کہ زی حسیناں بود

بداں زمانہ ندیدی کہ در جہاں رفتے / سرود گویاں گفتی ہزار دستاں بود

شد آں زمانہ کہ شعر ورا جہاں بنوشت / شد آں زمانہ کہ او شاعر خوراساں بود

کرا[6] بزرگی و نعمت ازایں و آں بودے / مرا بزرگی و نعمت ز آل ساماں بود

---

1 قطار 2 من ترا بگویم 3 جائیکہ 4 جائیکہ گراں بود 5 بطرف من اندراں بود 6 ہر کس

بداد میر خوراساں چہل ہزار درم　　و زوفزونی یک پنج میر ماکاں بود
کنوں زمانہ دگر گشت و من دگر گشتم　　عصا بیار کہ وقت عصا[1] و انباں بود

بڑھاپے کی سیدھی سادی باتیں۔ سادے سادے خیال۔ ڈھیلی ڈھالی ترکیبیں۔ پُھس پُھسے الفاظ ہیں۔ اس کی شاعری ایسی ہے جیسے ہمارے ہندوستان میں بعض گوئیے کلاونت موزوں طبع ہوتے ہیں اور سُروں کے پورا کرنے کو لفظ جوڑ لیتے ہیں۔

زندگانی چہ کوتہ و چہ دراز　　نہ بآخر بمرد باید باز؟
ہم بہ چنبر گذار خواہد بود　　ایں رسن راا گرچہ ہست دراز
خواہی اندر عناؤ محنت زی　　خواہی اندر نشاط و نعمت و ناز
خواہی اندک تراز جہاں بپذیر　　خواہی از رے بگیر تا بہ حجاز
ایں ہمہ بود و باد تو خوابست　　خواب را حکم نہ مگر بہ مجاز
ایں ہمہ روز مرگ اگر بینی　　نشناسی ز یک دگر شاں باز

رودکی چنگ برگرفت و نواخت　　بادہ انداز کو سرود انداخت
آن عقیقین مے کہ ہر کہ بدید　　از عقیق گداختہ نشناخت
ہر دو یک جوہر اند لیک بہ طبع　　ایں بیفزدد و آں دگر بگداخت
ناصبودہ دو دست رنگیں کرد　　ناچشیدہ بتارک اندر تاخت

دقیقی ابو منصور محمد ابن احمد بلخی (یا سمرقندی) اسی طبقہ کا شاعر تھا۔ سامانی خاندان کے اخیر دور میں تھا اور اپنی اخیر زندگی میں امیر نصر ابن ناصرالدین سبکتگین کے دربار میں پہنچا۔ بہاریہ، عشقیہ، مدحیہ ہر قسم کے مضمون کہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سبکتگین کے گھرانے میں شاہانِ عجم کی تاریخ کی مدت سے فرمائش تھی کیونکہ دقیقی نے امیر نصر کی فرمائش سے اس نظم پر کمر باندھی تھی۔ مگر مسلسل نہیں۔ مختلف بادشاہوں کے حالات نظم کیے تھے کہ بد عملی نے دفعتاً نیک عمل سے محروم کر دیا۔ کمبخت غلام پر عاشق تھا۔ وہ غیرت والا تھا۔ خنجر مردانگی سے مالک کو مار ڈالا۔ 341ھ۔

---

1. وقتِ سفر است از دنیا

فردوسی نے اس کی نظم میں سے گشتاسپ کی داستان بجنسہٖ اپنے شاہنامہ میں داخل کی ہے اور سچ پوچھو تو اپنے کلام کا جلوہ چمکایا ہے۔ کیونکہ ایک قسم کی دو چیزیں برابر رکھی جاتی ہیں تو عیب و ہنر کا رنگ خوب کھلتا ہے۔ صاف نظر آرہا ہے کہ روانی بیان، شستگی زبان، نشستِ الفاظ، چستی بندش اور ادائے مطلب کا اسلوب جو فردوسی کے کلام میں ہے وہ قدرتی جوہر ہے۔ جس طرح ایک آدمی کالا ہوتا ہے۔ ایک گورا ہوتا ہے، ایک خوش آواز ہوتا ہے، ایک بد آواز ہوتا ہے۔ اسی طرح کلام میں اپنا اپنا حلق تالو الگ الگ ہے۔ ایک کی معمولی باتوں میں بھی مزہ آتا ہے، ایک میں کچھ بھی نہیں۔

(2) دقیقی کے کلام میں بیانِ ماجرا کا سلسلہ کہیں درہم برہم اور کہیں بیچ میں سے کترا ہوا ہے۔ جس بات کی تفصیل کو جی ڈھونڈتا ہے، اُسے گول مول کر جاتا ہے۔ جو معمولی بات ہے اسے تفصیل دیتا ہے۔

(3) اکثر جگہ پہلے مصرع میں داستان کا مطلب کہتا ہے۔ دوسرے مصرع میں آگے کا مطلب نہیں ہوتا۔ فضول الفاظ سے بھرتی کر کے قافیہ کا فرض ادا کر دیتا ہے۔ فردوسی کے کلام میں بھی ایسا ہے مگر نہایت کم۔ یہ قوتِ زبان اور قدرتِ بیان پر منحصر ہے۔ دقیقی کے اشعار کم ملتے ہیں۔ مجھے تلاش میں محنت اٹھانی پڑی۔ حاضرین جلسہ سنیں اور اُس عہد کی نظم کا انداز دیکھیں۔ وقت کی زبان پر غور کریں اور یہ بھی دیکھیں کہ دو بیتی سہ بیتی ہو کر کس طرح بڑھ گئی۔

لشکر کشیدن گشتاسپ بر ارجاسپ و شکست خوردن ارجاسپ

بفرمود بردن ز پیشِ سپاہ — درفش ہمایونش فرخندہ شاہ
سوے رزم ارجاسپ لشکر کشید — سپاہے کہ آں را کرانہ ندید
ز بس بانگِ اسپان و جوش و خروش — ہمے نالۂ کوس نشنید گوش
درفشانِ بسیار افراشتہ — سر نیزہ ہا زیر بگذاشتہ
چو رستہ درخت از برِ کوہسار — چو بیشہ نیستاں بوقتِ بہار[1]
ز تاریکیِ گرد و بانگِ سپاہ — کسے روز روشن نمیدید راہ

---

1. یعنی در روز روشن

بکردند یک تیر باراں نخست | بسانِ تگرگِ بہاراں درست
پوشیدہ شد چشمۂ آفتاب | ز پیکانہاے درخشاں چو آب
تو گفتی ہوا ابر دارد ہمے | وزاں ابر الماس بارد ہمے
ہوا زیں جہاں بود شبگوں شدہ | زمیں سر بسر پاک در خوں شدہ[1]
یکے مارۂ[2] بر نشستہ چو پیل | بہ تن ہمچو آہن بہ تگ ہمچو نیل
نہادے بہ تگ آں گرہ بستہ دُم | دو سہ بار بر یک درم چار سُم
چو بینائی دیدہ بے رنج راہ | رسیدے بہر جا کہ کردے نگاہ
درو دشتہا شد ہمہ لالہ گوں | بدشت و بیاباں ہمے ریخت خوں
چناں شد ز بس کشتہ آں رزمگاہ | کہ بروے نتانست رفتن سپاہ
ز توراں بکشتند چنداں سپاہ | کجا رحمت آورد گشتاسپ شاہ
چو آگاہ شد قیصر آں شاہ روم | کہ فرخ شد آں شاہ وارجاسپ شوم
فرستہ فرستاد با خواستہ[3] | غلامانِ اسپان آراستہ

بہاریّہ

مئے صافی بیار اے بُت کہ صافیست | جہاں از ماہ تا آنجا کہ ماہیست
چو از کاخ آمدی بیروں بہ صحرا | کجا[4] چشم افگنی دیباے رومیست
بیا تا مے خوریم و شاد باشیم | کہ ہنگام مے و ایام شادیست

شکایتِ روزگار

گویند صبر کن کہ ترا صبر بردہد | آرے دہد و لیک بعمرِ دگر دہد
من عمرِ خویشتن بصبوری[5] گذاشتم | عمرِ دگر بباید تا صبر بردہد

---

1 یعنی ہمہ۔ سر بسر 2 بربارۂ۔ اب بھی عمدہ گھوڑوں کی دم میں کہیں ایک کہیں دو گرہیں دیتے ہیں۔
3 خواستہ بمعنی دولت۔ اخیر میں متروک ہوگیا 4 یعنی بہر جائیکہ۔ اب یہ محاورہ متروک ہے۔
5 یعنی سپرد کردم۔ خوش آیند خیال ہے

نصیحت

من اینجا دیر ماندم خوار گشتم — عزیز از ماندنِ دائم شود خوار
چو آب اندر شمر بسیار ماند — شود طعمش بد از آرام بسیار

شراب کی تعریف میں

آں مرکّب کہ کالبد از نور — لیکن او را روان و جاں از نار
زاں ستارہ کہ مغربش دہنست — شرق او را ہمیشہ بر رخسار

ممدوح کی سخاوت

تو آں ابری کہ ناساید شب و روز — ز باریدن چناں چوں از کماں[1] تیر
نباری در کفِ دل خواہ مجز زر — چناں چوں بر سر بد خواہ جز بیر[2]

شراب کی کیفیت

زاں تلخ ے گزیں[3] کہ گرداند — نیروش روان تلخ را شیریں
از طلعتِ او ہوا چنان گردد — کز خونِ[4] تدرو سینۂ شاہیں
استاد شہید زندہ بایستے — واں شاعر تیرہ[5] چشم روشن بیں
تا شاہ مرا مدیح گفتندے — ز الفاظ خوش و معانی رنگیں

---

1 چنانکہ از کمان 2 بیر، صاعقہ 3 یعنی اختیار کن۔ افسوس کہ مختصر اور کھرے محاورے مفت ضائع ہوئے۔
4 وہاں اس شکار کارات دن مشغلہ رہتا ہے۔ کیا خوشنما تشبیہ ہے۔
5 دیکھنا "کور" کو کن لفظوں میں ادا کیا ہے۔ رودکی مراد ہے۔

فردوسی ابوالقاسم ابن اسحاق طبقہ اوّل میں کئی ناموروں سے پیچھے آیا ہے۔ مگر ناموری کا نشان سب سے اونچا لہرایا ہے۔ اسحاق زمیندار۔ حاکم طوس کے چار باغ میں باغبان تھا کہ باغ مراد میں یہ پودا پیدا ہوا اور اسی آبادی میں بڑا ہوا۔ صحرائی آبادی میں اس کی شاعری کے لیے کوئی ترغیب یا جبر نہ تھا۔ باوجود اس کے بچپن سے شعر کہتا تھا کہ وہ اس کا مادرزاد جوہر تھا۔ اپنے کھیتوں میں پھرتا تھا۔ نہروں کے کناروں پر بیٹھتا تھا اور جو دل سے اُگتا تھا اُسے کاغذ پر ہرا کرتا تھا۔

چرند پرند کے گوشت، قدرت کی غذائیں، برفانی چشموں کے بہتے پانی جس طرح بدن کو فربہ اور زورمند کرتے تھے۔ اسی طرح خیالات کو نیچر کی ہوا میں بلند کرتے تھے اور اُسے ملک سخن کا پہلوان بناتے تھے۔ کبھی فراخ جنگلوں، ہرے ٹیلوں، صبح کی بہار، شام و شفق کے نقش و نگار میں قدرت کے جلوے دیکھتا اور طبیعت پر خوشی کے رنگ لیتا۔ کبھی جنگلوں کے خوشنما، خوش آواز جانوروں میں پھر کر ذوق و شوق پھیلاتا۔

اگرچہ اُس کی طبیعت کو خالص انسانیت نے شائستگی دی تھی اور امیروں کی صحبت اور درباری تکلفات سے محروم رکھا تھا۔ لیکن خوبی اس میں یہ ہوئی کہ اُن کی خود آرائی اور ظاہر نمائی کے دھبّوں سے بچ گیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ زورِ طبع اُس کا صحرا کے خلوت خانہ میں اپنے تئیں آپ ورزش دیتا رہا۔ غیروں کے کام اس کے کلام کے لیے نمونہ نہ ہوئے۔ بلکہ علم کی اصلاح اور مصنوعی تکلف اُس کے لکھے کو قلم نہ چھوا سکے۔

اسی عالم میں اُسے خبر پہنچی کہ محمود کو ایک "افسانہ شاہانہ" کے نظم میں سننے کا شوق ہے اور دقیقی شاعر اس میں ناکام مر چکا ہے۔ دل کے خیال اور کمال کے زور جوش کھا کر چھلک پڑے۔ پہلے زوال جمشید اور ترقیِ ضحاک کی داستان نظم کر کے یاروں کو سنائی۔ سب کو پسند آئی۔ چنانچہ یہ اور ساتھ اُس کے اپنی عمر بھر کی کمائی لے کر غزنیں کو روانہ ہوا۔ وہاں عنصری شاعر سے ملاقات ہوئی۔ محمود مدت سے نظم شاہنامہ کی فرمائش کر رہا تھا، اور وہ ٹالتا تھا۔ فردوسی اور اس کے کلام کی شان و شوکت کو مناسبِ حال دیکھا۔ کہا کہ چند شعر بادشاہ کی تعریف میں کہہ لو اور چل کر دربار میں سناؤ۔ فردوسی نے اسی بحر میں کچھ اشعار لکھے۔ میں چند شعر ان میں سے سناتا ہوں :

ز یزدان اُبر شاہ باد آفریں[1] | کہ نازد بہ او تخت و تاج و نگیں
جہاندار محمود شاہِ بزرگ | بآبشخور آرد ہمے شیر و گرگ
جہاں آفریں تا جہاں آفرید | چو او مر زبانے[2] نیامد پدید
ز کشمیر تا پیش دریاے چیں | برو شہر یاراں کنند آفریں
چو کودک[3] لب از شیر نادر نشست | بگہوارہ محمود گوید نخست
بیزم اندر او آسمانِ وفا ست | برزم اندر او شیر جنگ آزماست
بہ تن زندہ پیل و بجاں جبرئیل | بہ کف ابر بہمن بہ دل رود نیل

دیکھو! نظم کی صفائی، بندش کی چستی، الفاظ کی درستی، معنوں کی شکوہ، کلام کی شوکت، اس پر قریب الفہم پاس پاس کی تشبیہیں ہیں۔ استعاروں اور اضافتوں کے اینچ پینچ اصلا نہیں۔ سیدھی سادی باتیں ہیں اور ہر بات کو کس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے۔ الفاظ محاورہ سے معزول ہو گئے ہیں، پھر بھی کانوں کو بھلے معلوم ہوتے تھے۔

ساتھ ہی رستم واسفندیار کی داستان لکھی تھی وہ سنائی۔ آغاز داستان میں کہتا ہے :

کنوں[4] خورد باید مئے خوشگوار | کہ مے بوے مے آید[5] از جوے بار
ہوا پُر خروش و زمیں پُر ز جوش | خنک آں کہ دل شاد دارد ز نوش
درم دارد و نُقل، و نان و نبید | سر گوسفندے تواند بُرید

اُس کی نظم کے دبدبہ سے دربار گونج اٹھا۔ محمود بہت خوش ہوا۔ نظم شاہنامہ کے لیے حکم دیا۔ اشرفی شعر انعام مقرر کیا۔ ایک خانہ باغ اپنے حرم سرا کے زیر سایہ، وہیں انواع واقسام کے ہتھیار، شاہانِ سلف کے دربار اور مشہور معرکوں کے مرقعے۔ عجیب جانوروں کی تصویریں

---

1 آفریں۔ بمعنی دعاو ثنا۔ عہدِ قدیم میں عام محاورہ تھا۔ اب متروک ہے۔

2 متاخرین میں متروک ہو گیا مگر خوشنما محاورہ ہے۔

3 بچے کے گویائی حاصل کرنے کو کیسے پیارے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

4 دیکھو فصیح صحرائی نے کیا سیدھے سادے خیالات میں مطلب ادا کیا ہے۔

5 دیکھو "مے" اور "آید" کے درمیان میں کیا فاصلہ ڈالا ہے۔

سجا کر ایک عجائب خانہ مرتب کر دیا اور وہ نظم شاہنامہ میں مصروف ہوا۔ وہ اس کی محنتوں کا کارنامہ اور عمر بھر کی کمائی 60 ہزار شعر کا مجلّہ ہے کہ 30 برس کی جگر خراشی میں تیار ہوا ہے۔ چنانچہ خود کہتا ہے :

بسے رنج بردم دریں سال سی عجم زندہ کردم بدیں پارسی

اب مجھے اس کی زبان اور انداز بیان میں کچھ کہنا چاہیے۔ دیکھیے! جب رودکی کی آواز سنتے سنتے اُس کا طنطنۂ کلام کان میں پہنچتا ہے تو مذاق سخن چونک اُٹھتا ہے کہ نظم فارسی ابھی بچّہ تھی۔ یکایک جوان کیونکر ہو گئی اور جوانی بھی وہ کہ رستم کی پہلوانی اور اقبال کیانی۔

بہار، سبزہ زار کے سامان اور حسن کے جلوے شعرائے ایران کے معمولی تکیہ کلام ہیں، ہر مطلب کو انہی میں پھیلاتے ہیں۔ فردوسی کی نظم میں یہ رنگ بہت کم ہے۔ کوئی سرگزشت سبزہ زار میں واقع ہوئی تو اُس کی خوشنمائی دکھا دی۔ کسی حسین کا ذکر آگیا، اچھی صورت تھی دیکھ لی، شراب کا ذکر آگیا، لازمۂ مجلس تھا وہ بھی پی لی۔

اَور شاعر، خیالی مطالب کو اچھا پھیلاتے ہیں۔ بیان واقعہ میں کمزور ہو جاتے ہیں۔ مگر اُس کی زبان کا زور ہر مطلب پر پوری قدرت رکھتا ہے، اور مقصدِ معیّن کو عمدہ طور پر ادا کرتا ہے۔ اَور شاعر، بیت کا دوسرا پلہّ بھرتی سے بھرتے ہیں۔ وہ اُس میں بھی اصلی مطلب کو کھپاتا ہے یا ایسا مضمون پیدا کرتا ہے کہ اصل ماجرے کا جز معلوم ہوتا ہے۔

اس کی انشاپردازی استعاروں سے رنگینی اور صنعتوں سے میناکاری نہیں مانگتی۔ صاف صاف شعر، سادہ سادہ لفظ، محاورہ کی باتیں، سلیس زبان۔ قدرتی نہر میں چشمۂ خداداد کا پانی بہتا چلا جاتا ہے۔ رستم اور اسفندیار کے معرکہ میں ہر نیک اندیش یہی چاہتا تھا کہ لڑائی نہ ہو۔ بہت سلام و پیام ہوئے۔ جب لڑائی کے سوا چارہ نہ رہا اور موتیں نظر آنے لگیں تو فصیح فارس 'زال' پدر 'رستم' کی زبانی افسوس کرتا ہے :

ندانم کہ شب اسپ اسفندیار سوے آخور آید ہمے بے سوار
ویا بارۂ رستمِ جنگ جوے بہ خانہ کند بے خداوند روے

افراسیاب بادشاہِ توران نے حالتِ شکار میں ایک نوجوان زمیندار کو کھیت پر دیکھا اور خیال کیا کہ اس ہونہار کو پہلوانی کے کرتب سکھائیں تو رستم کو ضرور مار لے گا۔ یہ رستم کا پوتا، سہراب کا بیٹا تھا کہ بے خبری کے جنگل میں پل رہا تھا۔ دیکھو! سادی تصویر کھینچی ہے مگر کتنی خوشنما ہے :

شہِ ترک ناگہ یکے[1] بنگرید — کشاورز مردے تناور بدید
ستادہ بداں دشت ہچوں ہیوں — بتن ہچو کوہ و بہ چہرہ چو خوں
کشیدہ برو ساعد و یال و برز — درختیست در دست مانند گرز
قوی گردن و سینہ و بر فراخ — بتن چوں درخت و بہ بازو چو شاخ
بداں پہلوی بازوانِ دراز — ہے[2] شاخ بشکست آں سرفراز

غور کرو، انہی چیزوں کے ذریعے سے مطلب ادا کیا ہے جو وہاں سامنے موجود ہیں۔ استعارہ کے ذریعے سے خیالی جسامت اور فرضی زور نہیں پیدا کیا۔ ایک اور جگہ کہتا ہے :

یلے بود مانند آزادہ سرو — بہ سر بر کلہ ہچو بالِ تذرو

ایک صف آرائی میں کہتا ہے :

بفرمود تا کوسِ کیں کوفتند — یلاں ہچو شیراں بر آشوفتند
بزد نائے زرین و بر بست کوس — بر آراست لشکر چو چشمِ خروس

میدانِ جنگ میں کہتا ہے :

تبرزیں بہ خونِ یلاں گشتہ غرق — چو تاج[3] خروسانِ جنگی بہ فرق

میدان میں فخریہ کہتا ہے :

سوارے چو من پاے برزیں[4] نہ کاشت — کسے تیغ و گرزِ مرا بر نداشت

دیکھو اس کی بے تکلفی اور سادہ بیانی جب کسی شے کی کمی یا بے حقیقتی دکھاتا ہے۔ (دیکھنا کیا بے تکلف خیال میں مطلب کہہ دیا ہے) ۔

سر آوردم ایں رزم کاموس نیز — دراز است و نفتاد از ویک پشیز
گر از داستاں یک سخن کم بُدے — روانِ مرا جاے ماتم بُدے

آلکڑ میندار ہے، جو لفظ اس کے روزمرہ کاروبار نے زبان پر دیے ہیں، وہی نظم میں بھی بولتا ہے۔ بے شک مبالغہ فارسی کا جوہر ہے مگر یہ دیکھو کہ اُس کا مبالغہ بھی کیسا بے تکلف اور سیدھا سادا ہے۔ وہ کوہ و صحرا کا فرزند، قدرت کے مرغزاروں کا بلبل ہزار داستان ہے اور نغمہ اس کا

---

1 یعنی دفعتاً، یکایک 2 اب بموجب محاورہ کے کہتے ہیں۔ شاخ درخت سے شکست۔ 3 ان پاس پاس کی تشبیہوں کو دیکھو کیا بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ 4 فن زبان کے دہقان نے دیکھو پاے کاشتن کا محاورہ کیا خوب صورت نکالا ہے۔

طبع زاد ہے۔ بلبل، تان، سُر، پلٹی، ٹنگری نہیں جانتی کیونکہ اس نے تکلف کے گویّوں اور بناوٹ کے کلاونتوں سے شاگردی کا داغ نہیں کھایا۔ اسی طرح استعاروں اور صنعتوں سے مانگے کا رنگ نہیں لیا۔

نہ سمجھنا کہ وہ حسن کا جوبن نہیں دکھا سکتا۔ اتنا ہے کہ اَور شاعر جا و بے جا حسن اور لوازماتِ حسن کے استعاروں سے کلام کو آلودہ کرتے ہیں۔ وہ اگر موقع پر کسی حسین کا ذکر آتا ہے تو اس کی کیفیت بھی دکھا دیتا ہے۔ عروسِ رستم کے حال میں کہتا ہے :

لباں از طبرزد، زباں از شکر　　　دہانش مرصع بہ لعل و گہر
دو ابرو کمان و دو گیسو کمند　　　زبانش چو خنجر، دہانش چو قند

خسرو کی شیریں سے ملاقات ہوئی ہے اور شیریں کے آنسو ٹپک پڑے ہیں :

بہ نرگس گلِ ارغواں را بشست　　　کہ بیمار بُد نرگس و گل درست

ایک اور جگہ کہتا ہے :

نگارے بُد اندر شبستاں اوے　　　زگلبرگ رخ داشت وز مشک بوے

ایک اور جگہ کہتا ہے :

یکے دخترے داشت خاقاں چو ماہ　　　کجا ماہ دارد دو چشمِ سیاہ
بہ دُنبال چشمش یکے خال بود　　　کہ چشمِ خودش ہم بہ دُنبال بود
بہم بستہ مو را بہ صد پیچ و تاب　　　گرہ دادہ شب را پسِ آفتاب

غور سے دیکھو استعارہ اور تشبیہ کی گرہ کو کس حکمت سے کھولا ہے اور اضافتوں سے کیا بچ کر نکل گیا ہے۔

اس کے زورِ زبان کے آگے ہر مطلب یکساں ہے۔ باتوں ہی باتوں میں ادا کر دیتا ہے، خصوصاً میدانِ جنگ کی تصویر تو ایسی کھینچتا ہے کہ سامنے تھئیٹر باندھ دیتا ہے۔ رستم اور اشکبوس کشانی تورانی کی لڑائی دیکھو :

تہمتن بہ بندِ کمر برد چنگ　　　گزیں کرد یک چوبہ تیرِ خدنگ
خدنگے برآورد پیکاں چو آب　　　نہادہ بروچار پرِّ عُقاب
بمالید چاچی کماں را بدست　　　بہ چرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست　　　غریو از خم چرخ چاچی بخواست

چو سو فارش آمد بہ پہنائے گوش ز چرمِ گوزناں برآمد خروش
چو[1] بوسید پیکاں زر انگشتِ او گزر کرد از مہرۂ پشتِ او
قضا گفت گیر و قدر گفت دہ ملک گفت احسن فلک گفت زہ
بزد تیر بر سینۂ اشکبوس سپہر بریں بر کفش داد بوس
کشانی ہم اندر زماں جاں بداد تو گفتی کہ از بطنِ مادر نہ زاد

اور چاہتا ہے تو صفحوں کے مضمون کو دو شعروں میں سما دیتا ہے :

بروزِ نبرد آں یلِ ارجمند بہ تیغ و بہ خنجر بہ گرز و کمند
درید و برید و شکست و بہ بست یلاں را سر و سینہ و پا و دست

ایک جلسہ کی روئداد میں بھی یہی کمال کیا ہے :

چو یک نیمہ از تیرہ شب در گزشت شب آہنگ بر چرخِ گرداں بگشت
پے مشورۃ مجلس آراستند نشستند و گفتند و برخاستند

بیانِ مطلب میں اس کی زبان گھر کے ذخیرہ سے کام لیتی تھی۔ غیر زبان کی التجا کم کرتی تھی۔ اسی سے مشہور ہے کہ فردوسی نے عربی کا ایک لفظ نہیں لیا۔ اُس کے کلام میں عربی لفظ ہیں مگر اَوروں کی نسبت بہت کم ہیں۔ اگر شہر میں تربیت پاتا، اگر مدارسِ علمی سے فصاحت لیتا تو کلام پر عربی کا پرتو پڑتا۔ ملک کے نیچر کا درخت تھا۔ باغبان کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچا کہ غیر پیوند کا بار اس پر ڈالتا۔

لطیفہ۔ شاہنامہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے رستم کے ساتھ دلی محبت تھی۔ جیسے ایک بچہ کو پال پوس کر کوئی پروان چڑھاتا ہے اور اس کی بہار زندگانی دیکھ کر خوش ہوتا ہے، یہی حال اس کا ہے۔ اُس نے رستم کے کارناموں کو اس جوش و خروش سے لکھا ہے کہ کسی کا عال ایسا نہیں لکھا۔ گویا اس تصنیف سے مقصود اسی کا حال سنانا تھا، اَوروں کا بہانا تھا :

جہاں آفریں تا جہاں آفرید سوارے چو رستم نیامد پدید

سکندر نامہ میں نظامی کا یہی حال سکندر کے ساتھ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف کو اپنے مضامین و مصنفات سے اولاد کی محبت ہوتی ہے۔ اسی واسطے کہنے والوں نے انھیں زادہ ہائے

---

1. ان دو شعروں میں سوچو کہ خیال کو کن لفظوں میں ادا کیا ہے۔

معنوی کہا ہے۔

ظاہر میں سکندر نامہ، شاہنامہ کا فوٹو نظر آتا ہے مگر دونوں کے اندازِ کلام میں بہت فرق ہے۔ سبب اس کا یہ ہوا کہ فردوسی کی بے تکلفی اور سادہ گوئی نے تشبیہوں اور استعاروں میں جو چیزیں آس پاس نظر آتی تھیں، سب خرچ کر دیں۔ نظامی نے جب انھیں مستعمل دیکھا تو ان پر نقاشی کر کے کام میں لایا۔ فردوسی کے کلام میں استعارہ اس قدر کم تھا کہ گویا نہ تھا۔ نظامی نے تشبیہ کو استعارہ اور استعارہ در استعارہ کر دیا۔ اس سے مضمون رنگین ہوا مگر بجائے صفائی کے باریکی اور پیچیدگی پیدا ہو گئی اور ساتھ اس کے اصلیت گم ہو گئی۔

فردوسی اور اس کے ہم عصروں کے کلام میں امتیاز

فردوسی اور اُس کے ہم عصروں کے کلام میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ وہ کہساروں اور مرغزاروں کا پرورش یافتہ تھا۔ کہتا وہ تھا جو طبیعت سے اُگتا تھا۔ اسی واسطے خالص ملک کی زبان میں ہوتا تھا۔ الفاظ کھرے۔ پارسی کھری۔ بات میں بناوٹ نہیں۔ بلاغت کے پیچ نہیں۔ استعاروں کے الجھاؤ نہیں۔ رنگینی سے پاک۔ تکلف سے صاف۔ کلام کو دیکھو! کیسا سنگین اور استوار واقع ہوا ہے۔ 4 شعر سیکڑوں میں ملا دو۔ میل نہیں کھاتے۔

شعرائے مذکور دربار شاہی کے حاضر باش تھے۔ علماو فضلا کے ساتھ ہم صحبت تھے۔ اس میں اکثر عربی اور علمی الفاظ کام میں آتے تھے۔ وضع و لباس میں قواعد کے پابند تھے۔ وہی انداز اور میرزائی تراش کلام میں جلوہ دکھاتی تھی۔ پھر بھی زمانہ ایک تھا، سرزمین ایک تھی۔ اصلیت سے باہر نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ہر ایک کا کلام تھوڑا تھوڑا سنا کر اپنے بیان کی تصدیق کرتا ہوں۔

اَسدِی طُوسِی ابو نصر علی ابن احمد۔ اس جگت استاد کو کل تذکروں اور تاریخوں میں استاد اسدی طوسی لکھا ہے۔ سچ ہے جس کے دامن سے فردوسی جیسا شاگرد پَل کر اٹھے، وہ نہیں تو استاد کون ہے۔ زبان فارسی کی فرہنگ اور اصولِ لغت سب سے پہلے اس نے لکھے۔ پھر جس نے لکھا، اسے دیکھ کر لکھا۔ (1) وہ نظم فارسی کا ابتدائی دستکار ہے۔ اُس کی زبان میں سنگینی کے ساتھ رنگینی اور نزاکت موجود ہے۔ (2) بات کہتا ہے اور اُس کے لفظوں میں سے شاعرانہ مضمون پیدا کرتا ہے۔ (3) بڈھا استاد ہے مگر دل نوجوان ہے۔ جہاں باغ، بہار، حسن، شراب کا ذکر آجاتا ہے، اُسے پھیلاتا ہے اور مزے لیتا ہے۔ اس کی قدرتِ کلام نے نظم کی آزادی کو مطالب سے وابستہ کیا اور دوبیتی، سہ بیتی کو زیادہ پھیلایا۔ اکثر قطعے، عاشقانہ، واعظانہ،

شاعرانہ وغیرہ نظم کیے۔

دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اُس عہد میں اشیاے بے جان کو ذی عقل اور جاندار فرض کر کے مناظرہ کرواتے تھے اور ان کے سوال و جواب کو نظم کرتے تھے۔ استاد موصوف نے مباحثۂ زمین و آسمان، روز و شب، نیزہ و کمان، گبرو مسلم وغیرہ خوب لکھے ہیں۔ ہر نظم کے 30 40 50 شعر ہیں۔ خاتمہ پر 2 3 شعر بادشاہ یا وزیر کی تعریف میں۔ تقریباً سو برس بعد اس انداز سے دل بھر گئے۔ پھر بھی شیخ سعدی نے 'گلستاں' میں نشان بادشاہی اور سراپردہ کو لڑا کر پرانے کپڑے کو نیا رنگ دیا ہے۔ 465ھ میں یعنی شاگرد کے 4 برس بعد فوت ہوا۔ اب اس کا کلام سناتا ہوں۔ عہد کی زبان۔ بحروں کے وزن اور جو اندازِ شاعری اُس کے میں نے بیان کیے، ہر نکتہ پر غور فرمائیے :

مناظرۂ نیزہ و کمان (کل 31 شعر ہیں)

ہر سلاحی را دگر زخمے ست اندر کارزار — زخم سخت آں واں کزو گردد عدو را کارزار
لیک آں کو ہم بجاے خویش وزخم آورد دُور — رمح و قوس است آلت جنگ آورانِ کیں گزار
ہر دو را روزے جدال افتاد باہم در سخن — ایں بر آں آورد حجت۔ آں بدیں کرد افتخار
رمح گفت، از تو کہ قوسی، فصلِ من بہتر ازانکہ — تو چو پُشتِ عاشقی، من چوں قدِ دلبر نگار
قوس گفت ارچوں قد یاری تو، چہ بود[1] کز مثال — من چناں کا بروے یارم، گر توئی چوں قدِ یار
رمح گفتا، بد عصاے موسی مرسل چو من — آنکہ شد مار و بر آورد از سرِ دشمن دمار
قوس گفتا، بد عصاے موسی آرے چوں تو لیک — آں عصا ہم شبہ من شد، چوں براعدا گشت مار
رمح دیگر رہ بہ تندی گفت تو کوتہ قدی — مردمِ کوتاہ معجب باشد و نابردبار
قوس گفتا، بسکہ گفتی یافہ اکنوں یک بہ یک — پاسخ از من بشنو و عقلت بلفظم برگمار
ہم بہ قوت ژندہ پیلم، ہم بہ ہیبت شرزہ شیر — ہم بہ پیچش تند بادم، ہم بہ سوزش تفتہ نار
برجہاں ژالہ چو نوکِ تیر من بارد غمام — از ہوا قوس قزح چوں من پدید آرد بہار
جز بصحرا بر، نیائی تو بکار آنجاکہ جنگ — ہم بصحرا بر، بکار آیم من و ہم در حصار

1. چہ بود اگر تو بہ مثل چوں قد یار ہستی۔

شاخِ میوہ در خزاں چوں من گرِد خم گاہِ بر — ماہ گردوں ہر مہے چوں من شود وقتے نزار
صاجت را در سفر توشہ نتانی داد[1] تو — از ہوا من آورم مرغان و صید مرغزار
رح کایں بشنید، عاجز گشت، عذر آورد و گفت — راست گفتی، ایں نیا مختی[2] مگر از شہریار
نامور میر اجل والا منوچہر اصل ملک — تاج شاہان و شجاع دولت و فخرِ تبار

6 شعر اور مدحیہ لکھے ہیں۔

گرشاسپ نامہ کے اشعار سنیے اور دیکھیے کہ شاگرد کی تصویر سے استاد کیونکر تصویر اتار تا ہے۔

(تمہید) :

ز کردارِ گرشاسپ اندر جہاں — یکے نامہ بد یادگار از مہاں
ز فرہنگ و نیرنگ و داد و ستم — ز خوبی و زشتی و شادی و غم
ز نخچیر و گرد و نفرازی و بزم — ز مہر و دل و کینہ سازی و رزم
کہ چوں خوانی از ہر درے اندکے — بسے دانش افزا بد از ہر یکے
ز رستم ہمے چونکہ خواہی شنود — گمانی[3] کہ چوں او بمردی نبود
گر از رزم گرشاسپ یاد آیدت — ہمہ کار رستم بباد آیدت
ہمے رستم آں بد کہ دیوِ نژند — ببردش بہ ابرو بدریا فگند
سُتہ شد ز ہوماں بگرز گراں — زدش دشتبانے بہ ماژندراں
زبوں کردش اسفندیارِ دلیر — بہ کشتیش آورد سہراب زیر
سپہدار گرشاسپ تازندہ بود — نہ کردش زبوں کس نہ افگندہ بود
بروم و بچیں و بہند از نبرد — بکرد انچہ دستان رستم نہ کرد
نہ گرگ و نہ ببر آمد از وے رہا — نہ شیر و نہ دیو و نہ نر اژدہا
بہ شہنامہ فردوسیِ نغز گوے — چو از پیش گویندگاں بُرد گوے
بسے یاد رزم یلاں کردہ بود — وزیں در سخن یاد ناوردہ بود
نہالے بُد ایں، رستہ ہم زاں درخت — شدہ خشک و بے بار و پژمردہ سخت
من ایدوں ز طبعم بہار آورم — مر ایں شاخ را نو ببار آورم
بباد ہنر گل کفانم بر اُوے — ز ابر سخن دُر فشانم بر اُوے

---

1 نتوانی داد 2 نیاموختی 3 گمان بری

برو میوہ دارش آرم بروں
کنم آفرین شہنشہ فزوں

بسازم یکے بوستاں چوں بہشت
کہ خندد ز خوشی براردی بہشت

گلش سر بسر درّ گویا بود
درخت و گیا مشک بویا بود

بُستانے آریم از خوش سخن
کہ ہرگز نگارش نہ گردد کہن

بتانش از جزو زادہ و ز جان پاک
ز دانش سرشتہ نہ از آب و خاک

بباغم یکے دیبہ شاہوار
ز معنیش رنگ و ز گوہر نگار

ز جاں آورم تار و پودش فراز
کنم خسرویرا برو بر طراز

مرا جز سخن ساختن کار نیست
سخن ہست لیکن خریدار نیست

زراداں ہمیں شاہ ماند است و بس
خریدار از و بہترم نیست کس

ز نیکو سخن نیست پائندہ تر
نہ زاں خوشتر و دل کشائندہ تر

سخن ہمچو جاں زاں نگردد کہن
کہ فرزند جانست زیبا سخن

سرائندہ دہقان موبد نژاد
ز رگفتِ دگر موبداں کرد یاد

کہ بر شاہ جم چوں بر آشفت بخت
بنا کام ضحاک روداد تخت

جہاں زیر فرمان ضحاک شد
ز ہر نامۂ نام جم پاک شد

چو بگرفت گیتی بشاہنشہی
فرستاد نزدِ شہاں آگہی

کہ بارائے ماہر کہ دل کرد راست
بجویند جمشید را، تا کجا ست

گرش جائے در کہ بود چوں پلنگ
دگر زیر آب اندروں چوں نہنگ

بہ خشکی چو یوزش ببندید دست
بر آرید از آبش چو ماہی بہ شست

گریزاں ہمے شد جم اندر جہاں
پریوار از چشم مردم نہاں

بشہرے کہ رفتے نماندے بسے
بداں تا نشانش ندانند کسے

بدیں گونہ بُد تاکہ گردندہ مہر
بہ پیمود در راہ، راہ سپہر

پس از درد بسیار و رنج دراز
بیامد ابر زا دلستاں فراز

یکے شہر دید از خوشی چوں بہشت
در و دشت و کوہش ہمہ باغ و کشت

نہادش نکو، تازہ بر، نونوا
زمیں خورم، آبش خنک، خوش ہوا

پُر از حشر انبوہ و مردان مرد — سپاہی و شہری یلانِ نبرد
درو خسرو نامور شہریار — شہے کش نباشد بصد شہریار
مر آں شاہ را نام گورنگ بود — کزو تیغ فرہنگ بے زنگ بود
یکے دخترش بود کز دلبری — پری را بہ رخ کردے از دل بری
بکاخ اندروں بت، بمجلس بہار — در ایواں نگارو، بمیداں سوار
مہش مشک سای و شکر میفروش — دو نرگس کماں کش، دو گل درع پوش
شبستاں گلستاں بدیدار او — دو زلف و دو رخ زلف گلنار او

شاہ ناصر خسرو۔ ان کا کلام چوتھی صدی کی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ فضیلت اور حکمت و فلسفہ میں بو علی سینا اور ابو نصر فارابی کے پہلو نشین تھے۔ آخر عمر میں 20 برس عزلت گزین ہو کر سب تصنیفات کو فنا کر دیا۔ 12 ہزار شعر کا دیوان ایران میں مشہور ہے۔ جو کچھ کہا، کمال شاعری کے اظہار کے لیے نہیں کہا۔ نہ شعرائے عصر سے مقابلہ مدِ نظر تھا۔ دل کا جوش تھا۔ زبان سے چھلکا اور اپنی ذاتی زبان میں چھلکا۔ علم کتابی نے عربی الفاظ زبان پر ڈالے تھے۔ دیکھو! وہ بھی آگئے۔ مگر کلام خاکِ خوراسان کا طبع زاد جوہر تھا۔ علم عارضی تھا، جوہر کو نہ دبا سکا۔ اسی واسطے زبانِ ملک کی اصلیت و اصالت دیکھنی چاہو تو فردوسی کا کلام دیکھو یا ان کا :

چوں گشت جہاں را دگر احوال عیانیش — زیراکہ بگسترد خزاں راز نہانیش
بر حسرت شاخ گل در باغ گوا شد — بیچارگی دزروی و کوژی و نوانیش
تا زاغ بباغ آمد بلبل ز فصاحت — بر بست زباں وز طرب و لحن واغانیش
شرمندہ شد از باد سحر گلبن عریاں — وز آب رواں شرمش بر بود روانیش
کہسار کہ چوں رزمۂ بزاز بد، اکنوں — گر بنگری از کلبۂ نداف ندانیش
چوں زرّ مزوّر نگر آں لعل بدخشیش — چوں چادر گاذر نگر آں برد یمانیش
بس باد جہد سرد زکہ لاجرم اکنوں — چوں پیر کہ یاد آید از روز جوانیش
خورشید بپوشد ز غمش پیرہن خر — اینست ہمیشہ سلب خوب خزانیش
بر مفرش پیروزہ بہ شب شاہِ حبش را — از سودہ پاکیزہ بلور است ادانیش
بنگر بہ ستارہ کہ بتازد سپس دیو — چوں زرّ گدازیدہ کہ بر قیر چکانیش
مانند یکے جام تخین است سہا ہنگ — بزدودہ بہ قطرۂ سحری چرخ کیانیش

گر نیست یخیں چوں؟ کہ چو خورشید بر آید
ہر چند کہ جویند نیابند نشانیش

پرویں بہ چہ ماند یکے دستہ نرگس
یا نسترنِ تازہ کہ بر سبزہ فشانیش

ایں دہر دوندہ بہ یکے مرکب ماند
کزکار نیاساید ہر چند دوانیش

گیتی ست یکے بندۂ بدخوست مخوانش
زیرِ از تو بد خو بگریزد چو بخوانیش

از بہر جفا سوے تو آید ز در خویش
مگزار وز در دُور براں گر بتوانیش

دشمن چو نکو حال شدی گرد تو گردد
زنہار مشو غرّہ بداں چرب زبانیش

چونانکہ چو بز بہتر و فربہ تر گردد
از بہر طمع بیش کند مرد شبانیش

فرزند بسے دارد ایں دہر جفا جو
ہر یک بُدہ بے حاصل چوں مادر زانیش

ناکس بہ تو جز محنت و خواری نہ رساند
ہر چند کہ تو بر فلک ماہ رسانیش

ہر گاہ نہ بینی مگر آنرا کہ سزا ہست
کزگاہ برانگیزی و در چاہ نشانیش

عالم پیری، و غربتِ وطن

کہ پرسد زیں غریب و زار و محزوں
خراساں را کہ بے من حال تو چوں؟

ہمیدونی کہ من دیدہ بہ نوروز؟
خبر بفرست اگر ہستی ہمیدوں

درختانت ہمے پوشند بیرم؟
ہمے بستند دستار طبرخوں؟

نقاب رومی و چینی بہ نیاں
ہمے بندد صبا بر روے ہاموں

نثار آرد عروساں را بہ بستاں؟
ز گوہر ہاے الواں ماہ کانوں

ہمے سازند تاج فرق نرگس
بہ زرِّ غنچہ و لولوے مکنوں

مرا بارے دگر گونست احوال
اگر تو نیستی بے من دگرگوں

مرا بر سر عمامہ غزِّ او کن
بزد دست زماں خوش خوش بہ صابوں

مرا رنگِ طبرخوں دہر فانی
بشست از روے سپرم بآب زریوں

ز جور دہر الف چوں نوں شد ستم
ز جورِ دہر الف چوناں شودنوں

گزندہ مار را افسوں بدید ست
گزندہ دہر را کشناسد افسوں

اس طبقہ کے شعراہر نظم میں تخلص کا ظاہر کرنا واجب نہ سمجھتے تھے۔ شاہ مرحوم کہیں کہیں ناصر

نام ظاہر کرتے ہیں۔

عنصری عہدِ محمود میں ملک الشعرا، امیر الامرا اور مصاحبِ خاص تھا۔ کلام کے زور اور اقبال کے شور سے 400 شاعر استاد مانتے تھے۔ استاد منوچہری نے بھی اپنے قصائد میں اس کی شاگردی کا اقرار کیا ہے۔ تذکروں میں 30 ہزار بیت اس کے دیوان کے لکھے ہیں مگر اب جو دیوان ایران کے کتب خانوں میں ہیں، 3 ہزار بیت سے زیادہ نہیں۔ اس نے زبان میں ایسی اصلاح کی ہے کہ اپنی نظم کو دو سو برس آگے بڑھا کر طبقۂ دوم کے شاعروں سے ملا دیا ہے۔ تمام دیوان اُس کا معمولی قصیدے ہیں۔ ملک کی جغرافی حالت نے بہاریہ اور عاشقانہ تمہیدیں لکھی ہیں۔ اکثر 30 40 50 شعر کی تمہید۔ اخیر میں محمود کی مدح، یا مسعود کی تعریف۔ یا بعض فتوحات کی تہنیت۔ بلکہ اخیر میں ایک دو شعر ممدوح کے نام کے۔ عنصری 431ھ میں مر گیا:

سدہ جشنِ ملوکِ نامدار است — ز افریدون و از جم یادگار است
زمیں امشب تو گوئی کوہِ طور است — کزو نورِ تجلّی آشکار است
گر از فصل زمستانست بہمن — چرا امشب جہاں چوں لالہ زار است
ہمے مر موج دریا را بسوزد — بداں ماند کہ خشمِ شہریار است

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جشن سدہ کی رسم باقی تھی۔ پھر مذہب اور سلطنت قومی کے تغیر نے مٹا دیا۔

مدح محمود سبکتگیں میں کہتا ہے:

عنود استند ہر ماہِ منور — خط و زلفین اں بہ روے دلبر
یکے را سنبلِ نورستہ بالیں — یکے را لالہ خود روے بستر
بروے و موے او بنگر کہ بینی — بے آذر ہر دو آنرا فعل آذر
یکے بے دود سال و ماہ تیرہ — یکے بے نور روز و شب منوّر
مرا بہرہ دو چیز آمد ز گیتی — دلِ پاک و زبانِ مدح گستر
یکے بر مہر جاناں وقف کردم — یکے بر مدح شاہنشاہ کشور
مبارک دست او دو گونہ ابر ست — کشندِ دشمناں و دوست پرور
یکے باتیغ و بارانش ہمہ خوں — یکے بابذل و بارانش ہمہ زر

بروزِ رزم او بسیار بینی گو لشکر شکار و گرُوصف در
یکے را زخم تیرش کردہ بے جاں یکے را زخم تیغش کردہ بے سر
اگر مرجاہ وجودش را خداوند بدادے صورتے مخصوص منظر
یکے اندر فلک خورشید بودے یکے اندرزمیں دریاے اخضر
بہ ہیجا پیشہ آموزد ز دستش سنان نیزۂ خطی و خنجر
یکے دل دوز واندر درع وخفتاں یکے سر بُرّد اندر ترک و مغفر
بروزِ جنگ تیغ او و گرزش بزورِ بازوئے شاہِ دلاور
یکے جیحون خوں راند بہ صحرا یکے ہاموں کند سدِّ سکندر

ایک دفعہ محمود نے فصد کھلوائی، اس نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر سنایا:

آمد آں رگ زنِ مسیح پرست نیش الماس گوں گرفتہ بدست
طشت زرّین و آبدستاں خواست بازوےِ شہریار را بر بست
نیش بگرفت و گفت عزّ علیک اینچنیں دست راکہ یار وخست
سر فرد بردو بوسۂ برداد در سمن شاخ ارغواں برجست

اس کے اشعار کو دیکھو اور فردوسی کی نظم کو یاد کرو۔ حاضر باشیِ دربار نے اس کی زبان میں ملائمت اور نرمی پیدا کی ہے اور علما کی صحبت نے قومیت اور ملکیت کو مٹایا ہے۔

پہلے قطعہ میں باوجودیکہ جشن ُسدہ کی مبارکباد ہے مگر اس کے چراغان کو 'طور' کی تجلّی میں دکھایا ہے۔ دوسرے قطعہ کو دیکھو۔ 'ماہ' کی صفت 'منور'۔ 'بہادر' کی صفت 'صف در'۔ 'ترک' کی 'مغفر'۔ فردوسی نے شاید کہیں لکھا ہو۔ 60 ہزار شعر کی کتاب موجود ہے، دیکھ لو۔

تیسرے قطعہ میں جراح کو مسیح پرست، برکت شفا کے لیے کہا ہو۔ یا کوئی روم کا ڈاکٹر عرب کے رستے آکر ملازم دربار ہوا ہوگا۔ یہ آمیزش، دربار کی برکت سے ہوئی۔ فردوسی کی چاندی کھری ہے۔

منوچہری دامغانی۔ دربارِ محمود میں مصاحبت اور امارت کا رتبہ رکھتا تھا اور عنصری سے دوسرے مرتبے پر نشست پاتا تھا۔ اس نے بھی اُسی شان اور سامان کے قصیدے کہہ کر

زمانہ سے اپنی استادی کا اقرار لیا ہے۔ مگر بعض قصائد میں زبان قومی کے لحاظ سے پُرانے الفاظ اور محاورے خوب چھوڑ گیا۔ ترقیِ زبان کے عاشق عیب سمجھیں تو سمجھا کریں۔ 432ھ میں مر گیا۔ ابو سہل دبیر کی مدح میں یہ قطعہ کہا تھا۔ زبان کو دیکھو، طرز کلام کو دیکھو :

نوروز روزگارِ نشاط است و ایمنی پوشیدہ ابر دشت بہ دیبائے ارمنی
بریاسمن عصابۂ درِّ مرصّع است بر ارغواں طویلۂ یاقوتِ معدنی
خیل بہار خیمہ بہ صحرا بروں زدند واجب کند کہ خیمہ بہ صحرا بروں زنی
از بامداد تا بہ شبانگاہ مے خوری و ز شام گاہ تا بہ سحر گاہ گل کنی
بر ارغواں قلادۂ یاقوت بکسلی بر مشک بید نائرہ عود بشکنی
بر گل ہمے نشینی و بر گل ہمے خوری بر خم ہمے خرامی برُون ہمے دنی
درّ ست ناخریدہ و مشک است رائگاں ہر چند بر فشانی و ہر چند بر چنی
نرگس ہمے رکوع کند درمیانِ باغ زیراکہ کرد فاختہ بر سرو موزنی
دارد خجستہ غالیہ دانے ز سند روس چوں نیمۂ بر عنبر سارا بیاگنی
نرگس بسانِ کفۂ زرّیں ترازوئیست چوں زر جعفری بمیانش درافگنی
ماند بہ سینہ و دُمِ طاؤس شاخِ گل چوں مشک و درّد دانہ بدو بر پراگنی
دورویہ گل چو دائرہ بر سرخ دیبہ است چوں پشت او بہ رشتۂ زرّیں بیاژنی
باطنش ہست دیگر و ظاہرش دیگر است گوہر شد ست ایں گل دوروی باطنی
نرگس بسان چرخ یکے برّہ آسیاست آں چرخ آسیا کہ ستوں زمردیں کنی
چرخش ز زرِّ زرد کنی و نگیے درد دندانہ بلوریں گردش تو بر کنی
شاخِ بنفشہ بر سرِ زانو نہادہ سر مانندۂ مخالف بوسہل زوزنی
ہرگز منی نکرد و رعونت ز بہر آنک رسوا کند رعونت و رسوا کند منی
از ہمّتِ بلند بدیں مرتبت رسید ہرگز بمرتبت نرسد مردم دنی
او را ز ریمنی گہر پاک باز داشت ممکن نباشد از گہر پاک ریمنی
آمد بسوے او ز ہمہ خلق محمدت چوں باشیمن آید مرغ نشیمنی
از شان انگبیں نہ بزاید جز انگبیں از نفسِ او نیاید اِلاّ لطف کنی
راے موافق و نیت و اعتقادِ او از روزگار توسن برداشت توسنی

ہستند شاہ را خلفاے اگر جز او | لیکن بکامِ اوست دل شاہ مقتنی
احسان شہریار بہ تعلیم نیک اوست | چوں قوتِ بہار بہ بارانِ بہمنی
باعزّ مشک دیزہ و باقدر گوہری | باجاہ زرِّ سادی و بانفع آہنی
خرمن ز مرغ گرسنہ خالی کجا بود | ما مرغکان گرسنہ ما را تو خرمنی
تا حرف بانقط بود و حرف بے نقط | تا خطِّ مستوی بود و خط منحنی
عمر تن تو باد فزائندہ و دراز | عیش خوش تو باد گوارندہ دہنی

فی المضحکہ

مرا تو گوئی مے خوردنست اصل فساد | بجان تو کہ ہمے آیدم ز تو ضحکہ
اگر فساد کند ہر کہ او نبید خورد | بسا فساد کہ در یثرب است و در مکہ
چرا نبید حرام ست و ہست سرکہ حلال | نہ ہم نبید بود ابتدا ازاں سرکہ
نبید خام چہ انگوری و چہ مویزی | سفید سیم چہ بے سکہ و چہ باسکہ
کجا[1] نبید است آنجا بود جوانمردی | کجا نبید است آنجانکہ رود بزکہ

فرخی۔ اس نے اور اس کی شاعری نے سیستان کے جنگلوں میں پرورش پائی۔ طبیعت میں خدائی جوہر تھا، خود بخود چمکتا گیا، اور زبان سے بڑھ کر گلے پر اثر دکھایا۔ موسیقی پروں سے اڑنے لگا۔ سیستان کا علاقہ شہریت کے لوازمات سے ہمیشہ خالی رہا ہے۔ وہاں تنگ دستی تنگ رکھتی تھی۔ اس پر شادی کی اور شادی بھی اپنی پسند کی شادی۔ پہلے تنگ تھا، اب تنگ تر ہو کر گھر سے نکلا۔ امیر بلخ کو سنا کہ اہلِ کمال کا قدر دان ہے۔ وہاں پہنچا۔ وہ مرغزاروں میں اپنے گھوڑوں کے گلوں میں سے بچھیرے چن رہا تھا۔ اس نے وہیں جا کر سلام کیا۔ امیر نے ایک صحرائی آدمی کو جنگلی لباس میں ایسا فصیح اور روشن دماغ دیکھا۔ بہت خوش ہوا۔ خوش آوازی نے خوش کلامی کی سفارش میں زور لگائے۔ حاکم نے حکم دیا کہ ہزار بچھیرے ہم نے آج جمع کیے ہیں۔ جاؤ، ان میں سے جتنے بچھیرے گھیر سکو، گھیر لو۔ یہ ان کاموں کے مشاق تھے۔ کمر باندھ، پگڑو سنبھال کر

---

1. کجا نبید است۔ یعنی جائیکہ نبید است۔

دوڑے اور جنگلی حکمت عملی سے چند پھیرے گھیر لیے۔ مگر تھک گئے تھے، وہیں پڑ رہے۔ یہ حالت امیر کو اور بھی پسند آئی۔ آرام اور عزّت کے سامان میں ترقی دی۔ امیر دربارِ محمود میں گیا، انھیں بھی لے گیا۔ وہاں جاکر نصیبہ کھل گیا اور رفتہ رفتہ ایسے ہوگئے کہ عنصری کے برابر نام آنے لگا۔

نظم کا انداز شعرائے دربار کا انداز ہے۔ دیوانِ عنصری کے برابر دیوان ہے۔ اس میں عربی الفاظ اور عربیّت کے اشارے بھی ہیں۔ پھر بھی خاکِ خوراسان سے اٹھا اور صحرائے سیستان میں پرورش پائی تھی۔ جو اصالتِ زبان اور قدرتِ کلام کے انداز ہیں وہ نہیں گئے۔ بلکہ اور شعرائے دربار سے زیادہ ہیں۔ 429ھ میں مر گیا۔

محمود نے غزنی کے دامنِ کوہ میں ایک محل بنایا۔ سامنے باغ لگایا اور اونچے سر چشمہ سے کاٹ کر بیچ میں نہر لایا۔ اُس کی تعریف میں کہتا ہے۔ نظم کا نمونہ سنیے :

به فرخنده فال و به فرخنده اختر — بنو باغ میخواست شاهِ مظفّر
به باغے درختان او عود و صندل — بباغے ریاحین او بسدِ تر
به باغے چو پیوستن مهر خورم — بباغے چو رخسارهٔ دوست دلبر
به باغے درو سایهٔ شاخِ طوبےٰ — بباغے درو چشمهٔ آبِ کوثر
بہشت[1] اندر و بازیابی به نیساں — بهار اندر و بازیابی بآذر
ز سرو بریده چو زلفِ بریده — ز شکلِ مدوّر چو چرخِ مدوّر
درو مسکنِ ماه رویانِ مجلس — درو خانهٔ شیر گیرانِ لشکر
کجا[2] جائے بزم است گلہاے بیحد — کجا جاے صید است مرغانِ بے مر
رواں کرد بر گرد رعنا درختاں — تذروانِ آموخته ماده و نر
یکے کاخِ شاہانه اندر میانش — سرِ کنگره بر کنارِ دو پیکر
بکاخ اندروں صفّه ہاے مصفّےٰ — درِ صفّہا ساخته سوے منظر
یکے ہچو دیباے چینی منقّش — یکے ہچو ارژنگ مانی مصوّر

---

[1] فردوسی قومی اور ملکی اوصاف میں تعریف کرتا ہے، مذہب کی طرف کم آتا ہے۔ [2] جائیکه بزم است

نگاریدہ در چند جا مر مصوّر — شہِ شرق [1] را اندراں کاخ پیکر
بیک جاے در صید و در دست ژوپیں — بیک جاے در بزم و در دست ساغر
ازاں کاخ فرخ چو اندر گزشتی — یکے رود و آب اندر و ہمچو شکّر
برفتن ز تیزی چو فرمانِ سلطاں — بخوردن ز خوبی چو عیشِ توانگر
نہ چرخ ست و اجزاے او چوں ستارہ — نہ ابر است و آداے او ہمچو تندر
اگر بگورد بر سرش مرغ موجش — بیا لاید اندر ہوا مرغ را پر
بدینساں بباغ اندروں تند رووے — یکے ژرف دریا مر آنزا برابر
رواں اندر و کشتی و خیرہ ماندہ — ز پہناے او دیدۂ آشناور [2]
بدو اندروں ماہیاں چوں عروساں — بگوش اندروں پُر گہر حلقۂ زر
مکانے برآوردہ پہلوے دریا — بداں تا براں مَے خورد شاہ صفدر
یمینِ دَوَل شاہِ محمود غازی — امینِ مِلل خسروِ بندہ پرور
بمردی فزائندۂ عزِ مومن — بشمشیر کاہندۂ کفر کافر
زہے بزم را ابر دینار قطرہ — زہے رزم را خسروِ رزم گستر
بسا جنگ جویا کہ پیش تو آمد — سیہ کرد بر سوگِ او جامہ مادر
بسا بیشہائیکہ اندر گزشتن — تہی کردی از گرگ و ببر و غضنفر
بہندوستاں آنچہ نوپار کردی — بر اہلِ سلاسل نہ کرد است حیدر

عزیزانِ وطن! طبقۂ اوّل کے فصحا کا کلام آپ نے سُن لیا۔ اب مناسب ہے کہ اس کی خصوصیتوں کو کھولوں تاکہ ان میں اور طبقۂ آئندہ کے کلام میں امتیاز نظر آئے۔

(1) آپ دیکھیں گے کہ اس طبقہ کے فصحا کا اندازِ بیان اور ادائے مطلب کا طریقہ آنے والوں کے اندازِ بیان سے فرق رکھتا ہے۔ چنانچہ فردوسی کے کلام میں کہیں کہیں اشارہ کیا گیا۔ مگر حقیقت میں وہ نکتے حدِ بیان سے باہر ہیں۔ ذوقِ سلیم اس کا مزا لیتا ہے اور رہ جاتا ہے۔

(2) یہ زبان کے مالک جس طرح ضمیروں کو ترکیب دیتے تھے۔ طبقۂ دوم و سوم کے فصیح کچھ کچھ اس طرح بولتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ محاورہ بدل گیا۔ ایک جلسہ میں رستم کا حال کہتا ہے :

---

[1] بادشاہِ خوراسان یعنی محمود [2] شناور

یکایک سراں را نگہ کرد و دید — زشادی رخاں شاں چو گل بردمید

اسی طرح آریم شاں اور سپاریم شاں (یعنی شانرا)

ش۔ ضمیر غائب کو دیکھو اسدی طوسی کس طرح ترکیب دیتا ہے (حمدِ الٰہی میں)

یکے کِش[1] نہ یار و نہ انباز بود — نش[2] انجام باشد نہ آغاز بود

ضمیر کے پہلے حرف کو کہ متحرک ہوتا ہے، جہاں چاہتے بے تکلف ساکن کر دیتے تھے (سہراب اپنی ماں سے کہتا ہے) :

برستم دہم تخت و گنج و کلاہ — نشانمش بر جاے کاؤس شاہ

چو در دشت مر رخش را یافتند — سوے بند کردنش بشتافتند

چو رستم بدیدش کیانی کمند — بیفگند و سرش اندر آمد بہ بند

اسدی طوسی نے جان کے باب میں کہا ہے :

ببیندت و دیدن ورا روے نیست — کشد کوہ و ہمسنگ یک موے نیست

یعنی وہ تجھے دیکھتی ہے مگر اس کے دیکھنے کی کوئی صورت نہیں۔ پہاڑ کو کھینچ لیتی ہے اور بال کے برابر بھی نہیں۔ فردوسی کا عام محاورہ ہے :

بر آراستند رخش رستم تمام — بہ زرّیں رکیب و بہ سیمیں ستام

ساکن کو متحرک کر دیتے تھے :

بشادی ہمہ جاں بر افشاندَند — براں پہلواں آفریں خواندَند (دعا خواستند)

(3) الف زائد اسم اور فعل کے آخر میں لگاتے تھے (دیکھو فردوسی سیامک کو دیو سے لڑاتا ہے) :

سیامک برآمد برہنا تنا — بیاویخت باپور آہرمنا

چاند سے خطاب کر کے بہت سے شعر لکھے ہیں۔ ان میں کہتا ہے :

بہ سی روز گیتی بہ پیمایدا — دو روز و دو شب روے نمایدا

(4) جمع کا الف جہاں چاہتے تھے لگا دیتے تھے۔ فردوسی سہراب کے مرنے پر رستم کو تسلّی دیتا ہے :

---

1 کِش یعنی یکے کہ اورا 2 نش یعنی نہ اورا

کہ درمان ایں کار یزداں کند — مگر کیں غماں بر تو آساں کند

ایک اور جگہ کہتا ہے :

اگر عمر باشد مرا سالیاں — بہ خدمت بہ بندم کمر برمیاں

(5) 'الف' یا 'و' جو آخر لفظ میں واقع ہوں ان کے بعد 'ے' ظاہر کرتے تھے۔

کز او یستے[1] پیروزی و دستگاہ — ہم او آفرینندۂ مہر و ماہ

(حمد الٰہی میں)

(6) 'زر' اور 'پر' کی 'ر' کو اکثر مشدّد لاتے تھے اور اسی طرح بعض اور الفاظ میں بھی، چنانچہ اسدی طوسی نے حمد میں کہا ہے :

یکے زرّ بنقش دہد خسروی — یکے شارہا بانقش ہندوی

چو خورشید[2] آں چادر قیرگوں — بدرّید و از پردہ آمد بروں

ہوائے[3] ابر گشت از بخورِ عبیر — بخندید بمّ و بنالید زیر

'دُم اسپ' کو 'دُنب اسپ'۔ اور 'سُمِ اسپ' کو 'سُنب اسپ' باندھا ہے :

بسازم[4] یکے بوستاں چوں بہشت — کہ خندد ز خوشی براروی بہشت

(7) 'کج' کو 'کژ' اور 'ژ' پر تشدید اور اس طرح مژہ کو مژّہ باندھتے تھے۔ وغیرہ

کہ اے بر تر از کژّی و کاستی — بہی زاں فزاید کہ تو خواستی

(فردوسی)

(8) 'در' کی جگہ 'اندر'۔ 'اندرون' اور کہیں دونوں بولتے تھے۔ فردوسی رستم کے باب میں :

در آمد خروشاں دراں دشت جنگ — بہ چنگ اندروں گرزۂ گاو رنگ

یل نامور پور دستان سام — بہ بازی سر اندر نیارد بدام

---

1 دوسرے طبقہ کے لوگ ہست کہنے لگے   2 صبح کا عالم   3 بزم آرائی میں   4 سبب تالیف میں

فلک گر بزیرِ سحاب اندر است | وگر زیر پرِّ عقاب اندر است
مپندار کو از پئے کار تو | بہ بندِ خطا و ثواب اندر است
اگر بد کنی کیفر خود بری | نہ چشمِ زمانہ بخواب اندر است
در ایوان ہا نام بیژن ہنوز | بزندان افراسیاب اندر است

بہ رہ بر گوِ پیلتن را بدید | بزد دست و تیغ از میاں بر کشید
بہ شائستہ کاری بروں رفت رند | گوے دید برسان سروِ بلند

(9) 'با' اور 'بے' کے اوّل میں اکثر الف زائد لگادیتے تھے۔ جہاں رستم کو کاؤس نے خفا کردیا ہے اور وہ بگڑ کر سیستان کو چلا ہے۔ سپاہ کی زبانی فردوسی کہتا ہے :

ابے او نہ باشیم در جنگ شاد | ہمہ رزم ما گشت اکنوں چو باد
ابر بارۂ جنگ جوئےِ سوار | ہمے رفت و میگفت بادیو سار

(10) 'چناں' اور 'چنیں' کو 'چوناں' اور 'چونیں' باندھتے تھے اور 'چوں او' کو 'چنوے'۔ 'ہشیار' کو 'ہمشیوار' لکھتے تھے اور 'دانشمند' کو 'دانشومند' بھی کہہ جاتے تھے۔ سہراب دور سے لشکر کاؤس کو دیکھتا ہے اور ایک ایک سردار کا حال پوچھتا ہے کہ رستم کا نشان معلوم ہو :

نبردہ نژادے کہ چونیں بود | نہاں کردن از من چہ آئیں بود

رستم شکارگاہ میں ایک گور خر کو دیکھ کر کہتا ہے :

کہ گورے بخوبی ندیدم چنوے | بداں یال و آں گفت و آں رنگ و بوے

(11) بر بجائے نزد اور نزدیک لاتے تھے۔ رستم سہراب کے خیال میں کہتا ہے :

فرستادمش زرّ و گوہر بسے | برِ مادرِ او بدستِ کسے

بہت لفظ ہیں کہ اس طبقہ کی ہر بات میں زیرِ محاورہ تھے۔ طبقہ دوم میں بعض متروک ہوگئے بعض کبھی کبھی بولتے رہے۔ مثلاً :

'ویژہ'۔ 'مر'۔ اب 'ویزہ' کی جگہ 'خصوصاً' بولتے ہیں۔ 'مر' کہیں کہیں استعمال ہوتا ہے اور 'ویژہ' بمعنی مرد پاک طینت متروک ہوگیا ہے۔

'ہمے' شعرائے قدیم فعل کے اوّل میں لگاتے تھے اُس سے فعل مذکور کا جاری رہنا

سمجھا جاتا تھا۔

'ایدون'۔ 'ہم ایدون'۔ اب اس کی جگہ 'حالا' کہتے ہیں۔ رستم اپنے رخش کا سراغ لیتا شہر 'سمنگان' میں پہنچا۔ وہاں کے کارداروں سے کہتا ہے :

در ایدوں کہ رخشم نیامد پدید   سراں را بسے سر بخواہم برید

'ایدر'۔ 'اودر'۔ اب ان کی جگہ 'اینجا' اور 'آنجا' لکھتے ہیں۔

'کردن'۔ بمعنی 'ساختن' بہت لکھتے تھے۔ فردوسی ہوشنگ کے حال میں لکھتا ہے :

بہ فرّ کئی نرم کرد، آہنا   چو خود و زرہ کرد چوں جوشنا

جہاں را نہ برہیدہ کردہ اند   ترا نز پے بازی آوردہ اند

'بُدن' بجائے 'بودن'۔ 'بُد' بجائے 'بود'۔ 'بُدے' بجائے 'بودے'۔ نظم میں اور بعضے نثر میں بھی لکھتے تھے:

یک امروز با ما بباید بُدن   وزاں پس ہمیں راے[1] رفتن زدن

اگر مادرِ شاہ بانو بُدے   مرا سیم و زر تا بزانو بُدے

مرا بخت روشن بدیدار تست   بوی[2] خورم و جاوداں تندرست

ترکیب ہائے مذکورہ کے علاوہ صدہا لفظ ہیں کہ اس طبقہ کے عام محاورہ میں مستعمل تھے اور فصحاے وقت اپنے مطالب ان کے ذریعہ سے ادا کرتے تھے۔ پھر وقت بوقت معزول ہو کر مرتے گے۔

بوشاسپ۔ اس کی جگہ 'خواب' اور 'رویا' کہنے لگے۔ طبقہ دوم میں یہ لفظ مر گیا۔

آذرگشسپ۔ فردوسی اور اسدی کے کلام میں بہت آتا تھا۔ پھر 'صاعقہ' یا 'برق' کہنے لگے۔

ویژہ۔ ، ، پھر نیک، باصفا، پاک طینت کہنے لگے۔

ساو۔ ، ، پھر خراج کہنے لگے

نیو۔ ، ، پھر دلاور، دلیر، بہادر، شجاع وغیرہ کہنے لگے

ازیر۔ ، ، زیراکہ

ازور۔ ، ، شائستہ۔ سزاوار

---

1 ارادہ کردن   2 باشی

تراش۔ فردوسی اور اسدی کے کلام میں بہت آتا تھا۔ پھر طمع۔ توقع کہنے لگے۔

چرہ۔ 〃 〃 اسپ مطلقاً و اسپ سفید کو کہتے تھے

دژ آگاہ۔ 〃 〃 اب سہمگین و خشمناک کہتے ہیں

خیر خیر۔ 〃 〃 حالت خشمناک

زکان۔ 〃 〃 اب از خود رمیدہ کہتے ہیں

ستیخ۔ 〃 〃 چیز راست و بلند مثل ستون وغیرہ کو کہتے تھے

سُفت۔ 〃 〃 اب دوش کہتے ہیں

گاز۔ 〃 〃 اب گیاہ یا علف کہتے ہیں

نوان۔ 〃 〃 اب اس کی جگہ خمیدہ کہتے ہیں

ویر۔ 〃 〃 اب اس کی جگہ حفظ کردن۔ از برداشتن کہتے ہیں

توش۔ 〃 〃 اب اس کی جگہ توانائی۔ طاقت کہتے ہیں

رست۔ 〃 〃 اب اس کی جگہ خاک یا گرد کہتے ہیں

شیر اوژن 〃 〃 بجائے شیر افگن کہتے تھے

عناں گاشتن۔ 〃 〃 بجائے عنان اسپ گردانیدن کہتے ہیں

آفریں کرد۔ 〃 〃 دعا کرد اور ثنا و ستائش کرد۔ کی جگہ کہتے تھے

نماش برد۔ 〃 〃 مراتب عجز و نیاز بجا آورد۔ کی جگہ کہتے تھے

ان کے علاوہ شاہنامہ میں صدہا لفظ عموماً مستعمل ہیں مگر اب متروک ہیں۔ اگر ان کی فہرست اور توضیح بیان کروں تو سننے والوں کے شوق تنگ اور یہ لکچر ایک فرہنگ ہو جائے۔

ترکیبِ الفاظ میں بھی اکثر باتیں اُس وقت عام تھیں اب بعض ان میں سے متروک ہو گئیں اور بعض کم ہیں۔ چنانچہ

مضاف مضاف الیہ کی ترکیب مقلوبی سے اکثر اسم صفتہ بناتے تھے۔ خصوصاً فردوسی کا انداز ہے۔

'جہاں پہلواں'۔ 'ایراں سپاہ'

اور فک اضافت بھی :

یکایک سراں را تنگہ کرد و دید زشادی رُخاں شاں چو گل بشگفید

غور کر کے دیکھیے لفظ لفظ میں فرق ہے یعنی یک یک سر کردہ رانگہ کرد۔ از شادی روہاے شاں

ہمچو گل بشگفت۔

اسی طرح صفت موصوف سے مثلاً آزادہ سرد۔ نرہ شیر۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ کمند کیانی کی جگہ۔ کیانی کمند کہتے تھے۔

'است' کو فعل جمع کی علامت جمع سے پہلے داخل کر دیتے تھے۔ اسدی طوسی نے کہا ہے :

بزرگان و پیغمبرانِ خدائے   بزیرِ زمیں داشتستند جائے

اضافت ابنی سے بہت کام لیتے تھے مثلاً سام نریماں (سام ابن نریماں)۔ زال سام (زال پور نریماں) بو علی سینا (بو علی ابن سینا)۔

ناموں کی ترخیم کرتے تھے۔ اور۔ نیرم یعنی نریماں نظم کرتے تھے۔

حرفوں کو گرانے اور بڑھانے کے لیے کوئی قاعدہ نہ تھا۔ دیکھو۔ رستم، سہراب کو مار کر نالہ وزاری کرتا ہے :

کرا آمد ایں پیش کامد مرا   کہ فرزند کشتم بہ پیراں سرا

یعنی در پیرانہ سری فرزند را کشتم۔

دوسرے طبقے

نے 500ھ کے میدان میں ملک سخن کو آباد کیا۔ پہلے زبان کی قدرتی طبیعت زمین شعر میں گل پھول کھلاتی تھی۔ اب زبانوں نے قدرت۔ فکروں نے پرواز اور نگاہوں نے غور زیادہ پیدا کی۔ مشہور سخن آفرین خاقانی، انوری، نظامی ہوئے۔ کلام نے لباس بدلا۔ خیالات کا عالم بدلا۔ عرب کے علوم ملک میں عام ہو گئے تھے۔ بلاغت کی کتابیں فارسی میں لکھی گئی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اوّل عرب کے الفاظ کا قبضہ زیادہ ہوا۔ پھر الفاظ و معانی کو صنائع بدائع نے علمی رنگ دیا۔ پہلے طبقہ میں تقریر اور تحریر ایک تھی اور نظم کی خوبی یہ تھی کہ وزن کو توڑ دیں تو بے تکلف بامحاورہ نثر ہو جائے۔ اب ایجاد نے استعارہ کے گل کھلانے شروع کیے۔ نثر کی تاریخ میں اس کی توضیح کر چکا ہوں۔ پھر مکرر کہتا ہوں کہ پہلے 'رنگِ گل' اور 'نغمہ بلبل' کے بیان سے کلام میں بہار دکھاتے تھے۔ اب 'شاہدِ گل' کے رخسار اور 'رامشگر بلبل' کی آواز مضمون نکالنے لگے۔ اساتذۂ مذکور نے اس ایجاد کو خوب برتا۔ اَور ہم عصروں نے بقدر مراتب۔ باوجود اس کے اخلاقِ خوبی

ان باکمالوں کی ادائے مافی الضمیر کی قدرت اور بیان کی صفائی تھی۔ خاقانی ابتدائے روئداد اور خاتمۂ مطالب کو نہایت خوبی اور تاثیر کے ساتھ نظم کرتے تھے۔ خاقانی :

خاقانی آں کساں کہ براہِ تو میروند　　زاغند و زاغ را روشِ کبک آرزوست
طفلے کہ آرزوے ترازوے زر کند　　نارنج را برد کہ ترازو کند ز پوست
گیرم کہ مار چوبہ کند تن بشکل مار　　کو زہر بہر دشمن و کو مہرہ بہر دوست

تمہیدِ قصیدہ

نیست اقلیمِ سخن را بہتر از من بادشا　　در جہاں ملکِ سخن رانی مسلّم شد مرا
مریمِ بکرِ معانی را منم روح القدس　　نو عروسِ فضل را صاحب منم نعم الفتےٰ
درعِ حکمت پوشم و بے ترس گویم کالقتال　　خوانِ فکرت سازم و بے بخل گویم کالصلا
رشکِ نظمِ من خورد حسّان ثابت را جگر　　دست نثرِ من کشد سحبان وائل را قفا
ترش و شیریں است قدح و مدحِ من تا اہلِ عصر　　از عنب مَے پختہ سازند و ز حصرم توتیا

نظامی گنجوی نے پانچ لاجواب مثنویاں اور بہت سے قصیدے لکھ کر انشا پردازی میں نئے رنگ پیدا کیے اور تشبیہ و استعارہ کو رنگینی کے ساتھ برتا اور اس خوبصورتی کے ساتھ برتا کہ اُس کے پیچ بانکپن نظر آئے۔

اس باکمال مصنف کا کلام اقسامِ لطافت اور نزاکت سے لبریز ہے جو چند شعر لکھے ہیں فقط نمونہ ہیں کہ ایجاد نے کیونکر وقت کی زبان پر دستکاری کی۔ ایجاد مذکور بہت خوب اور نہایت خوب۔ مگر بعض جگہ خصوصاً جشنِ نوشابہ میں ایسے پیچ پر پیچ پڑے ہیں کہ کام مشکل در مشکل ہو گیا ہے۔

فردوسی کے اور ان کے کلام میں امتیاز کرنا نہیں ہو سکتا جب تک ایک مضمون کے اشعار دونوں بزرگوں کے تمھارے سامنے نہ ہوں۔ مثلاً فردوسی دنیا کے کون و فساد کو ایک جگہ سمجھاتے ہیں :

دو در دارد ایں کاخ نیلوفری　　کہ از ہر دو در بایدت برتری
یکے در بہ دُنیا کہ در آمدی　　دگر در کہ از وے بسر آمدی

نظامی :

دو رو دارد ایں باغِ آراستہ — در و بند از و ہر دو برخواستہ
بیا از درِ باغ و بنگر تمام — ز دیگر در باغ بیروں خرام

اسی مضمون کو فردوسی ایک اور جگہ کہتے ہیں :

دو در دارد ایں باغ پیراستہ — کہ دُنیا و دین است از و خاستہ
نہ دُنیا کہ ہر کس دروں آمدا — بہ دینِ الٰہی بروں آمدا
بہ دنیا نما تا کہ بر اوفتی — بہ دینت بماں تا بدر اوفتی

خیمہ کی صورتِ حال میں فردوسی فرماتے ہیں :

یکے خیمہ داشت افراسیاب — ز مشرق بمغرب کشیدہ طناب

ایک اور جگہ کہتے ہیں :

بسر بر یکے خیمہ زرّ بفت — ز گردوں کشیدہ برو پردہ ہفت

نظامی کہتے ہیں :

بسر خیمہ ہمچو مشکیں پرند — ستارہ فشاندہ بجاے سپند

فردوسی کہتے ہیں :

بسر خیمہ نور پرویں فشاں — کہ پرویں فشاندہ جہاں در جہاں

نظامی کہتے ہیں :

بسر خیمہ ہمچو زرّیں چمن — کہ باشد ز انجم گل و یاسمن

فردوسی نیزہ کی بلندی دکھاتے ہیں :

بدستش یکے نیزۂ ارجمند — چو روزِ قیامت بہ بالا بلند

بدستش یکے نیزیۂ سی ارش — ز خونِ جگر یافتہ پرورش

ہر داستان کی تمہید بہاریہ مضمون اور رنگین استعاروں سے کرتے ہیں، وہ بھی ہمیشہ گل و بلبل اور چمن سے اور ستاروں کی انجمن سے۔ اور خاتمہ پر ساقی کو ساغر و مینا کے ساتھ لا کر خمار شکنی کرتے ہیں کہ تھکن اتر جائے اور دماغ تازہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ باستانی ایرانیوں میں شراب کا استعمال اس طرح ہوتا تھا۔ اب جہاں ہے فقط شراب خواری ہے۔ تمہید اور استعاروں کی مثالیں دیکھو۔

آغاز داستان سکندر میں کہ انداز سخن نے جوش کا خروش دکھایا ہے :

علم برکش اے آفتابِ بلند　　خراماں شوا ے ابر مشکیں پرند
بنال اے دلِ رعد چوں کوسِ شاہ　　بخند اے لب برق چوں صبح گاہ

ایک اور مقام پر کہتے ہیں :

بیا باغباں خورّمی ساز کن　　گل آمد درِ باغ را باز کن
نظامی بہ باغ آمد از شہر بند　　بیار اے بستاں بہ چینی پرند
ز جعدِ بنفشہ برانگیز تاب　　سر نرگس مست برکش ز خواب
لب غنچہ را کایدش بوے شیر　　بہ کام گل سرخ در دم عبیر
یکے مردہ بر سوے بلبل بہ راز　　کہ مہدِ گل آمد بہ بستاں فراز

سکندر کے سامنے روشنک کو دُلھن بنا کر لاتے ہیں :

دگر بارہ بلبل بہ باغ آمد است　　پری پیش روشن چراغ آمد است

جہاں داستان خاتمہ پر ڈھالتے ہیں تو ساقی کی طرف دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں :

بہر جا کہ من مجلس آراستم　　ازاں مے ہمہ بیخودی خواستم
و گر نہ بایزد کہ نابودہ ام　　بہ مے دامنِ لب نیالودہ ام
مے کو چو آبِ زلال آمد است　　بہ ہر چار مذہب حلال آمد است

انوری بھی اسی طبقہ کا صاحبِ کمال سخن ایجاد تھا۔ استعارہ کو لیا اور خوش ادائی سے برتا۔ ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے :

اے کردہ خجل نسیم خلقت　　در ساحتِ بوستاں صبا را
گرد سپہت بحکم رو کرد　　از خانۂ دیدہ توتیا را
خاکِ در تو بہ قہر بنشاند　　در گوشۂ فقر کیمیا را
چوں نیک نگہ کنم نہ زیبد　　جز نام تو زیورے ثنا را

بے شک استعارہ سے لطفِ کلام اور اضافت سے کلام میں اختصار خوب ہوا۔ کیونکہ اضافت نے اپنی مروڑ میں کئی لفظوں کو لپیٹ لیا۔ مگر مطلب کی صفائی میں پیچ پڑ گیا اور ہر کہ آمد براں مزید کرد۔ بڑھتے بڑھتے پیچ در پیچ ہو گیا۔

'دوسرا ایجاد' اس طبقہ کا اندازِ غزل ہے۔ اس عہد کے شعرا نے مطلع، مقطع اور مقطع

میں تخلص لگا کر نیا سانچہ ڈھالا، جس کی پتلیاں آج تک کاغذوں پر دوڑتی پھرتی ہیں۔

پہلے اور دوسرے طبقہ کے کلام میں غور کرو۔ ایک ہلکا سا رنگ امتیاز کا اور بھی جھلکتا ہے۔ شعرائے طبقۂ اوّل کے کلام میں سادگی، سنگینی اور استواری تھی۔ طبقۂ دوم کے کلام میں رنگینی، لطافت اور ملائمت پیدا ہو گئی۔ اس کا سبب کیا؟ سبب ظاہر ہے۔ پہلے شاعر دشت کے رہنے والے تھے۔ ان کی سیدھی سادی طبیعت، بے تکلف زبان سے شاعری اُگتی تھی۔ اب شاعری دربار میں آئی۔ امرائے دربار اور اہل علم شاعر ہونے لگے۔ اُن کے لباس، نشست برخاست، کھانے پینے اور سب کاروبار میں نزاکت اور تراش کے تکلّم بھرے تھے۔ ویسی ہی ان کی گفتار تھی۔ وہی گفتار نظم میں آئی۔ رفتہ رفتہ پہلے اوصاف گم ہو گئے۔

میرے دوستو! پہلے کی سادگی اور بعد کی رنگینی کو یوں تصور کرو کہ انشاپردازی کا شہر آباد ہے، دُکانیں سجی ہیں، بازار جاری ہیں۔ ان میں شعرائے طبقۂ اوّل (خصوصاً فردوسی کا کلام) ایک پہلوان ہے کہ جنگل کے دامن اور پہاڑ کی گود میں پلا ہے۔ وہیں کی غذا نے بازوؤں میں بل دیا ہے اور قدرتی آب و ہوا نے چہرہ کو شاداب کیا ہے۔ وہیں کے سیدے سادھے، ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہے۔ کئی سبز پتّیاں ایک گلاب کا شگوفہ پگڑی میں ہے۔ اپنے بدن کے بل اور دل کی دھن میں جھومتا جھامتا چلا جاتا ہے۔

شعرائے مابعد کے کلاموں کو دیکھو! اہل شہر چلے جاتے ہیں۔ دھوئے دھائے چہروں کو خط نے تراش دی ہے۔ بالوں کو کنگھی نے، آنکھوں کو سرمہ نے، روکھے چہرہ کو تیل نے چمکایا ہے۔ سوکھے سوکھے بدن پر چست کپڑے چپکے ہوئے ہیں۔ ایک نازک چھڑی ہاتھ میں ہے۔ خراماں خراماں چلے جاتے ہیں۔

اس معاملہ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا آزاد کا کام نہیں۔ اپنا اپنا مذاق جدا ہے۔ کچھ لوگ ہیں کہ طبقۂ اوّل کے کلام کو پسند کرتے ہیں۔ کچھ ہیں کہ دوم کو اور جس قدر اس وصف میں ترقی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فصاحتِ کلام نے ترقی کی ہے۔

جو پُرانے الفاظ اور خاص خاص محاورے طبقۂ اول میں لکھے گئے۔ وہ اس طبقہ میں کم بلکہ بہت کم ہو گئے اور اکثر الفاظ بالکل گم ہو گئے۔ مثلاً 'کج' کی جگہ 'کژ' اور 'کژی' کی جگہ 'کرژی' نہیں کہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ جو الفاظ مردار یا متروک ہو گئے ان کی فہرست پڑھنی فضول ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل اظہار ہے کہ زبان میں ایک قسم کی نرمی اور سلاست پیدا ہوئی اور یہ

امتیاز بیان میں نہیں آسکتا، اسے مذاقِ سلیم پاسکتا ہے۔ شاہنامہ اور سکندرنامہ دونوں فارسی ہیں اور دونوں کے مصنف اعلیٰ درجہ کے صاحبِ کمال ہیں۔ پھر بھی دونوں کے الفاظ اور بندش میں ایسا فرق ہے کہ گویا دونوں کی زبان جدا جدا ہے۔

باوجودیکہ نظامی نے بلبل کے نغمہ اور گل کے رنگ و بو سے بہت کام لیا۔ پھر بھی اس کے الفاظ اور بندش میں غزلیت کا مزہ نہیں پیدا ہوا۔ جاننے والے جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں کہ غزل کے لیے الفاظ اَور ہیں، الفاظ کی ترکیب اَور ہے۔ اسی طرح مثنوی، قصیدہ وغیرہ ہر ایک کلام میں ایسا فرق ہے گویا ہر ایک کی زبان جدا جدا ہے۔

اسی عہد سے سلسلۂ نظم میں اوّل یا آخر، جہاں آجاتا کبھی کبھی تخلّص بھی لگادیتے تھے۔ خاقانی وانوری کے دیوان میں کہیں کہیں غزل کی آواز بھی آجاتی ہے۔

اس طبقہ میں الفاظ مذکورۂ ذیل طبقۂ اوّل کی یادگار باقی ہیں۔ پہلے خاص و عام کے محاورہ میں یہی ادائے مطلب کرتے تھے :

رامش۔ فردوسی وغیرہ۔ آرام و آسودگی۔ یا عیش و نشاط کی جگہ 'رامش' ہی کہتے تھے۔

رامشگر۔ خنیاگر۔ فردوسی نے غالباً مطرب کا لفظ کہیں نہیں کہا۔ طبقۂ دوم میں مطرب، نغمہ گر، نغمہ ساز وغیرہ بھی کہنے لگے۔

غریو۔ اس طبقہ میں 'غریو' کی جگہ غوغا، شور، فریاد، خروش وغیرہ بھی کہنے لگے۔

پیغارہ۔ ، طعنہ، ملامت، سرزنش بھی کہنے لگے۔

پیغولہ۔ ، گوشہ، کنج بھی کہنے لگے۔

آرزم۔ ، شرم، حیا، مروت، صلح وغیرہ بھی کہنے لگے۔

دژم۔ ، افسردہ، غمناک، اندوہگین، محزون، مغموم بھی کہنے لگے۔

دژخیم۔ ، زشت خو، زشت رو، بد، بدرو، بدخو کہنے لگے۔

نژند۔ ، غمگین، اندوہناک وغیرہ بھی کہنے لگے۔

اہرمن۔ ، فردوسی کی زبان پر شاید کہیں 'شیطان' آیا ہوگا۔ اس طبقہ میں 'شیطان' اور 'ابلیس' بھی آگئے۔

سوگند۔ فردوسی کی زبان پر شاید کہیں آیا ہوگا۔ پھر 'یمین' اور 'قسم' بھی کھانے لگے

پور۔ ۔ اب پسر اور فرزند اور جگر گوشہ، نور دیدہ وغیرہ پیدا ہو گئے

یل۔ دستان۔ کند آور۔ گرد۔ گو۔ فردوسی وغیرہ کا سکۂ کلام تھا۔ اب پہلوان، دلاور، شجاع وغیرہ وغیرہ کہنے لگے۔

ستام۔ ۔ اس طبقہ میں 'ساز' و 'یراق' بھی کہنے لگے۔

گیہان۔ گیتی۔ عام محاورہ تھا۔ اب جہان، عالم وغیرہ بھی بولنے لگے

راد۔ ۔ اب کریم، سخی، جوانمرد وغیرہ الفاظ کہنے لگے

کیفر۔ ۔ اس طبقہ میں پاداش، جزا، مکافات بھی کہنے لگے

کنش۔ طبقۂ اوّل کا عام محاورہ تھا۔ اب عمل، کار، کردار بھی بولنے لگے

منش۔ ۔ خو، طبیعت، طینت بھی کہنے لگے

مانا۔ گوئیا۔ ۔ گویا، مانند، مثل، مشابہ بھی کہنے لگے

مشکو۔ ۔ حرم سرا، حریم حرمت وغیرہ وغیرہ الفاظ تراشے گئے

نیا۔ ۔ 'جد' بھی کہنے لگے

بارہ۔ ہیون۔ تگاور۔ سمند۔ فردوسی وغیرہ اسپ کی جگہ یہی لکھتے تھے۔ اب اور اصطلاحی الفاظ عام ہو گئے۔

دژ۔ بارہ۔ اس طبقہ میں حصن، حصار، قلعہ وغیرہ بھی عام ہو گئے

سپہبد۔ اس طبقہ میں سر لشکر، سپہ سالار وغیرہ بھی کہنے لگے

ازیرا۔ ازیراک۔ زیراک۔ بہت کہتے تھے۔ اس طبقہ میں 'زیراکہ' بھی کہنے لگے

تخمہ۔ نژاد۔ گوہر۔ فردوسی کا تمغائے کلام تھا۔ اس طبقہ میں خانوادہ، خاندان، اصل وغیرہ بھی کہنے لگے۔

نژادہ۔ ۔ اس طبقہ میں صاحب نژاد، عالی نژاد، صاحب گوہر، والا گوہر، عالی حسب، والا نسب وغیرہ الفاظ تراشے گئے۔

نبردہ۔ ۔ متروک ہو گیا۔ ہم نبرد، ہم جنگ، مبارز وغیرہ الفاظ آ گئے

گزاردن اور برگزاردن۔ فردوسی وغیرہ کا سکہ تھا۔ اب 'گفتن' اور 'بیان کردن' اور 'پیام ادا کردن' بھی کہنے لگے۔

چوناں۔ چونیں۔ اودر۔ ایدر۔ ہمے۔ فردوسی کے ہر کلام میں کام دیتے تھے۔ اب کم ہو گئے۔

تیسرا طبقہ

اس طبقہ میں غزل خوانی کی ایسی دھوم ہوئی کہ اور مطالب ملتوی بلکہ معزول ہو گئے۔ مطلع اور مقطع سے غزل محدود ہوئی۔ سلاطین و امرا کی خوشامدوں سے قصیدے تاجدار ہوئے۔ مثنویاں رہیں، وہ بھی عاشقانہ۔ باقی مضمون بہانہ اور بیگانہ۔ عاشق و معشوق کے راز و نیا کو ہر دل جانتا ہے۔ اس کے خیال اَور، اُس کی زبان اَور۔ نرم نرم الفاظ، میٹھی میٹھی باتیں۔ مختصر یہ کہ صدہا لفظ متروک ہو گئے اور زبان ادائے مطالب میں کم مشق ہو کر اپاہج ہو گئی۔ پھر بھی اس میں بہت سے الفاظ طبقہ اوّل و دوم کی یادگار باقی ہیں۔ اُس کے اراکین میں سے چند بزرگوں کے نام اور کلام سناتا ہوں :

شیخ سعدی اس طبقہ کے شیریں کلام شاعر ہیں اور آج تک پھیکے نہیں ہوئے۔ نظم پڑھو، خواہ نثر دیکھو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باتیں ہیں اور لطف یہ ہے کہ وہی کتابی حکایتیں ہیں۔ جو نثر کی زبان ہے وہی نظم کی شان ہے۔ استعارے بھی ہیں، مگر مطلب میں پیچ نہیں ڈالتے، صفائی دکھاتے ہیں اور لطف بڑھاتے ہیں۔ دایۂ ابرِ بہاری، طفلانِ نبات، مہدِ زمین، کلاہِ شگوفہ، خلعتِ نوروزی وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی زیادہ نہیں۔ 8 صفحہ میں 8 10 آگئے بس۔ دیوان میں جو عاشقانہ غزلیں ہیں، اُن میں اکثر یاروں اور پیاروں کے حالیہ مطالب ہیں۔ دین و دنیا کی سود مند نصائح و پند ہیں اور قصائد میں بھی یک رنگ ہیں۔ جو کچھ ہیں بے تکلف اور میٹھی باتوں میں فصاحت شیراز کا شیرہ بہاتے ہیں اور ادے مطلب میں پورے قادر الکلام ہیں۔ 691ھ میں فوت ہوئے۔

غزل

گلبناں پیرایہ بر خود بستہ اند — بلبلاں را در سماع آوردہ اند
ساقیانِ لااُبالی در طواف — ہوشِ میخوارانِ مجلس بردہ اند

جرعۂ خوردیم و کار از دست رفت
تا چہ بیہوشانہ در مے کردہ اند

ما بہ یک جرعہ چنیں بے خود شدیم
دیگراں چندیں قدح چوں خوردہ اند

آتش اندر پختگاں افتاد و سوخت
خام طبعان ہمچناں افسردہ اند

خیمہ بیروں زن کہ فراشان باد
فرش دیبا در چمن گستردہ اند

زندگانی چیست مردن پیش دوست
کایں گروہِ زندگاں دل مردہ اند

تا جہاں بودہ است جماشانِ گل
از سلحداران خار آزردہ اند

عاشقاں را کشتہ مے بینند خلق
بشنو از سعدی کہ جاں پروردہ اند

معلمت ہمہ شوخی و دلبری آموخت
جفا و ناز و عتاب و ستمگری آموخت

مرا بشاعری آموخت روزگار آنگہ
کہ چشم مست تو دیدم کہ ساحری آموخت

ہمہ قبیلۂ من عالمانِ دیں بودند
مرا معلم عشق تو شاعری آموخت

بلاے عشق تو بنیاد زہد و بیخ ورع
چناں بکند کہ صوفی قلندری آموخت

دگر نہ عزم سیاحت کند نہ قصد وطن
ہر آنکہ بر سر کویت مجاوری آموخت

من آدمی بہ چنیں شکل و قد و خود روش
ندیدہ ام، مگر ایں شیوہ از پری آموخت

چنیں بگریم ازیں پس کہ مرد نتواند
بآب دیدۂ سعدی شناوری آموخت

خواجہ حافظ نے دیوانِ غزل کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ برائے نام 4 5 قصیدے بھی کہے مگر غزل ایسی لکھ گئے کہ آج تک سب آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی نہ صنعتوں کی بناوٹ ہے، نہ استعاروں کی رنگ آرائی ہے۔ دل کی صفائی ہے۔ زبان سے نکل آئی ہے۔ ایک غزل ان کی بھی سنیے اور وقت کی زبان کو قیاس فرمایئے۔ 791ھ میں انتقال فرمایا۔

غزل

بیا کہ قصر عمل سخت سست بنیاد است
بیار بادہ کہ بنیاد عمر برباد است

غلام ہمتِ آنم کہ زیر چرخ کبود
ز ہر چہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است

نصیحتے کنمت یاد گیر و در عمل آر
کہ ایں حدیث ز پیر طریقتم یاد است

مجو درستیِ عہد از جہانِ سست نہاد — کہ ایں عجوزہ عروسِ ہزار داماد است
چو گویمت کہ بمیخانہ دوش مست و خراب — سروشِ عالمِ غیبم چہ مژدہ ہا داد است
کہ اے بلند نظر شاہ باز سدرہ نشیں — نشیمنِ تو نہ ایں کنجِ محنت آباد است
ترا ز کنگرۂ عرش میزنند صفیر — ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد است
غمِ جہاں مخور و پندِ من مبر از یاد — کہ ایں لطیفۂ لغزم ز ہر درے یاد است
رضا بہ دادہ بدہ و ز جبیں گرہ بکشا — کہ بر من و تو درِ اختیار نکشاد است
نشانِ مہر و وفا نیست در تبسّمِ گل — بنال بلبلِ مسکیں کہ جائے فریاد است
حسد چہ مے بری اے سست نظم بر حافظ — قبولِ خاطر و لطفِ سخن خدا داد است

مزرعِ سبزِ فلک دیدم و داسِ مہِ نو — یادم از کشتۂ خویش آمد و ہنگامِ درو
گفتم اے بخت بخوابی تو و خورشید دمید — گفت باایں ہمہ از سابقہ نومید مشو
تکیہ بر اخترِ شب گرد مکن کیں عیّار — تاجِ کاؤس ربود و کمرِ کیخسرو
گر روی پاک و مجرّد چو مسیحا بہ فلک — از فروغِ تو بخورشید رسد صد پرتو
آسماں گو مفروش ایں عظمت کاندر عشق — خرمنِ دید جوے خوشۂ پرویں بہ دو جو
گوشوارِ دُرِ لعل ارچہ گراں دارد گوش — دورِ خوبی گذرانست نصیحت بشنو
چشمِ بد دور ز خالِ تو کہ در عرصۂ حسن — بیذقے راند کہ برد از مہ و خورشید گرو
ہر کہ در مزرعِ دل تخمِ وفا سبز نہ کرد — زرد روئی کشد از حاصلِ خود گاہِ درو
اندریں دائرہ میباش چو دف حلقہ بگوش — در قفائے خوری از دائرۂ خویش مرو

آتشِ زرق و ریا خرمنِ دیں خواہد سوخت
حافظ ایں خرقۂ پشمینہ بیند از و برو

عزیزانِ وطن! اس طبقہ کے باکمالوں کے کلام آپ نے سن لیے۔ دیکھیے! ترکیبیں بدل گئی ہیں۔ نرمی اور صفائی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ تصنیفات کو پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ کتنے الفاظ متروک ہوگئے۔ پھر بھی بعض بعض باقی ہیں، خصوصاً شیخ سعدی کے کلام میں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ بزرگانِ قدیم کی طرح روئداد احوال اور حالیہ خیالات بہت نظم کرتے تھے۔ اُن میں اُن کے الفاظ بھی آجاتے تھے۔ یا یہ کہ ایک صدی کے میدان پر پانی پھیر کر، دوسری صدی میں

جھاڑ و دے رہے تھے۔ بہ نسبت نوجوانوں اور تازہ خیالوں کے 80 90 برس پہلے کے الفاظ زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ مثلاً مر۔ ہمانا۔ خویشتن وغیرہ وغیرہ :

بدرگاہ لطف و بزرگیش بر[1] — بزرگاں نہادہ بزرگی ز سر
بدریا در[2] منافع بے شمار است — اگر خواہی سلامت بر کنار است
ز عہدِ پدر یاد دارم ہمے[3] — کہ بارانِ رحمت برو ہر دمے
تنم مے[4] بلرزد چو یاد آورم — مناجات شوریدۂ در حرم
بہ بانگِ دہل خواجہ[5] بیدار گشت — چہ داند شبِ پاسباں چوں گزشت
کہ ناگہ دہل زن فرد[6] کوفت کوس — بخواند از قضائے برہمن خروس
فرو شو چو بینی درِ صلح باز — کہ ناگہ درِ توبہ گردد فراز
کہ چندیں ز تیمار و در دم مپیچ — کہ روز دو پیش از تو کردم بسیچ[7]
دی شب آمد بر[8] سعدی بہ تکلف بنشست — فتنہ بنشست جو برخاست قیامت برخاست
اے بے[9] حکم شرع آب خوردن خطاست — و گر خوں بہ فتویٰ بریزی رواست
بکردار بد شاں مقید نہ کرد — بضاعاتِ[10] مزجاتِ شاں رو نکرد
الا[11] تا بہ غفلت نہ خسپی کہ نوم — حرام است بر چشم سالار قوم
مرا ہچو تو خوابِ خوش در سر است — و لیکن بیاباں بہ پیش اندر[12] است
نیاوردہ عاقل غش اندر[13] میاں — نیندیشد از رفع دیوانیاں
منم آں ز پائے اندر افتادہ پیر — خدایا بفضلِ خودت دست گیر
برو شکر کن گر بہ[14] خر بر نۂ — کہ آخر بزیرِ کساں خر نۂ
بہ[15] صنعا درم طفلے اندر گزشت — چگویم کزانم چہ بر سر گزشت
دو خواہند بودن[16] بہ محشر فریق — ندانم کدامی دہندم طریق

---

1 بر زائد 2 در زائد 3 ہمے 4 مے اور فعل میں فاصلہ 5 خواجہ 6 فرد 7 بسیچ 8 بر بمعنی نزد 9 اَ زائد 10 فک اضافت 11 الا 12 بہ + اندر 13 اندر + میاں 14 بہ + بر 15 بہ + در 16 بودن بجائے بود

طبقۂ چہارم

900ھ کے بعد کشورِ نظم میں عجیب انقلاب پیدا ہوا۔ قاعدہ ہے کہ جب تک شاعری عالمِ طفولیت میں رہتی ہے اُس سے عام و خاص ہر شخص مزا اٹھاتا ہے۔ سبب بھی بیان کر چکا ہوں کہ مطالب اُن تشبیہوں اور استعاروں میں ادا ہوتے ہیں جو ہر جگہ اور ہر وقت پیشِ نظر ہیں۔ ایک عرصہ کے بعد جب وہ اہلِ سخن کے خرچ میں آجاتے ہیں تو نئے شاعر اپنے کلام میں نئی بات پیدا کرنی چاہتے ہیں۔ ناچار وہ باریک، یا عمیق۔ یا بلند یا دور کے مجاز اور استعاروں میں ادا کرتے ہیں۔ اس لیے کلام باریکی سے تاریکی میں گر کر کبھی غور طلب اور کبھی بے لطف ہو جاتا ہے۔

زبانِ فارسی میں عہدِ سعدی و حافظ تک کے شاعر جب بہت سے عمدہ اور دلکش انداز اور استعارے اور مجاز خرچ کر گئے تو بعد میں آنے والوں کو اس کے سوا چارہ نہ ہوا کہ استعارہ کو استعارہ در استعارہ اور مجاز کو مجاز در مجاز کر کے معنوں میں نزاکت اور باریکی پیدا کریں اور سننے والوں سے کہلوائیں کہ سبحان اللہ، نیا مضمون ہے۔ اس طرز کے بانی جلال اسیر، قاسم مشہدی، ملا ظہوری وغیرہ تھے۔ انھوں نے تعریفوں کے شوق میں اصلیت کو چھوڑا اور مجاز کو حقیقت سے بڑھا دیا۔ یعنی بے اصل کو اصلیت قرار دے کر اس کے لوازمات پر خیال پھیلانے شروع کر دیے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اصلیت بالکل نہ رہی، خیال ہی خیال رہ گئے۔ جن کا وجود یا وقوع ناممکن اور محال ہے۔

جب دولت اور بے فکری عام ہوتی ہے تو خیالی چمن بہت پھولتے ہیں۔ بزرگانِ مذکور نے قدردانی کے دربار سے بجائے اخراج کے عزّت کے خلعت اور 'خیال بند' اور 'معنی آفرین' خطاب حاصل کیے اور جو فصیح شاعر ایسے خیالات نہ باندھتا اور کلام اس کا دلپذیر اور پُر تاثیر ہوتا تو اُسے تذکروں میں درج کرتے، اور لکھتے۔ سادہ گوست اما خوشگوست۔ کبھی لکھتے بر فتار قدما راہ سخن مے پیماید۔ مجھے یہی افسوس ہے کہ اصلیت کلام سے جاتی رہی اور قوتِ بیان میں ضعف آگیا۔ یہی دیکھ کر دانایانِ فرنگ نے حکم لگا دیا کہ ایشیائی شاعری (ان نیچرل) بے بنیاد ہے اور بے اصل مضمون باندھتی ہے اور ان کی زبان میں اصلیت کے ادا کرنے لی طاقت و لیاقت ہی نہیں۔

مثال میں ایک مطلع جلال اسیر کا پڑھتا ہوں۔ تمام غزل بلکہ دیوان کو اسی پر قیاس کر لو :

تا کے از عکس تو آئینہ گلستاں گردد سوے عاشق نگہے تا ہمہ تن جاں گردد

غیر زبان کے لوگوں کو اگر اس کا ترجمہ سناؤ تو اصلاً لطف نہیں اٹھا سکتے کیونکہ ہر لفظ کے آگے سے کئی کئی سیڑھیاں اٹھ گئی ہیں کہ ہمیں تمھیں کثرتِ مزاولت کے سبب سے نہیں معلوم ہوتیں۔ غیر شخص بے خبر ہیں اس لیے رہ جاتے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے :

اے معشوق! تو اپنے سرو قد، نرگسِ چشم، گُل رخسار، سنبل زلف وغیرہ کے لطف سے بہار گلشن ہے اور ہر وقتِ شوق خود آرائی میں آئینہ دیکھتا ہے۔ کب تک اس لطافت سے آئینہ کو باغ بناتا رہے گا۔

عاشق کی طرف بھی ایک نگاہ کر کہ اس کا جوہر بہت قابل ہے۔ ایک نگاہ کے اثر سے اس کا تن بھی جان کی طرح لطیف ہو جائے گا۔

پہلے مصرع کا مطلب دیکھیے۔ ایک رخ کے کہنے سے یہ باغ کا سامان ناواقف آدمی کب سمجھ سکتا ہے اور باعتبار اصلیت کے سوچیے تو ناممکن ہے۔ بھلا ایک عکس پڑنے سے آئینہ باغ کب ہو سکتا ہے۔

دوسرے مصرع کا معاملہ اُس سے زیادہ مشکل ہے۔ بھلا 'جسم'۔ 'جان' کیونکر ہو سکتا ہے اور وہ بھی ایک نگاہ کے اثر سے؟

ان شعروں کی خوبیوں پر ہزار جانیں قربان۔ لیکن کلام اصلیت اور غیر اصلیت میں ہے۔ وہ نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ شاعر اصلیتِ خالص اور واقعہ واقعی کبھی کبھی اتفاقاً باندھتا ہے۔ اکثر خیالی مضامین نظم کیا کرتا ہے۔ لیکن خیال بھی ایک قریب الوقوع یا ممکن الوقوع ہوتا ہے۔ ایک ناممکن محض نہیں۔ ان صاحب کمالوں نے ناممکن کو ممکن کہنا کمال سمجھا اور جتنا زیادہ ناممکن اتنی ہی زیادہ تعریف۔ اسی کمال نے انھیں گھر میں خطاب مذکور دلوائے اور باہر بدنام کر دیا۔

ایران میں بعض شاعر اسی انداز میں ساری طبع کی موزونیت خرچ کر دیتے تھے اور بعض شاعر دونوں طرزوں کو ملا کر پانی سمو دیتے تھے۔ یہ رنگین کلام کہلاتے تھے۔ ان میں صائبؔ وغیرہ شامل ہیں۔ پھر بھی استعارہ اور اقسام، مجاز اور مناسبت الفاظ سے باہر ہونا، مذہب سے باہر ہونا تھا۔ صائبؔ کے چند شعروں سے میں بھی جلسہ کو رنگین کرتا ہوں :

اگر اِمبار مے افتد بدستم گردنِ مینا	چو دردِ مے نخواہم داشت دست از دامنِ مینا
دو صبحِ صادق اند، از یک گریباں سر بر آوردہ	یدِ بیضاے ساقی و بیاضِ گردنِ مینا

دو چیز از بزمِ میخوار اں پسند آمد مرا صائبؔ   ز پا افتادنِ ساقی، بسر غلطیدنِ مینا

ہندوستان میں خیال بندوں کی اُمت غنیؔ کشمیری، مرزا بیدلؔ اور ناصر علی وغیرہ نامور ہوئے اور پَے رَواُن کے آج تک بے شار چلے آتے ہیں۔

خاقانیؔ و انوریؔ قصیدہ گوئی کا خاتمہ کر گئے۔ چوتھے طبقہ میں ظہوریؔ، عرفیؔ، نظیریؔ نے بڑے بڑے پُر جوش قصیدے لکھے۔ مگر اکثر کی روش غزل سرائی۔ اب ایران میں اہل تحقیق سے گفتگوئیں ہوئیں۔ انھوں نے کہا کہ سخن آفرین طبیعتیں تھیں۔ ہند میں گئے۔ بے محل قدر دانیوں نے رستہ بھلا دیا۔ لیکن اسے کیا کہوں کہ صائبؔ جیسے کثیر الکلام شاعر کے اتنے بڑے کلیات میں دیکھیے 4 5 قصیدے۔ وہ بھی صاف صاف۔ مقرری باتیں اور معمولی اوصاف۔ مثنویاں بہت ہوئیں۔ سب کا ایک معمولی افسانہ۔ یعنی عاشقانہ طرز بیان۔ غزل کا انداز اور رنگ رنگ کے مجاز۔

1200ھ کے بعد جدھر سے بادل اٹھا اور ہوا بگڑی تھی۔ خود بخود وہیں سے اصلاح شروع ہوئی۔ یعنی اہل ایران سعدی اور حافظ کے انداز میں غزل اور خاقانی و انوری کے انداز میں قصیدے کہنے لگے۔ بیان تفصیل طلب ہے۔ انشاء اللہ یار باقی و صحبت باقی۔

مل رہیں گے ترے کوچہ میں کبھی دل اور ہم
یار باقی ہے تو صحبت ہے دل آرا باقی

المرقوم یکم اکتوبر 1872ء

OO

خاتمہ

عزیزانِ وطن! دل شکستہ آزاد نظم فارسی کی ناتمامی پر کتاب کو تمام کرتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ بارھویں صدی کے انقلاب اور حال کی کیفیت نہ دکھا سکا۔ یہ ہو جاتا تو دل کا ارمان پورا ہو جاتا۔ مگر مئیں ناتمام، میرا ہر کام ناتمام۔ اہلِ طلب کے تقاضے حد سے گزر گئے ہیں۔ اب تھوڑی سی بات کے لیے وقتِ فرصت پر ملتوی کرنا مصلحت سے بعید ہے۔ امیدِ فرصت میں 14 برس گزر گئے۔ اب ہو گا تو کیا ہو گا۔ عمر نے وفا کی تو طبعِ ثانی میں وعدہ پورا ہو گا انشاء اللہ اور آزاد پورا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ لکھنے والے بہت ہیں وہ لکھ دیں گے۔ ہم دیکھ لیں گے۔ عادتِ الٰہی اسی راہ جاری ہے۔ خاتمۂ کلام دعا پر ہے کہ خدا حسن قبول روزی کرے اور فوائد سے سب کو کامیاب کرے۔ آمین۔ آمین۔ ثم آمین۔

قطعہ تاریخ انطباعِ کتابِ لاجواب سخن دانِ فارس

ز نتائجِ طبع جناب خلیفہ سیّد محمد محسن صاحب متخلّص بہ متیؔن، برادر والا جناب معلّی القاب مشیر الدّولہ ممتاز الملک آنریبل خلیفہ سیّد محمد حسین خاں بہادر ممبر کونسل اوف ریجنسی ریاست پٹیالہ

بلند نام محمد حسین آنکہ بود — خطاب، شمس العلما، تخلّصش آزاد
کہ اُلحق است بہر علم، افضل و اعلیٰ — بہ نظم و نثر، بہر طرز، اکمل و استاد
ہمش محمد باقر پدر، بجملہ عُلوم — نداشت پایہ، کمُ از میر باقر داماد
چو فخر آں اب وایں جد محمد ابراہیم — کتابِ نغز، عجم زندہ سازِ والدِ راد[1]
کہ از برائے چنیں نامہ[2] اش بنامِ خُدا — چہا شگرف[3]، سخندانِ فارس نام نہاد
ازینکہ ہست، عجیب و غریب تاریخے — زبانِ ایراں را بہر ہند حسب مراد
بانطباع رسانید ازیں خیالِ نکو — کہ بے شمار فوائد بخَلق خواہد داد
بہ بندہ ہم پے تاریخ گفتنش بنوشت — سروش کرد ہمیں ہمدراں دَمَم ارشاد

کہ ہیں شتاب، بگُوائے متیں بلاکم و کاست
بَسا مفید سخندانِ فارس از آزاد

13 ھ 24

---

[1] بہ رائے مہملہ لفظ فارسی ست بمعنی فیض رسان وشجاع وعالم علوم [2] بمعنی کتاب [3] بمعنی نادر ونایاب